حسینؑ ابنِ علیؑ

آپ پر درود — اور

آپ کے رفیقانِ شہادت کو ہمارا سلام

میراثِ انبیاء علیہم السلام

سید مجتبیٰ حسین

دانشگاہِ اسلامی

اللّٰھم صلّ علیٰ محمّدٍ وّاٰلِ محمّد

حسینؑ ابنِ علیؑ!
آپ پر درود ـــــ اور
آپ کے رفیقانِ شہادت کو ہمارا اسلام

میراثِ انبیاء علیہم السلام

تالیف:
سیّد مجتبیٰ حسین

اہتمام:۔ انصار حسین واسطی

ناشر
دانشگاہِ اسلامی
۱۱۲۔ حسن لاج ۔ مقبول آباد ۔ کراچی نمبر ۵

نام کتاب: میراثِ انبیاء علیہم السلام
مولف: سید مجتبیٰ حسین شمس آبادی،
نظر ثانی: سید حسین مرتضےٰ
بار: اوّل ۱۱ ذوالقعدہ ۱۳۹۷ھ مطابق ۲۵ اکتوبر ۱۹۷۷ء
پیشکش: ڈائریکٹر ریسرچ سیل دانشگاہ اسلامی
اہتمام: انصار حسین واسطی
مطبع: المشہد پرنٹنگ ایجنسی
بتعاون: سندھ آفسٹ پرنٹرز
ڈیجیٹل اشاعت: ۲۸ اگست ۲۰۱۳ء
کتابخانہ مرتضوی، کراچی، پاکستان
http://ml.com.pk
قیمت: -/۲۰ روپئے

ناشر

۱۱۲۔ حسن لاج۔ مقبول آباد۔ کراچی

ملنے کا پتہ
المشہد
پرنٹنگ ایجنسی
تنویر منزل ۳/۴۸۱۔ لیاقت آباد کراچی

السلام عليك يا وارث آدم صفوة الله السلام عليك
يا وارث نوح نبي الله السلام عليك يا وارث
واطعت الله ورسوله
حتى اتيك اليقين

روضۂ اقدس حضرت امام حسین علیہ السّلام

ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابتدائیہ

عرض ناشر

اللہ کی حمد و ثنا اور رسول و اہلبیت
رسول علیہم الصلوٰۃ والسلام پر درود و سلام کیساتھ "میراثِ
انبیاء علیہم السّلام" کے نام سے "واقعۂ کربلا"
جیسے ناقابل فراموش تاریخی باب پر یہ کتاب
"دانش گاہ اسلامی" کے سلسلۂ اشاعت کی پہلی کڑی

کے طور پر آپ حضرات کی خدمت میں حاضر ہے، اس سے پہلے ہم مختلف اوقات میں مختصر مقالات شائع کرتے اور مختلف عنوانات پر چھوٹے بڑے سیمینار کرواتے رہے
اب الحمد للہ ہماری اشاعتوں کا یہ سلسلہ اس کتاب کے ساتھ زیادہ منظم طور پر آگے بڑھ رہا ہے اور اسی طرح خداوند عالم کے فضل و کرم سے سیمینارز کا سلسلہ بھی "شامِ دانش" کے عنوان سے زیادہ باقاعدگی اختیار کر رہا ہے۔

آپ حضرات کی خدمت میں یہ کتاب پیش کرتے ہوئے ہم خداوند عالم کے حضور اس لیے اور بھی عاجزانہ طور پر شکر گزار ہیں کہ یہ کتاب الحمد للہ کئی لحاظ سے ہماری منزل کی جانب ہماری تیز رفتار پیش قدمی کی نشانی ہے، جن میں سب سے اہم یہ ہے کہ اس طرح ہم اپنے اس مقصد کی جانب آگے بڑھے ہیں کہ معاشرہ کے مختلف طبقات کے افراد میں دین اور علوم دین کی طرف رغبت اور ان میں علم دین کے حصول اور دینی موضوعات پر تصنیف و تالیف کا ذوق و شوق پیدا ہو۔

چنانچہ، یہ کتاب **دانشمند محترم جناب سید مجتبیٰ حسین صاحب نقوی شمس آبادی** بی۔اے (علیگ) کی کوششوں کا ثمرہ ہے، جو ایک مصروف شخص ہیں اپنے گوناگوں کاروباری مشاغل کے ساتھ ان کے شوقِ مطالعہ اور ذوقِ تالیف کا عالم یہ ہے کہ ان کے پاس ایک گراں قدر ذاتی کتابخانہ موجود ہے اور مختلف اوقات میں ان کے مضامین پاکستان کے مشہور روزناموں اور رسالوں میں چھپتے رہتے ہیں، موصوف معززین شمس آباد کے ایک علم دوست گھرانے کے ایک ذی علم اور علم دوست بزرگ جناب سید فیاض حسین صاحب مرحوم کے فرزند ہیں، جناب فیاض حسین مرحوم بھی شوق مطالعہ رکھتے تھے، انہوں نے اپنے زمانہ حیات میں چند مسودے بھی تحریر فرمائے تھے جن میں سے کچھ ضائع ہو چکے ہیں اور باقی قلمی صورت میں موجود ہیں۔ شمس آباد برصغیر کا ایک سات سو سال پرانا قصبہ ہے جسے ساداتِ کرام

نے راجپوتوں سے فتح کیا تھا اور جہاں سادات نے دین اور علوم دین کی نشر و اشاعت میں بھرپور حصہ لینے کے ساتھ ساتھ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں پر شدید وار کرکے سخت مصائب و مشکلات کا سامنا کیا۔

یہ کتاب دانش گاہ اسلامی کے ریسرچ سیل کے زیر اہتمام تیار کی گئی ہے جس کی تنظیم اور کارکردگی کے سلسلہ میں ادارہ رئیس دانش گاہ اسلامی سرکار علامہ سید ابن حسن صاحب نجفی مدظلہ العالی کی خصوصی نگرانی کے لیے ان کا ممنون اور سیل کے ڈائریکٹر سید حسین مرتضیٰ اور ڈپٹی ڈائریکٹر جناب مولانا سید علی حسنین صاحب جعفری کی کاوشوں کو بنظر استحسان دیکھتا ہے، اس کتاب پر نظر ثانی کا کام سید حسین مرتضیٰ صاحب نے انجام دیا ہے اور اس کام میں علامہ محقق جناب سید مرتضیٰ حسین صاحب صدر الافاضل مدظلہ العالی اور سرکار علامہ سید ابن حسن صاحب نجفی مدظلہ العالی کی نگرانی اور مشورے شامل حال رہے ہیں اور آپ حضرات جانتے ہیں کہ یہ دونوں شخصیتیں بین الاقوامی شہرت کی حامل ہیں۔

یہ کتاب تزئین و طباعت کے لحاظ سے جس حسن و خوبی کے ساتھ آپ کی خدمت میں پیش کیجارہی ہے، اس کا سہرا دانش گاہ اسلامی کے ایک رکن جناب انصار حسین صاحب واسطی کے سر ہے، جو ایک فعال قومی کارکن ہیں اور جنہوں نے خصوصیت سے اس کتاب کی تزئین و طباعت کے سلسلہ میں کافی محنت اور دقت نظر سے کام لیا ہے۔

آخر میں دانش گاہ اسلامی اپنے تمام ارکان اور ان تمام حضرات کے لئے دعائے خیر کو اپنا فریضہ سمجھتی ہے جنہوں نے دانش گاہ اسلامی کی ترقی اور اس کتاب کی اشاعت کے سلسلہ میں کسی بھی نوعیت کا تعاون فرمایا ہے۔

ہماری دعا ہے کہ خداوند عالم دانش گاہ اسلامی کے ہمدردوں، ارکان اور تمام مومنین و مومنات کے توفیقات میں اضافہ فرمائے اور ہم سب کو اپنے اوامر

پر عمل اور نواہی سے رکنے کی توفیق عطا فرما کر زیور علم و عمل اور عرفانِ آگہی سے آراستہ کرے اور امام زمانہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ظہور میں تعجیل فرمائے

آمین بحق محمد و آلہ الطاہرین۔

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مطالعہ کتاب کی دعوت دینے سے پہلے ہم آپ کو دانش گاہ اسلامی اور اس کی اغراض و مقاصد سے بھی متعارف کراتے چلیں،

چنانچہ: اس وقت ہمارے سامنے جو گوناگوں مسائل موجود ہیں، ان میں اہم ترین مسئلہ "خیر دنیا و خیر آخرت" ہے اور اس مسئلہ کا حل یہی ہے کہ ہم اپنے ان تمام تر وسائل کو مجتمع کر کے ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے تعلیمات کی روشنی میں منظم اور منضبط طور پر درست طریقے سے استعمال میں لائیں، جو مختلف وجوہات کی بناء پر اس طرح منتشر ہیں کہ علماء اپنے گوشۂ عافیت میں محصور، فضلاء اپنے میدان میں مضطرب، باصلاحیت افراد اپنی صلاحیتوں کو بغیر درست رہنمائی کے غلط راستوں پر لگاتے ہوئے کسی کی بات نہ سننے کی قسم کھائے ہوئے مصروفِ عمل، اور متمول حضرات اپنے افکار و میلانات کو شتر بے مہار بناتے ہوئے اپنے طبقے ہی کی حدوں میں مگن ہیں۔ یعنی یہ کہ ان میں سے کوئی بھی دوسرے کی بات نہیں سُن رہا ہے۔

علماء اس لیے نہیں سُن پاتے کہ ان کو سنانے والے ان تک پہنچتے نہیں حالانکہ ان کا دروازہ ہر ایک کے لئے ہر وقت کھلا ہوا ہے۔ فضلاء، باصلاحیت افراد اور معقول حضرات اس لیے ایک دوسرے سے الگ ہیں کہ یہ اس طبقے سے دور ہیں جو ان کو آپس میں مربوط اور متحد کرنے کی بہترین صلاحیتوں کا حامل اور بہترین آداب کا عالم ہے۔

اور یہ سب اس لیے ہے کہ امت کے مختلف طبقات میں محض غلط فہمیوں کی بناء پر ایک دوسرے کے خلاف نفرت کا رُجحان پیدا ہو گیا، اور صحیح رہنمائی سے دوری کی بناء پر ملّت فرقہ وارانہ فسادات اور طبقاتی کشمکشوں کا شکار ہو گئی ہے اور اس بناء پر افراد و قوم علم

دین سے بے بہرہ اور اپنے آباؤ اجداد و انبیاء و ائمہ کرام علیہم السلام کے علمی ورثہ سے نا آشنا ہو چکی ہے۔

ان اسباب و علل اور ان عواقب نتائج کے پیش نظر ان علتوں سے نجات حاصل کرنے اور ان نتیجوں کو درست نتائج میں تبدیل کرنے کے لئے شدت سے یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ ایک ایسے ادارہ کا قیام عمل میں لایا جائے جو قوم کی علمی، فنی اور اقتصادی صلاحیتوں کا سنگم ہو، جس کے وجود سے علمائے حق، قوم کے معقول حضرات، باصلاحیت افراد، نوجوانوں اور فضلاء وغیرہ ایک دوسرے سے ربط و تعلق پیدا کر سکیں اور ان حضرات کی ایک دوسرے سے لاتعلقی اور انتشار و اضطراب کے باعث قوم کے مسلسل جاری و ساری نقصان کی روک تھام ہو سکے۔ تاکہ یہ تمام وسائل ایک مرکز پر جمع ہوں اور رسول و اہلبیت رسول علیہم الصلوٰۃ والسلام کے تعلیمات کی بھٹی سے پختہ ہو کر نکلیں اور علمائے حق کی درست رہنمائی میں، درست ترین سمتوں میں منظم طور پر آگے بڑھیں، جس کے نتیجہ میں قوم کو سکون و اطمینان حاصل ہو، نیز ملت اسلامیہ کی عظمت و وحدت کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکے۔

چونکہ یہ تمام وسائل دین و دانش ہی کے نام پر مجتمع ہو سکتے ھیں، اس لئے چند افراد قوم نے امام صاحب العصر والزمان عجل اللہ فرجہ کو اپنا سرپرست تصور کرتے ہوئے شبِ عید مباہلہ ۱۳۹۳ھ کے مبارک موقعہ پر اجتماعی طور پر اپنے آپ کو ہمہ تن "دانش گاہِ اسلامی" کے نام سے موسوم کرنے کے فیصلے کا اعلان کرتے ہوئے اس ادارے کے قیام کا باقاعدہ اعلان کیا۔ تاکہ:۔

ان تمام وسائل کو مجتمع کر کے علماء اعلام کی ھدایت کے مطابق مُسلم معاشرہ کو ائمہ اہلِ بیت علیہم السلام کے تعلیمات کی روشنی میں راہِ اعتدال پر گامزن کیا جا سکے اور چونکہ اس بات کے لئے ضروری ہے کہ افرادِ ملت اپنے

دنیاوی معاملات کے ساتھ ساتھ دینی معاملات کو بھی درست کریں، اور دنیاوی امور کے ساتھ ساتھ دینی امور کے لئے بھی اپنے اوقات و وسائل استعمال کریں اور منبر اور قلم کے لئے باصلاحیت اور اہل افراد کی تربیت کیجائے اور یہ دونوں کام تربیت یافتہ اور باصلاحیت افراد ہی کے سپرد کئے جائیں، تاکہ قوم میں پسندیدہ کردار کے حامل افراد پیدا ہوں اور آگے بڑھ کے قوم کی رہنمائی کا اہم ترین فریضہ بطریق احسن انجام دیں نیز ملت مسلمہ کے لئے "خیر دنیا و خیر آخرت" کی متاعِ عزیز بہم دست ہو سکے، اس لئے اس نصب العین کے حصول کے سلسلے میں جو طریقِ کار معین کیا گیا اس میں تعلیم و تعلّم اور علماء و طلبہ ہی کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔

یہاں پر شاید یہ بات بے جا نہ سمجھی جائیگی کہ اسلام چونکہ صلح کل کے نظریہ کا حامل ہے، اس لئے اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے اور ان شاء اللہ رکھا جاتا رہیگا کہ "دانشگاہ اسلامی" کے نصب العین اور نصب العین کے حصول کے طریق کار کے لازمی نتیجہ کے طور پر نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کے باہمی اختلافات اور رنجشیں دور ہوں بلکہ غیر مسلم اقوام کے ساتھ بھی رواداری، مفاہمت اور امن و آشتی کے تعلقات استوار ہو سکیں، اور مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں ایک دوسرے کے متعلق اور غیر مسلم اقوام میں امت مسلمہ کے متعلق جو بے بنیاد غلط فہمیاں موجود ہیں۔ ان کا ازالہ بھی ہو سکے۔

نصب العین

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ (سورۃ بقرۃ آیت ۲۰۱)

علمائے حق کی رہنمائی میں ملتِ اسلامیہ کے تمام وسائل مجتمع کرکے رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر دینی تعلیمات اور انبیاء اور ائمہ علیہم السلام کے ارشادات کی روشنی میں ایسے مرتب و منظم انداز میں درست طریقہ پر استعمال کریں کہ خیرِ دنیا و

خیرِ آخرت کا سامان فراہم ہو سکے۔

طریقِ کار:-

۱۔ افرادِ قوم میں علومِ دینیہ کے حصول کی دلچسپی پیدا کرنا اور اس کے مواقع فراہم کرنا۔
۲۔ جدید ترین سہولتوں اور مطلوبہ ساز و سامان سے آراستہ ایک ایسا تحقیقی مرکز مہیا کرنا جس میں طلبہ اور اربابِ تحقیق کے لئے مناسب رہنمائی اور تعاون کا انتظام ہو۔
۳۔ با استعداد اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو جدید اندازِ خطابت اور ذاکری کی تربیت دینا۔ تاکہ وہ عصرِ جدید کے ذہنی تقاضوں کو پورا کر سکیں اور بیسویں صدی میں پروان چڑھنے والے معاشرے کے لئے جذب و کشش کا سامان مہیا کر سکیں۔
۴۔ رسول اور اہلِ بیتِ رسول علیہم السلام کے مقدس مشن، کے فروغ، نظریات کی تبلیغ اور مثبت علوم و آداب کی نشر و اشاعت کا اہتمام۔
۵۔ ایک ایسے ماحول کی تخلیق و تشکیل جو ہماری جدید نسل اور نئے معاشرے کو مذہب کی جانب زیادہ راغب کر سکے۔ نیز ہمارے نوجوانوں میں ایسی روح پیدا کر دے جس کے باعث ہماری نظریاتی سرحدوں کی حفاظت ہو سکے۔

ہم کتاب اور آپ کے درمیان مزید حائل نہیں ہونا چاہتے اس کے لئے اس گفتگو کو اس درخواست کے ساتھ ختم کرتے ہیں کہ آپ جہاں کہیں بھی ہوں، اپنے فرائض کی ادائیگی اور اعمال صالحہ کی بجا آوری، احکام الہیٰ کی اطاعت اور خداوند عالم کے منع فرمائے ہوئے کاموں سے پرہیز نیز اپنے اعزہ و احباب اور ساتھیوں کو اچھے کاموں کی ترغیب دلانے اور بُرے کاموں سے روکنے کی سعی پیہم کو اپنا شعار بنالیں اور اس سلسلہ میں کسی خوف وخطر اور کسی تنقید و رکاوٹ کو خاطر میں نہ لائیں، کیونکہ نجات کا یہی ایک راستہ ہے اور کوئی شخص صرف یہ کہنے پر نہیں بخشا جائے گا۔ کہ وہ ایمان لے آیا ہے، نجات صرف اُسی وقت ممکن ہے جب ایمان کے ساتھ اعمالِ صالحہ بھی انجام دیئے گئے ہوں اور اس سلسلہ میں قرآن حکیم میں سورۂ عنکبوت کی ابتدائی آیتوں میں واضح طور پر ارشاد فرما دیا گیا ہے کہ:

"..... کیا لوگوں نے یہ سوچ رکھا ہے کہ ہم انہیں صرف یہ کہنے پر چھوڑ دیں گے کہ وہ ایمان لے آئے ہیں اور ان کو آزمایا نہیں جائے گا۔ حالانکہ ہم نے ان سے پہلے والوں کو بھی آزمایا تھا تاکہ ہم یہ جان لیں کہ ان میں سے سچا کون ہے؟ اور یہ بھی جان لیں کہ ان میں سے جھوٹا کون ہے!؟ اور کیا بُرا کام کرنے والے یہ سوچتے ہیں کہ وہ ہم سے بچ کے نکل جائیں گے!؟ تو یہ کتنا بُرا فیصلہ ہے جو ان لوگوں نے کیا ہے۔"

اس لئے ہمیں اپنے عقائد و نظریات پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے اور صرف سوچنے اور کہنے کے بجائے عمل کی دنیا میں قدم رکھ کر اپنے ایمان کی صداقت

فراہم کرنا ہے۔

"کردار کی روشنی" کے عنوان سے اس کتاب کا آخری باب اسی مقصد کے تحت کتاب میں شامل کیا گیا ہے یہ ہم سب کیلئے **امام حسینؑ علیہ السلام** کا ابدی پیغام ہے۔ نیز ہمارے سب قارئین اور کرم فرماؤں کے لئے **دانش گاہ اسلامی** کا پیغام بھی یہی ہے۔

اگر آپ دینی اقدار کو فروغ دینا چاہتے ہیں تو اپنی۔ اپنے اہل خانہ اعزہ، احباب، اہل محلہ اور معاشرہ کی اصلاح کے لئے ٹھوس اقدام کیجئے اور ہمیشہ بات کہنے سے پہلے یہ سوچ لیجئے کہ آپ نے خود بھی اس پر عمل کیا ہے یا نہیں ؟

خوف خدا کو اپنا دتیرہ بنائیے، اعمال صالح کو اپنا شعار اور قدم قدم پر خداوند عالم سے رہنمائی، خلوصِ نیّت اور نیک توفیقات طلب فرماتے رہیے انشاء اللہ المستعان آپ اسے ہر موڑ پر اپنا مددگار اور ہر نیکی میں اپنا معاون پائیں گے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ،
وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهِ الطّٰهِرِیْنَ
وَعَجِّلْ فَرَجَهُمْ وَسَهِّلْ مَخْرَجَهُمْ وَاجْعَلْنَا مِنْ اَنْصَارِهٖ وَاَعْوَانِهٖ
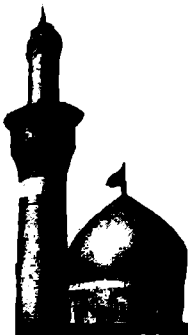
الداعی الی الخیر
مجلس منتظمہ
دانش گاہ اسلامی
کراچی، پاکستان

تقریظ

از : محققِ وحید علامہ حاج سید مرتضیٰ حسین صاحب
صدر الافاضل مدظلہ العالی

"میراثِ انبیاء علیہم السلام" نامی کتاب آپ کے سامنے ہے۔ اس کے مولف جناب سید مجتبیٰ حسین صاحب بی اے (علیگ) کتاب دوست، صاحبِ دانش و بینش مصنف ہیں۔ کاروباری مصروفیتوں کے باوجود وہ مطالعہ بھی کرتے ہیں اور اپنے افکار قلمبند بھی کرتے ہیں۔ یہ کام، چراغ سے چراغ روشن کرنے

کا عمل ہے، اس سے فضا میں روشنی اور ذہن میں بلندی پیدا ہوتی ہے۔ اس ہنگامۂ من و تو میں کتاب خریدنے، پڑھنے، سوچنے اور لکھنے کا وقت کیسے ملتا ہے؟ پھر لطف یہ ہے کہ اس طویل عمل کا صلہ یہ ہے کہ کچھ جیب خالی ہوتی ہے، کچھ قیمتی وقت صرف ہوتا ہے اور اس کی قیمت نہیں ملتی۔ لیکن کمانے اور لوٹنے، سرمایہ اور اشتراک کی باہمی کشمکش میں مجتبیٰ صاحب جیسے دھن کے پکے دوست بھی ہیں جو مشینوں کے شور، اور نوٹوں کے ڈھیر سے بھاگ کر جب گھر میں آن کر سکونِ قلب و دماغ اور آسودگیِ ذہن و نظر چاہتے ہیں تو بچوں کی صورتوں سے دل کو ٹھنڈک اور رفیق حیات کی باتوں سے زندگی کو راحت پہنچاتے ہیں اور اس محبت و سکون کی چار دیواری میں ریاضت کا کمرہ عافیت کا گوشہ، طالب علم کی مطالعہ گاہ اور صاحبِ ذوق کا کتابخانہ بھی ہے۔ اس گوشۂ امن و راحت میں علم کے دفتر اور معارف کے سر بمہر چشمے موجود ہیں۔ مجتبیٰ حسین صاحب ہر گوشے سے لطف، ہر خوشے سے لذت، ہر نظر سے اثر اور ہر اثر سے نتیجہ حاصل کرتے ہیں۔ یہ نتائج تراوشِ قلم بن کر اخبارات و رسائل کے ذریعہ ارباب نظر تک پہنچتے رہتے ہیں، قارئین کی نظر میں مجتبیٰ صاحب خوش قلم و خوش فکر مصنف ہیں۔

"میراثِ انبیاء علیہم السلام" مجتبیٰ صاحب کی ایک قابلِ توجہ کوشش ہے اور محرم کے موقعہ پر" دانشگاہ اسلامی" کی جانب سے یہ دلکش پیشکش انشاءاللہ سعی مشکور ثابت ہوگی۔ "میراث انبیاء علیہم السلام" امام حسین علیہ السلام اور کربلاء پر فکری نظر اور نتائج نظر کا نام ہے۔ اس ضمن میں تاریخ، نفسیات، سیاست، مذہب اور استخراج کے جدید اسالیب کو بروئے کار لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مصنف کس حد تک کامیاب ہیں؟ اور آپ کا نقطۂ نظر کیا ہے؟ مطالعہ کے بعد آپ کو کیا اختلاف پیدا ہوا؟ ایسے مسائل ہیں جن سے ہر مصنف کو دلچسپی ہوتی ہے۔ کیا اچھا ہو، اگر کوئی قاری مطالعہ

کے بعد مصنف کو اپنے تاثرات سے نوازے۔ میں ذاتی طور پر مجتبیٰ حسین صاحب کی اس کوشش کو سراہتے ہوئے کتاب کی اشاعت کا خیر مقدم کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ خداوندِ عالم موصوف کے توفیقاتِ خیر میں دوام عطا فرمائے۔

فقط

اتوار	سید مرتضیٰ حسین
۲۵ر ذی الحجہ ۱۳۹۶ھ	صدر الافاضل
۱۷ر دسمبر ۱۹۷۶ھ	لاہور
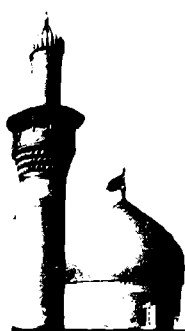
مقدمہ

سرکار علامہ سید ابن حسن صاحب نجفی مدظلہ العالی
رئیس دانشگاہ اسلامی کراچی

اسلام کے نظامِ فکر و عمل کو
اگر ایک دائرہ کی شکل میں فرض کر لیا جائے تو اس کا آدھا قطر ہوگا
"مِنَ اللّٰہِ" ...... اور دوسرے آدھے کو کہیں گے "اِلَی اللّٰہِ"....
یعنی از خدا و بسوی خدا یا خدا کی طرف سے اور خدا کی جانب!
سورۃ بقرۃ (آیۃ ۱۵۶) کی آیۃ وافی ھدایہ
"اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ"

کا یہی مطلب ہے۔

قرآنی نظریہ کے مطابق کائنات کی ہر شئے آفریدگارِ مطلق کے حضور فرضِ بندگی بجالانے میں منہمک رہتی ہے، زمین و آسمان کی کوئی ایسی مخلوق نہیں جو بارگاہ احدیت میں سجدہ ریز نہ ہو:

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ٥ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ٥

(النحل ع۱۶ آیت ۴۹ و ۵۰)

ہر چیز اپنے پیدا کرنے والے کی تسبیح و تہلیل میں مصروف ہے:

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ (سورۂ جمعہ ع۶۲ آیت ۱)

کوئی مانے یا نہ مانے دشتِ امکان کی ہر شئی طوعاً و کرھاً اپنے خالق کی بارگاہ عظمت و جلال کے آگے سرِ خمیدہ ہے:

وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ٥ (سورۂ آل عمران ع۳ آیت ۸۳)

اور جب ہر شئے اطاعت گذار ہے تو پھر انسان تو اس صحنِ عالم میں سب سے زیادہ برجستہ اور ذمہ دار حیثیت رکھتا ہے۔ کیا فرزند آدم کے لیے قانون تکوین کی گرفت سے باہر رہنا ممکن ہے۔ ہرگز نہیں ــ چنانچہ ہر بندہ قانون طبیعی کے مطابق آفریدگارِ مطلق کی فرمانبرداری کرنے پر مجبور ہے۔

لیکن، انسان کی شایانِ شان منزلت یہ ہے کہ وہ آئین فطرت کے جبر ہی سے اطاعت گذار نہ رہے۔ بلکہ عقل و شعور کی نعمت کو کام میں لاکر اور شکر منعم کے قاعدے پر ایمان

رکھ کر اختیاری طور پر بھی فرض بندگی بجالائے۔

اور دیکھیے! قدرت نے آدمی کی جبلت میں جو غیر معمولی خوبیاں سموئی ہیں ان کا تقاضہ صرف یہ نہیں کہ کوئی فرد یا شخص بندگی کا ایک چھوٹا سا حصار کھینچ کر اپنے آپ کو مطمئن کرلے۔ کیونکہ دینِ حق میں "گنگا اشنان" والی کوئی بات نہیں ہے۔ شریعتِ الٰہی ایک آفاقی طرزِ حیات ہے اس کے ہر حکم کی تعمیل عبادت ہے نیز ہر عبادت میں تکمیلِ نفس اور رشدِ اجتماعی کا ساز و سامان مضمر ہوتا ہے۔

اسی لیے قرآنِ حکیم نے ہر فردِ مسلم پر جہاں ہمہ وقت خود اپنے کردار کا جائزہ لینے کی ذمہ داری ڈالی ہے۔ وہاں اسے دوسروں کی روش کا بھی محتسب قرار دیا ہے۔ تاکہ فتنہ و فساد کے سارے سوتے خشک ہو جائیں!

لیکن، یہ بڑی صاف بات ہے کہ اس اہتمام و انتظام کی کامیابی اور کامرانی کا دار و مدار اس حقیقت پر ہے کہ پورا معاشرہ خارجی اثرات، اجنبی افکار اور انتقامی تحریکات سے محفوظ رہے۔ پھر عنانِ اقتدار دشمنانِ دین کے ہاتھ میں نہ جانے پائے۔ ورنہ وہ سب کچھ ہوگا جو نہیں ہونا چاہیئے۔ یعنی نہ اُمت رہے گی اور نہ دین۔

مگر، اس مرحلہ پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دین پر اگر کوئی ایسا کڑا وقت آجائے کہ حدِ نظر تک ہلاکت ہی ہلاکت دکھائی دے تو اس کے دفاع کا بھی کوئی بندوبست ہے یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہوگا کہ ہاں!

قدرت نے اس کا مکمل اور منظم انتظام کیا ہے۔ تاریخ پر ایک نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ نوامیسِ الٰہیہ اور انسان کے روح و ضمیر کو جب کبھی کوئی بڑا خطرہ لاحق ہوا ہے تو خاصانِ خدا حق کی حفاظت کے لیے کھڑے ہوئے اور مجسم ایثار بن گئے۔

انہوں نے ہمیشہ گلدستۂ بامِ دار پر اذانیں دیں اور محراب

خمِ شمشیر میں سجدے بسائے۔

سورۂ احزاب۳۳ کی تیئیسویں آیت میں انہیں مردانِ حق و حقیقت کے بارے میں ارشاد رب العزت ہوا ہے:

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا

"صاحبانِ ایمان میں سے کچھ ایسے مرد بھی ہیں جنہوں نے خدا سے کیے ہوئے (جاں نثاری کے) عہد کو پورا کر دکھایا، پس ان میں سے بعض وہ ہیں جو اپنا وقت پورا کر گئے اور کچھ انتظار میں بیٹھے ہیں۔ اور ان لوگوں نے اپنی بات میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آنے دیا۔"

کیا، تاریخ یہ نہیں بتاتی کہ حضرت نوح علیہ السلام نے وفاشعاروں کی آبرو رکھ لی، آپؑ کے زمانے میں ظلم و ستم کے کیسے کیسے طوفان اُٹھے، مگر آدمِ ثانی نے کس ہمت اور کتنی عمدگی سے خداپرستوں کی کشتی پار لگا دی؟ یہ اسی ایفائے عہد کا مقدس جذبہ تھا جس کے باعث اللہ کے دوست حضرت ابراہیم علیہ السلام کسی خطرہ کو خاطر میں نہیں لائے۔ اور کالڈیا کے بت خانہ میں توحید کا نعرہ لگا کر نمرود اور اس کی خدائی کو آتشِ زیر پا بنا دیا۔ نیز یہی مثالی کردار تھا جو موسیٰ و فرعون کے تصادم کا سبب بنا اور ضربِ کلیم کی دھمک سے نیل کی تہذیب کا کلیجہ پانی ہو گیا۔ سوریا کے اسرائیلی کج کلاہ ہیرودس کی حکومت حلال و حرام کے تفرقہ کو ختم کرنا چاہتی تھی مگر جناب یحییٰ علیہ السلام خدا کے احکام کی تبدیلی کیسے برداشت کر سکتے تھے؟ چنانچہ آپؑ نے ناموسِ شریعت کی حمایت میں سر دھڑ کی بازی لگا دی اور وقایع عالم کے مجموعہ نے بتایا کہ ذکریاؑ کا فرزند تو شہید

کردیا گیا۔ مگر روم کے بادشاہ طیطوس کے ہاتھوں شامی حکومت کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام حکومتِ ربانی کے داعی نیز خدا سے کیے ہوئے عہدو میثاق کے پابند تھے، اور یہودی صرف اپنی خواہشوں کا راج چاہتے تھے نتیجتہً آویزش بڑھی اور بات تختۂ صلیب تک پہنچی اور پھر دنیا کی نگاہوں نے مسیح کو سرِ دار دیکھا، لیکن سرداری ان کا مقدر قرار پائی۔

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سرتاجِ رسل اور خاتم الانبیاء تھے نیز تمام پیغمبروں کے جملہ ستودہ صفات کا مرکز اور اخلاق الٰہیہ کا مظہر کامل بھی تھے آپؐ کی حیات طیبہ میں جس طرح تمام نبیوں کی برجستہ خوبیوں کا محیرالعقول اظہار ہوا۔ اسی عنوان سے حصول مقصد کے سلسلہ میں تسلیم و رضا، ایثار و قربانی اور صبر و شکیبائی کے جوہر بھی حضورؐ ہی کے آستانِ قدس پر کھل کر سامنے آئے۔ مکے کی کرب انگیز زندگی ---! شعب ابی طالبؑ کے کلیجہ پانی کردینے والے شب و روز ---! طائف کا دردناک سفر ---! ہجرت کے زہرگداز لمحے ---! اور پھر مدینہ کی زندگی میں اسلامی دنیا پر مسلسل یورش، پیہم ہجوم! اس کے علاوہ منافقوں کا روح فرسا دویہ ---! یا یوں کہیے کہ خارجی حملوں کے ساتھ ساتھ داخلی سازشیں کس درجہ تکلیف دہ ہوں گی ---!!

یہ بات، کسی قیاس پر مبنی نہیں، قرآن حکیم کے سورۂ توبہ کی اکسٹھویں آیت کہتی ہے:

وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ ط

"اور ان میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو رسولؐ کو اذیت دیتے ہیں اور کہتے ہیں وہ صرف کانوں سے سنتے ہیں۔"

اسی بات کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے

لفظوں میں یوں بیان فرمایا ہے:

مَا اُوْذِیَ نَبِیٌّ کَمَا اُوْذِیْتُ

"کسی نبی کو اتنا نہیں ستایا گیا جتنا مجھے مبتلائے درد کیا گیا"

مگر، ان تمام اذیت ناکیوں کے باوجود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا موقف ہمیشہ یہ رہا کہ ظلم وستم پر صبر تو کیا جا سکتا ہے لیکن ظالم اور ستمگر کے ساتھ مفاہمت ناممکن ہے۔ پھر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگاہیں صرف حال پر نہیں بلکہ مستقبل کا بھی جائزہ لے رہی تھیں اور آپؐ کے وصال کے بعد جو زلزلے آنے والے تھے، جو طوفان اُٹھنے والے تھے جو آندھیاں چلنے والی تھیں آپؐ کو ان کا پورا پورا احساس تھا۔

اسی لیے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے مکتبِ تربیت میں ایسے ذہن بنائے، ایسے دماغ وضع کیے، ایسے کردار تعمیر فرمائے اور دنیا کے سامنے ایسی ایسی شخصیتیں پیش کیں جو وقت پڑنے پر بغیر کسی تحفظ کے پوری للّٰہیت کے ساتھ خدا سے کیے ہوئے وعدوں کی تکمیل میں کوئی جھجک محسوس نہ کریں اور حرفِ حق بلند کرنے کی خاطر مجسم قربانی بن جائیں۔

بڑے کاموں کے لیے، بڑی شخصیتوں کا ہونا ضروری ہے۔ پھر، ایسے کاموں کے واسطے جنہیں پورا کرنے کی راہوں میں جب امتحان وابتلا کے انتہائی ہوشربا مرحلے آتے ہوں تو کتنی عظیم شخصیت درکار ہو گی ــــ!

روی کشادہ باید وپیشانی فراخ
آنجا کہ لطمہ ھای یداللہ می زنند

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یقیناً اپنی مساعی میں کامیاب ہوئے اور آپؐ نے اپنے مقصد کی تکمیل اور اپنی تحریک کو ابدیت سے ہمکنار کرنے کے لیے وہ ہستیاں پیش کیں جنہوں

نے ہر کڑے وقت پر زبان حال سے یہ کہا ہے ؎

موجِ خوں سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا !؟

اور تاریخِ انسانی نے اس کی گواہی دی کہ انہوں نے جو کہا تھا وہ کر دکھایا۔

حسین علیہ السلام ـــ رسولؐ کے نواسے تھے اور آپؑ کی تربیت میں پیغمبر کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خاص دلچسپی لی تھی۔ ہاں! اس خصوصی انہماک کا سبب رسولؐ کی مستقبل بینی ہی ہو سکتی ہے ـــ!

پیغمبرؐ جانتے تھے کہ، اسلام کے مقابلہ میں ایک انتقامی تحریک کھڑی ہو چکی ہے اور ایک جوابی انقلاب لانے کی کوشش کی جا رہی ہے، اور جس وقت اسلام دشمن عناصر تمام انبیاء علیہم السلام کی محنت اور جملہ رسولوںؑ کی ریاضتوں پر پانی پھیرنے کی آخری تیاریاں کر چکے ہوں گے اس نازک لمحہ میں سوائے حضرت امام حسین علیہ السلام کے اور کوئی اس مقدس اثاثے کو بچانے کے لیے آگے نہیں بڑھے گا اور یہی ہوا۔ ابوسفیان کی تمنائیں یزید کی صورت میں جوان ہوئیں اور ـــ یزید کا اقتدار دینِ خدا پر ٹوٹ پڑا ـــ! حسین علیہ السلام نے صورتِ حال کا جائزہ لیا اور اس وقت جو کچھ ہو رہا تھا مختصر سے جملے میں اسے امت کے سامنے یوں پیش فرمایا:

أَلَا تَرَوْنَ أَنَّ الْحَقَّ لَا يُعْمَلُ بِهِ وَالْبَاطِلَ لَا يُتَنَاهَىٰ عَنْهُ

"کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ حق پر عمل نہیں ہو رہا ہے اور باطل کی راہوں پر چلنے سے کوئی روکنے والا دکھائی نہیں دیتا۔"

نیز یہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس لیے اور صرف اس لیے کہ حکومت اس روش کی سرپرستی کر رہی ہے، یزید، رسولؐ کے نام پر اپنا خطبہ پڑھوا رہا ہے۔" اور جب یزید

جیسا شخص مملکتِ اِسلامیہ کا سربراہ بن جائے تو پھر سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ اسلام کو آخری سلام کر لیا جائے؟

وَ إِذَا كَانَ الْوَالِي مِثْلَ يَزِيْدٍ فَعَلَى الْإِسْلَامِ السَّلَامُ

مگر، حسین علیہ السلام خاموشی کے ساتھ اسلام کا جنازہ اٹھتا ہوا نہیں دیکھ سکتے تھے۔اس لیے کہ وہ رسول ؐ کے ورثہ دار تھے اور رسول ؐ کے حوالہ سے تمام انبیاء علیہم السلام کے وارث تھے۔ لہٰذا، وہ دین کی حفاظت، ناموسِ الٰہی کی صیانت اور اپنے ورثہ کے تقدس کو ثابت کرنے کے لیے اپنے چند باوفا ساتھیوں کے ساتھ مدینہ سے نکل کھڑے ہوئے اور حق و باطل کے معرکہ کو فیصلہ کن منزل تک پہنچانے کے واسطے مقتل کی تلاش میں مکہ سے کربلا تک پہنچے اور کربلا ہی وہ زمین نکلی جس کے ذرہ ذرہ نے زبانِ حال سے تاریخ انسانی کو یہ بتایا کہ :

تا قیامت قطع استبداد کرد
موجِ خونِ او چمن ایجاد کرد

بہرِ حق در خاک و خون غلطیدہ است
پس بنائے لا اِلٰہ گردیدہ است

خونِ او تفسیرِ ایں اسرار کرد
ملتِ خوابیدہ را بیدار کرد

نقشِ اِلّا اللہ بر صحرا نوشت
سطرِ عنوانِ نجاتِ ما نوشت

رمزِ قرآں از حسینؑ آموختیم
ز آتشِ او شعلہ ہا اندوختیم   اقبالؔ

سرکار رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک ارشاد ہے :

إِنَّ لِقَتْلِ الْحُسَيْنِ (ع) حَرَارَةً فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِيْنَ

لَا تَبْرُدُ أَبَدًا

"حسین علیہ السلام کی شہادت سے اربابِ ایمان کے دلوں میں وہ سوز و تپش پیدا ہوگی جو امتدادِ زمانہ کے باوجود ختم نہیں ہوسکتی۔"

دانشمند محترم جناب سید مجتبیٰ حسین صاحب نے سیدالشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام کی محبت ماں کے دودھ کے ساتھ پی ہے اور سوز و تپش جذبۂ ایمانی سے حاصل کی ہے۔ پیشِ نظر کتاب "میراثِ انبیاء علیہم السلام" اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ مجتبیٰ صاحب ساداتِ شمس آباد کے مشہور و معروف خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس کے تمام افراد اپنے وقتوں میں "چندے آفتاب چندے ماہتاب" تھے۔ دانش و آگہی سے شغف اس خاندان کا طرۂ امتیاز رہا اور مجتبیٰ صاحب نے اس امتیاز کو باقی رکھا۔ اللہ ان کے توفیقات میں مزید اضافہ کرے۔ آمین!

"میراثِ انبیاء علیہم السلام" میں انبیاء علیہم السلام کی سراپا ایثار زندگی کی روداد ہے، قربانی کے فلسفہ پر فکر انگیز گفتگو ہے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے مجاہدات کا تذکرہ ہے اور پھر۔ ذبحِ عظیم کے مصداق، سیدالشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام کی بے مثال قربانی اور آپ؏ کے تمام رفیقانِ شہادت کے بصیرت افروز کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

لیکن، فاضل مصنف نے واقعات کے اعادہ یا واردات کے بیان پر اکتفا نہیں کی ہے، بلکہ پس منظر و پیش منظر کے تحلیل و تجزیہ کا حق بھی ادا کیا ہے۔ بنا بریں یہ کہنا حق بجانب ہوگا کہ "میراثِ انبیاء علیہم السلام" تاریخ کی محض ایک کتاب ہی نہیں بلکہ انسانی روح و ضمیر کے لیے رشد و ہدایت کا ایک صحیفہ بھی ہے۔

گوناں گوں مصروفیتوں کے باوجود جس طرح مجتبیٰ حسین صاحب نے اتنا بڑا کام کر ڈالا، خدا کرے کہ "دانشگاہِ اسلامی" کے دوسرے ارکان بھی اسی ہمت کا مظاہرہ کریں۔ آمین !!

شنبہ	سید ابنِ حسن نجفی
۹ر صفر ۱۳۹۷ھ	رئیس دانشگاہِ اسلامی،
۲۹ر جنوری ۱۹۷۷ء	کراچی

حرفِ اوّل

اللہ عزّوجل کی حمد و ثنا
اور رسولؐ و اہلبیتِ رسولؐ پر درودِ مسلسل کے ساتھ "میراثِ انبیاء"
کے نام سے جو کتاب آپ کے پیشِ نظر ہے اس میں تاریخِ انسانی کے اہم
ترین ابواب میں سے ایک ایسے باب کا تعارف کرانا چاہ رہا ہوں جو
اپنی بے شمار امتیازی خصوصیتوں کی وجہ سے اپنی مثال آپ ہے۔

امام حسین علیہ السلام نے ایک موقعہ پر ارشاد فرمایا تھا:

"ہم اور ذلت و رسوائی ــــــــــــ!!
اللہ، اس کے رسول، مومنین، میری پرورش کرنے والی پاکیزہ گودیں، اور میری تربیت کرنے والی دلیر و غیور، بلند نظر اور عالی طبع ہستیاں کسی قیمت پر یہ بات گوارا نہیں کر سکتیں کہ عزت و غیرت پر قربان ہونے کے بجائے ذلیل اور کمینے لوگوں کی اطاعت قبول کر لی جائے ـــ!"

اپنے اس ارشاد میں حضرت امام حسین علیہ السلام نے واضح طور پر اس حقیقت کا اعلان فرمایا تھا کہ میں انبیاء اور مومنین نیز اپنے طیب و طاہر آباؤ اجداد اور معزز و محترم خاندان کے صفات و کمالات کا وارث ہوں اور مجھے ہر قیمت پر اس وراثت کی حفاظت کرنا ہے۔ اس کتاب میں میں نے اپنی بے بضاعتی کے اعتراف کے ساتھ، امام حسین علیہ السلام کے اس فرمان کی روشنی میں واقعہ کربلا کا ایک ایسا تعارف پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو میرے ان نوجوانوں کے کسی کام آسکے جو براہ راست گہرے مطالعہ کے لیے وقت نہیں نکال سکتے۔ شاید یہ عام فہم اور سادہ تحریر ان کے لیے یہ موقع فراہم کر سکے کہ وہ اپنے ذہن پر بہت زیادہ بوجھ ڈالے بغیر واقعۂ کربلا کے متعلق ضروری حقائق سے آگاہ ہو جائیں اور اس کے مقاصد کو سمجھنے کے بعد اپنوں کو چھوڑ کر غیروں کے فلسفہ کی طرف رخ نہ کریں جب گھر میں سب کچھ موجود ہو تو پھر دوسروں سے بھیک مانگنے کی کیا ضرورت؟ آپ اس سلسلہ میں یقیناً مجھ سے پورا پورا اتفاق کریں گے کہ ہمیں پہلے اپنے فلسفۂ زندگی کا بھرپور

مطالعہ کرنا چاہیئے تاکہ اس کا کوئی پہلو ہم سے مخفی نہ رہ جائے۔خواہ اس کا سیاست سے تعلق ہو۔خواہ وہ معاشی مسائل ہوں۔خواہ اس کا تعلق اخلاقیات سے ہو یا وہ عدلیہ اور انتظامیہ کے جزا و سزا کے معاملات ہوں۔ اس مطالعہ کے بعد ہی ہمیں یہ حق پہنچتا ہے کہ ہم دوسروں کے فلسفوں کا بہ نظر غائر اور بغیر تعصّب کے غیر جانبدارانہ مطالعہ کریں۔ تاکہ ہمیں حقائق کو سمجھنے میں کسی قسم کی دشواری پیش نہ آنے پائے اور نہ ہی دوسروں کا غلط پروپیگنڈا ہمیں گمراہ کر سکے۔

اسلام کسی پاپائیت کا قائل نہیں ہے اور نہ ہی وہ کسی کی اجارہ داری کو گوارہ کرتا ہے۔ دینی معاملات میں علمائے دین قابلِ احترام ہیں۔ انہوں نے محنتِ شاقہ برداشت کر کے علم کا بڑا سرمایہ ہمارے لئے جمع کر دیا ہے۔ ان کا احترام ہمارا فرض ہے۔ مگر ہم اس کے پابند نہیں ہیں کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں لکھتے ہیں، ان کو آنکھیں بند کر کے قبول کر لیں۔ نہیں، ہم پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ہم میں کی ہر فرد خود بھی واقعات کا کتبِ معتبرہ سے مطالعہ کرے اور پھر جائزہ لے کہ کون کیا کہہ رہا ہے، اور اس میں کتنی صداقت موجود ہے۔ اور ان کے ارشادات کس حد تک قابل اتباع ہیں؟ اس سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ عام لوگوں میں فروغ علم کا جذبہ پیدا ہو جائے گا۔ جن میں لکھنے کی صلاحیت ہے وہ کتابیں تصنیف کریں گے جن میں بولنے کی قدرت ہے وہ بذریعہ کلام بڑا اہم فریضہ انجام دے سکیں گے اور پھر ہم کسی کے محتاج بن کر نہ رہیں گے اور بہت سی ایسی باتیں جو گمراہ کن یا ذاتی مصالح کی وجہ سے ملت کے مختلف فرقوں میں ما بہ النزاع بنی ہوئی ہیں اور آہنی دیواریں کھڑی کر دی گئی ہیں وہ اس طرح سے خود منہدم ہو جائیں گی۔ جب کسی عظیم الشان قصر

میں سے جو ترمیم کردہ نو تعمیر شدہ حصے APPARTMENTS نکال دیئے جائیں گے
تو اس قصر کی عظمت بنانے والے کے مزاج کے مطابق از سر نو اپنے اصلی مقام پر واپس
آ جائے گی اور دنیا اس عظیم عمارت کو دیکھ کر پھر ششدر رہ جائے گی اور اس کام کو انجام دینا ہم
میں سے ہر شخص کا اولین فرض ہے۔ میدانِ علم میں اپنی بے بضاعتی کے باوجود میں نے
انتہائی کوشش کی ہے کہ ہمیں حقیقت کو واضح کرنے میں کوئی فروگذاشت نہ ہو جائے
تمام حوالے کتب معتبرہ سے دیئے گئے ہیں اور بعض مقامات پر میرے ذاتی تبصرے بھی
ہیں اور وہ بھی ضرورت کے تحت۔ پھر بھی بحیثیت انسان غلطی کا امکان
رہ سکتا ہے، اس کے لیے معذرت خواہ ہوں اور ہر معقول تجویز اور
جائز اعتراض کا کھلے دل سے احترام کروں گا اور آئندہ اشاعت میں
انشاء اللہ ان خامیوں کا ازالہ کر دوں گا۔ میں اہلِ زبان نہیں ہوں لہٰذا
زبان کی غلطیوں کے سلسلے میں بھی عفو کا خواستگار رہوں۔

اسلام کی تحریک مکہ معظمہ سے جو صاحبانِ ایمان کا اولین مرکز
توحید ہے شروع ہوئی۔ داعیٔ اسلام رحمۃ للعالمین حضرت محمد
مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بگڑے ہوئے معاشرے کی سماجی
حالت کو درست کرنے کی جانب اہلِ مکہ کو متوجہ کیا۔ آپ کو خود اندازہ
ہوگا کہ معاشرہ کی سماجی حیثیت جب مسخ ہو جاتی ہے تو اس کے اسباب و علل
کیا ہوا کرتے ہیں اور ایک عام آدمی معاشرہ کی اس مسخ شدہ حالت سے
کس حد تک اثر انداز ہوتا ہے؟ دیکھنے میں تو ضرور انسان معلوم ہوتا ہے
لیکن حقیقتاً اس سے وہ تمام اجزا جس سے کہ انسانیت عبارت ہے
ختم ہو جاتے ہیں۔ اخلاقی اعتبار سے جب انسان اتنا کھوکھلا ہو جاتا
ہے تو ایک مخصوص طبقہ اُبھرتا ہے جس کا نہ کوئی دین ہوتا ہے
اور نہ ایمان۔ وہ عام انسان کی اس کمزوری سے مادی فائدے

حاصل کرتا ہے۔ اس کی مثال اب سے کچھ ہی دن پہلے اس ملک میں ہمارے سامنے تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نام نہاد اشراف و اکابر مکّہ کو ان کے طور طریقہ کی اصلاح اور ایک مخصوص نظام کی پابندی کے لیے دعوت دی جس میں ان ہی کا فائدہ تھا مگر وہ کند ذہن اور شورش پسند لوگ آمادہ فساد ہو گئے اور ہر طرح کی اذیتیں داعیٔ اسلام کو دیں، بگڑی ہوئی سماجی حالت کو درست کرنے کی راہ میں ہر ممکن رکاوٹیں پیدا کر دیں۔ اس حد تک کہ دعوتِ اسلام کا فروغ مکّہ میں ناممکن بن گیا اور یہ امر ناگزیر تھا کہ دعوتِ اسلام کو آگے بڑھانے کے لئے دوسرا مرکز تلاش کیا جائے۔ چنانچہ اس کام کے لیے یثرب (مدینہ طیبہ) کا مردم خیز خطہ منتخب ہوا۔ جہاں اسلام پہلے سے اپنا گھر کر چکا تھا اور اوس و خزرج کے طاقتور قبائل آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دستِ مبارک پر مکہ میں بیعت کر کے مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے (ملاحظہ ہو بیعتِ عقبہ اولیٰ و ثانیہ)

خدا کے حکم سے خدا کا یہ پیامبرؐ ہجرت کر کے مدینہ آگیا، اسلام کی تحریک کا دوسرا باب یہاں سے شروع ہوا۔ شوریدہ سر قریش نے مدینہ میں بھی چین سے اس تحریک کو چلانے نہ دیا، چھوٹے چھوٹے سریوں کے علاوہ غزوۂ بدر، احد، احزاب، خیبر اور حنین کے معرکوں کا پس منظر اس کا تاریخی ثبوت ہے۔ جنگِ احزاب میں تو انہوں نے قیامت ہی برپا کر دی تھی۔ جملہ عرب قبائل مع اپنے حلیفوں اور یہودیوں کے، تمام وسائل کے ساتھ مدینہ پر چڑھ دوڑے۔ مولانا شبلی نے تو احزابیوں کی تعداد ۲۴ ہزار لکھی ہے اور اتنی بڑی فوج عربوں نے کبھی

دیکھی ہی نہیں تھی اور اپنا دفاع کرنے والے صرف تین ہزار تھے پھر بھی مخالفین کو انجام کار منہ کی کھانا پڑی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوئی بادشاہت تو قائم کرنا نہیں چاہتے تھے۔ کسی موروثی سلسلہ حکومت کی داغ بیل تو نہیں ڈال رہے تھے۔ کسی کے مال پر تصرف تو نہیں کر رہے تھے، کسی کے قتل کے تو در پے نہیں تھے اور پھر جب کہ وہ مکہ چھوڑ کر مدینہ چلے آئے تھے تو پھر مخاصمت کی کیا وجہ باقی رہ جاتی ہے۔ تاریخی اسناد موجود ہیں کہ پیغمبر کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ پر چڑھائی کا کوئی پروگرام بھی نہیں بنایا تھا۔ مدینہ آکر انہوں نے یہودیوں سے بھی معاہدہ کیا تھا اور ان کی عبادت گاہوں کو تحفظ دینے کا وعدہ بھی فرمایا تھا۔ مدینہ میں ان کے سامنے صرف یہ پروگرام تھا کہ مسلمانوں کی روحانی اور اخلاقی تنظیم کی جائے۔ بے گھر لوگوں کو بسایا جائے۔ اُن کے لیے اسباب معیشت فراہم کیے جائیں اور بس، تو پھر ہر سال مدینہ پر چڑھ دوڑنے کا کیا سبب تھا اور وہ کیا محرکات تھے کہ باوجود اختلاف مذہب کے سب عرب قبائل اسلام کا استحصال کرنے پر آمادہ ہو گئے؟

اس پس منظر کو سمجھنا کچھ دشوار نہیں ہے اور موجودہ دَور کے حالات اس حقیقت کو سمجھنے میں بڑی مدد دیں گے:

کفار قریش ہوں یا نصاریٰ اور مجوسی سب نے یہ اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ اسلام کا داعی ایک باصلاحیت اور مضبوط عزم و ارادہ کا مالک ہے اور اس میں زبردست تنظیمی صلاحیتیں موجود ہیں اور وہ گروہ امراء اور ایک عام آدمی میں امتیاز قائم رکھنے کا قائل نہیں ہے۔ وہ ہماری جھوٹی شان و شوکت کو اور ان

بتوں کو جن کے ذریعے ہم جاہل عوام کو اب تک بیوقوف بناتے رہے
ہیں اور ان کی محنت کے پھل کھاتے رہے ہیں خاک میں ملا دے گا۔ یہ ہی
خطرہ یہودیوں کو لاحق تھا۔ باوجود اس یقین کے کہ محمدؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
وہی رسولؐ ہے جس کا ذکر توراۃ میں ہے۔ یہودیوں نے بھی مخالفت
کی۔ اسلیے کہ وہ بھی سود خور اور ظالم تھے اور بخوبی سمجھ گئے کہ اسلام کا
استحکام "SOCIO-ECONOMIC JUSTICE" قائم کر کے رہے گا۔

بہرحال! ان سب نے مل کر جو کچھ کرنا تھا کیا لیکن وہ تحریکِ اسلام
کو آگے بڑھنے سے نہ روک سکے۔ قریش سے آنحضرتؐ کو صلح بھی کرنا
پڑی جس کو تاریخ میں صُلح حدیبیہ کہتے ہیں۔ بظاہر یہ غیر فاتحانہ انداز میں
ہوئی مگر اس کے دُور رس نتائج نے بتا دیا کہ اس صلح نامہ سے مسلمانوں کو
کس قدر فائدہ ہوا۔ شمالی عرب میں محض اس صلح نامہ کی وجہ سے جنگ
کے موقعہ پر خیبر میں یہودیوں کو تنہا مسلمانوں کا سامنا کرنا پڑا اور شکست
کھائی اور بالآخر مکہ بغیر خونریزی کے فتح ہوگیا۔ سرکار رسالت مآبؐ
نے اس موقعہ پر وہ فقید المثال خطبہ ارشاد فرمایا جو ابد تک انسانیت
کی روح بنا رہے گا۔ واضح اعلان کردیا گیا کہ آج سے شخصیت کا معیار
نہ تو بڑے بڑے خاندانوں سے تعلق قرار دیا جائے گا اور نہ بڑے بڑے
قبیلوں کی سربراہی معیارِ عزت ٹھہرے گی۔ معزز وہی ہوگا جو اچھے کردار
کا مالک اور صالح ہوگا۔ عمرانی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ انسانی برادری
کو ایک عظیم الشان فلسفۂ حیات مل گیا۔ جو ان کے ہر درد کا مداوا تھا
۱۱ھ میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ آلہ وسلم نے اس دار فانی سے
عالم جاودانی کا رخ کیا تو پورا جزیرہ نمائے عرب مسلمان ہو چکا
تھا۔ اور یہ سب کچھ تئیس ۲۳ سال کی مدت میں ہوا۔ انقلابات

کی تاریخ جنہوں نے پڑھی ہے وہ بتائیں کہ اس سے زیادہ حیرت انگیز انقلاب اور اتنی کم مدت میں کون لا سکا؟ یقیناً سب مورخین اس امر پر متفق ہیں کہ یہ صرف ختمی مرتبت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی ذات والا صفات تھی۔ معاشرہ کی بُری حالت کو درست کر دیا، ان کے دلوں سے تمام اخلاقی ذمائم دور ہو گئے، ان کے ذہنوں میں احترام آدمیت پیدا ہو گیا۔ ان کے ضمیر میں زندگی واپس آ گئی۔ انہیں انفرادی اور اجتماعی زندگی میں فرق محسوس ہونے لگا۔ وہ ملوکیت کو لعنت سمجھنے لگے۔ وہ تصرف بیجا کے قائل نہ رہے، وہ دین دار اور خدا پرست ہو گئے غرضیکہ انسان کی زندگی جن اجزا سے مرکب ہوتی ہے، ان کے اندر حضور صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی ذاتِ گرامی نے وہ سب خوبیاں پیدا کر دیں

آپؐ نے کسی موقع پر ارشاد فرمایا تھا اور یہ وہ زمانہ تھا کہ سوائے لوٹ مار کے عربوں کے پاس اور کچھ نہ تھا۔ کہ "ایک وقت آئے گا جب ایک تنہا عورت حضر موت سے پیدل چل کر مدینہ آئے گی اور درمیان راہ کوئی نظر اٹھا کر بھی اس کی طرف دیکھنے کی جرأت نہ کر سکے گا۔ یہاں تک وہ اپنے مال اور آبرو کی سلامتی کے ساتھ مدینہ میں داخل ہو گی"۔ اسوقت کی دنیا نے عرب یہ بات کب صحیح مان سکتی تھی۔ جبکہ لُوٹ مار ان کی عادت اور زناکاری ان کا پیشہ تھا؟

لیکن ٹھیک اکیاون سال کے بعد اسلام کا کیا حشر ہوا؟ وہ عظیم فلسفہ جس پر زندگی کی بنیادیں قائم کی گئی تھیں، اقدارِ انسانی کردار کی بلندی پر مبنی قرار دیئے گئے تھے۔ شرف و فضیلت کا معیار نسل و خون سے ہٹا کر صالح زندگی پر قائم کیا گیا تھا اسلامی قانون میں شاہ و گدا کو یکساں حیثیت مل گئی تھی

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "لَیْسَ لِأَحَدٍ عَلٰی أَحَدٍ فَضْلٌ إِلَّا بِدِیْنٍ وَتَقْوٰی۔ یہ ہی مذہب اسلام تھا اور یہ ہی اسلامی سیاست تھی یعنی دو مختلف ادارے نہ تھے۔ اگر مذہب کو سیاست سے الگ کرتے ہیں تو پھر مذہب کی افادیت ختم ہو جاتی ہے اسی طرح اگر سیاست کا رشتہ مذہب سے منسلک نہیں رہتا ہے تو پھر جاہ پرست حریصوں کا ایسا ٹولہ اُبھر آتا ہے جس کی تلوار سے نہ اپنے محفوظ ہیں اور نہ غیر۔!

اسی لیے کہا گیا ہے کہ "اسلام میں سیاست" حصولِ اقتدار کے کامیاب ذرائع کے استعمال کا نام نہیں ہے بلکہ سیاست ملک وملت کے صحیح نظم وضبط اور کاروبارِ خلائق کو بہترین طریقہ سے چلانے کا نام ہے۔ یہ اس لیے تھا کہ اسلام میں شریعتِ الٰہیہ کے دائرہ سے الگ حکمران کا تخیل پیدا نہ ہو اور سوائے خداوندی اقتدار کے کسی اقتدار کے آگے مسلمانوں کی گردنیں نہ جھکیں۔

۶۰ھ ہجری میں اسلامی فلسفہ حیات و سیاست کی یہ بساط الٹ دی گئی اور اب مسلمانوں کو اُنہی جاہلانہ نظام کی طرف لیجانے کا کام شروع کر دیا گیا۔ جس کے خلاف آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سخت جدوجہد کر کے لوگوں کو صحیح راستہ پر چلنے کی عادت ڈالی تھی۔

یزید کا اسلامی سیاست پر تسلط کوئی معمولی بات نہ تھی جس کو خاموشی سے برداشت کر لیا جاتا۔ اگر وہ یہ اعلان کر دیتا کہ میرا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ اسلام کوئی مذہب ہے اور میں اس کے خلاف لوگوں کو حکم دیتا ہوں کہ وہ اس کو ترک کر کے جاہلانہ نظام کی پیروی کریں ورنہ وہ شمشیر کی گھاٹ اتار دیئے جائیں گے۔ تو معاملہ بڑا ہی آسان ہو جاتا اور حضرت امام حسین علیہ السلام کے لیے کام میں بڑی آسانی پیدا ہو جاتی۔

مگر یہاں دشواری یہ پیدا ہوئی کہ باوجود اسلام سے نفرت کرنے کے اس نے دعویٰ جو کیا وہ یہ تھا کہ میں ہی پیغمبرِ اسلام کا نائب ہوں، خلیفہ برحق اور اولوالامر ہوں اور میری بیعت ایک فریضۂ مذہبی ہے۔ جبکہ شارع اسلام کے لائے ہوئے دین سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہ تھا اور نہ وہ سیاست میں سیرت نبوی ؐ کا پابند تھا بلکہ وہ تمام قبیح افعال کا مرتکب ہوتا تھا جس کا عام مسلمانوں پر بھی اثر پڑ رہا تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب اس کی بیعت کا سوال پیدا ہوا تو سوائے چند کے جن میں سرفہرست حضرت امام حسین علیہ السلام ہیں۔ سب نے اس فاسق و فاجر کی بیعت کر لی اور اس کو امیرالمومنین کا لقب دے دیا گیا۔ کسی نے کوئی عملی احتجاج نہ کیا، گویا وہ تقریباً رسولِ اسلام ؐ کا جانشین بن بھی چکا تھا اور اس کی جانشینی کی تکمیل صرف حضرت امام حسین علیہ السلام کی آخری بیعت پر مبنی تھی، اس بیعت کے حاصل کر لینے میں اس کے مذہبی اور سیاسی مصالح پوشیدہ تھے۔ امام حسین علیہ السلام بیعت کر لیتے تو گویا خاندانِ رسول ؐ کا (CONFORMATION) صداقت نامہ اس کو حاصل ہو جاتا اور پھر سیاسی نقطۂ نظر سے ایک زبردست مستحق خلافت کے میدان سے کنارہ کش ہو جاتا یقیناً مطلع ایسا صاف ہو جاتا کہ جب ۵۱ سال میں بے حسی کا یہ عالم تھا تو آج ۱۳۹۶ھ میں تو کوئی مسلمان باقی ہی نہ رہتا، اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ لفظ مسلمان لغت سے خارج ہو جاتا، اسلام کا نام ضرور باقی رہ جاتا لیکن بالکل اسی طرح جس طرح عیسائی اور یہودی ہیں۔ حضرت سید الشہدا علیہ السلام نے یزید کی بیعت سے انکار کر کے اپنے آرام و سکون کو خاک میں ملا کر انتہائی مظالم سہہ کر اور اپنے کنبہ کو لٹوا کر

حقانیت اسلام کی اس سریلی اور دلکش آواز سے لوگوں کو شناسا کرادیا جو اس کے بغیر موجودہ فضا میں سنائی نہ دیتی۔

دوسرے لفظوں میں آپ ؑ کا مطلب یہ تھا کہ ایک مرتبہ دنیا کے سامنے اس حقیقت کو پوری شدت و قوت سے پیش کردیں "حکومت و شہنشاہیت" اور ہے اور" اسلامی تمدن و تہذیب اور اس کے اصول" اور ہیں. حضرت امام حسین علیہ السلام جس مقصد کو لے کر اٹھے وہ خصوصیت میں کوئی نیا نہ تھا وہ تو وہی تھا جس کا تمام انبیاء نے مظاہرہ کیا اور جس کے لئے تمام مصلحین ہمیشہ کوشش کرتے رہے مگر اس کو جس صورت سے آپ نے حاصل کیا وہ ایک ایسی ممتاز صورت ہے جو نہ اس سے پہلے نظر آئی اور نہ بعد کو۔ (ماخوذ از شہیدِ انسانیت) زیر نظر کتاب اسی روشنی میں لکھی گئی ہے. تمام شہدا کا نام بہ نام تذکرہ کیا گیا ہے اور کتب معتبرہ سے یہ بات بھی معلوم کی گئی ہے کہ سرہائے شہداء، کہاں مدفون ہیں.

یہ کتاب "دانش گاہِ اسلامی" کی جانب سے پیش کی جارہی ہے۔

دانش گاہ اسلامی کا قیام کچھ ہی عرصہ قبل عمل میں آیا ہے اور اس ادارے کے اغراض و مقاصد واضح طور پر یہ ہیں کہ علومِ اسلامی کی مثبت طور سے اشاعت کی جائے تاکہ افرادِ ملت حقیقت حال سے آشنا ہو کر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم، ان کے اہل بیت اور سلف صالحین کی پیروی کرتے ہوئے ان بے شمار آہنی دیواروں کو توڑ کر ایک متحد اور فعال جماعت بن سکیں اور اسلام جس کے ماننے والے اقصائے عالم میں ستر کروڑ کی عظیم آبادی اور آمدنی کے حیرت انگیز وسائل نیز ایک مثالی فلسفہ حیات کے مالک ہیں

وہ ازسرِ نو دنیا کی قائدانہ قوت بن کر نمود کرے۔

اس سلسلہ میں احسان فراموشی کے مترادف ہوگا اگر یہ اعتراف نہ کیا جائے کہ سرکار علامہ سید ابن حسن صاحب نجفی مدظلہٗ نے اس خطرہ کو بروقت اور بڑی شدت سے محسوس کیا کہ اُمتِ محمدیہؐ کی دینی اور دنیاوی تباہی کا بہت بڑا سبب سوءِ تفاہم اور فرقہ واریت ہے اور دشمنانِ اسلام ہماری اسی کمزوری سے فائدہ اٹھاکر ہماری بربادی پر تلے ہوتے ہیں اور ہماری ہی زبان سے یہ کہلوا کر کہ "اسلام موجودہ زمانے کے جدید تقاضوں کو پورا نہیں کرسکتا" ہماری نئی نسل کو گمراہ کر رہے ہیں۔ علامہ نجفی صاحب نہ صرف دانش گاہِ اسلامی کے رئیس کی حیثیت سے اس کے ساتھ تعاون فرما رہے ہیں بلکہ اپنی تقاریر سے اتحاد و ترقی کے منفی عوامل کو دور کرنے کی کوشش بھی فرماتے رہتے ہیں۔ خداوند عالم ان کی سعی مشکور فرمائے اور ملت مسلمہ کے تمام فرقے باہمی طور پر شیر و شکر ہوکر زندگی بسر کریں۔ آمین

اس حقیقت سے تو کوئی مسلمان خواہ اس کا کسی مکتبۂ فکر سے تعلق ہو، انکار نہیں کرسکتا کہ روزِ جزا فیصلہ کی بنیاد ہر شخص کا اپنا نامۂ اعمال ہوگا۔ اور ہم میں سے ہر فرد کو تصحیح عمل کی ضرورت ہے۔ کیونکہ افراد ہی سے معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ اچھے لوگ ہوں گے تو ایک اچھا معاشرہ وجود میں آئے گا۔ اور سنبھلی ہوئی سماج ہی میں ایک متوازن قوم کا تشخص ہوتا ہے۔ خداوند کریم ہمیں "خیرِ دنیا اور خیرِ آخرت" کے حصول کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

آخر میں دانشگاہ اسلامی کے ریسرچ سیل کے ڈائریکٹر سید حسین مرتضیٰ صاحب کی کاوشوں کا تذکرہ بھی ضروری ہے،

جنہوں نے اس کتاب کی تکمیل میں میری مدد فرمائی اور اس پر نظرِ ثانی فرماکر آخری شکل دی۔

سیّد مجتبیٰ حسین شمس آبادی

دانشگاہِ اسلامی
کراچی

۱۱۲۔حسن لاج
مقبول آباد
کراچی۔۵
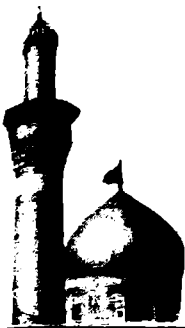
آغازِ سُخن

حضرت امام حسین علیہ السلام

گلدستۂ رسالت کے وہ تازہ پھول ہیں جس کی مہک شعورِ بشری اور ادراک انسانی کو مسلسل تازگی بخشتی چلی آرہی ہے۔ دستِ قدرت نے اس پھول کو مختلف رنگوں کا ایسا مثالی امتزاج عطا فرمایا ہے جس کو دیکھ کر نگاہ بصیرت میں نورِ عرفان کی تجلیاں

کوند جاتی ہیں، اور معرفتِ الٰہی کے جویا اپنے اس مقدس اور عظیم مقصد میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ گلستانِ امامت اور گلدستۂ رسالت میں اس گراں قدر پھول کا اضافہ ۳۔ شعبان معظم ۴ ہجری کو مدینہ منورہ میں ہوا، تو اس نومولود کو فوراً آنحضرتؐ کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ آپؐ نے اس فرزند کے منور چہرے پر نظر ڈالی اور اپنی انتہائی مسرت کا اظہار فرماتے ہوئے لپک کے اپنے بازوؤں میں لے کر فرطِ محبت سے بھینچ کر سینہ سے لگا لیا دونوں کانوں میں اذان و اقامت کہی اور اپنے علومِ نبوت کو اس معدنِ نبوت میں منتقل کرنے کے لیے اپنی زبان مبارک اس کے دہن میں رکھ دی جس سے شیریں دودھ کی نہروں کے ساتھ ساتھ علومِ نبوت اور اسرارِ امامت اس گوہرِ بے بہا میں منتقل ہو گئے۔ پھر آنحضرتؐ نے وحی الٰہی کے مطابق اپنے اس عزیز فرزند کا نام "حُسین" (علیہ السلام) رکھا۔

"حسینؑ" جو بہت جلد اسلام، عزم، وقار، جہاد، علم و عمل، عرفانِ آگہی خدا اعتمادی، خودداری، عزتِ نفس، حق و صداقت، ایمان، ایقان، جرأت قہاریت، شجاعت، شہامت، ابتکار، عبقریت اور انسانیت کے تمام اعلیٰ خصائص کے ساتھ خدا و رسول کے تمام ارفع صفات کے لیے اسمِ علم اور ان سب صفات و خصوصیات کے مجسمہ کا نام نامی قرار پایا۔

"حسین" جو صبر کے ہتھیاروں کو استعمال میں لا کر کائنات پر چھا گیا اور جس نے شہادت کو سپر بنا کر باطل کے ہر وار کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسی کی جانب پلٹ دیا....

امام حسین علیہ السلام کی ولادت پر مدینہ کے مسلمانوں میں جشن منایا گیا، کائنات کے ذرّہ ذرّہ نے مسرت کا اظہار کیا اور خداوندِ عالم نے ملائکہ کو آنحضرتؐ کی خدمت میں تہنیت ادا کرنے

کے لیے عبادت کے مصلوں سے فرشِ زمین کی طرف روانہ ہونے کا حکم دے دیا۔

آنحضرتؐ نے اُن کے برادرِ بزرگوار امام حسن علیہ السلام کی طرح انہیں بھی اپنا فرزند کہا اور ان کی تربیت کی بھی خصوصی نگرانی فرمائی۔ آنحضرتؐ کی عظیم صاحبزادی جناب فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا کا یہ لختِ جگر اور آنحضرتؐ کے چچازاد بھائی، ابی طالب مومن قریش کے فرزند اور آپؐ کے جاں نثار سپہ سالار حضرت علی علیہ السلام کے اس دلبند کو اپنے والدین اور جدِ امجد کی سرپرستی میں ایسا نورانی ماحول اور ایسی شاندار تربیت حاصل ہوئی جو حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت خاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک تمام انبیاء کی محنتوں کا ثمر اور تمناؤں کی آخری حد تھی۔

آنحضرتؐ نے شروع ہی میں یہ خبر دے دی تھی کہ ہمیں اپنے اس فرزند کو کربلا کے لیے تیار کرنا ہے۔ اس لیے امام حسین علیہ السلام کی نشوونما اور تربیت پر خصوصی توجہ رکھی جانے لگی۔ اور خود امام حسین علیہ السلام بھی ہر ہر قدم پر بزرگوں کے توقعات پر پورے اُترتے رہے۔

میں گذشتہ صفحات میں امام حسین علیہ السلام کا وہ فرمان نقل کر چکا ہوں جس میں آپؑ نے یہ فرمایا ہے کہ میرا خدا اور میرے آباؤاجداد نیز وہ مقتدر ہستیاں جن کے صفات و علوم کا مجھے وارث قرار دیا گیا ہے میری ذلت و رسوائی پر کبھی راضی نہیں ہو سکتیں۔ آپؑ کے اسی قول کی روشنی میں میں نے اس کتاب کا نام "میراث انبیاء علیہم السلام" رکھا ہے اور اس بنا پر میں ضروری سمجھتا ہوں کہ امام حسین علیہ السلام کی شخصیت اور واقعہ کربلاء کی روح کو سمجھنے کے لیے اپنی گفتگو میں امام حسین علیہ السلام

کے بزرگوں کے روایات اور ان کے خاندانی ماحول اور زندگی کے اہم تجربات کو بھی زیرِ بحث لاؤں تاکہ ایک طرف تو امام حسین علیہ السلام کی شخصیت نکھر کر سامنے آجائے دوسری طرف واقعۂ کربلا کے صحیح خد و خال اور اغراض و مقاصد بھی خود بخود واضح ہو جائیں۔ اس لیے میں نے اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ بزرگوں کے روایات ـــــ ولادت سے قبل امام علیہ السلام کے خاندان کا تعارف

۲۔ ولادت سے امامت تک ـــــ یعنی امام حسین علیہ السلام کی ولادت سے امامت تک کی زندگی کا جائزہ

۳۔ کربلا ـــــــــــ آغاز امامت سے شہادت کے حالات

چونکہ امام حسین علیہ السلام کے مقصد کو آگے بڑھانے کے لیے ان کے تعلیمات کی نشر و اشاعت ایک لازمی امر ہے اس لیے اس کتاب کا چوتھا حصّہ "کردار کی روشنی" کے عنوان سے جناب سیّد حسین مرتضیٰ صاحب کی کاوشوں کے نتیجہ کے طور پر نذر ہے۔
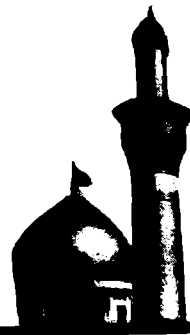
پہلا حصّہ

بزرگوں کے روایات
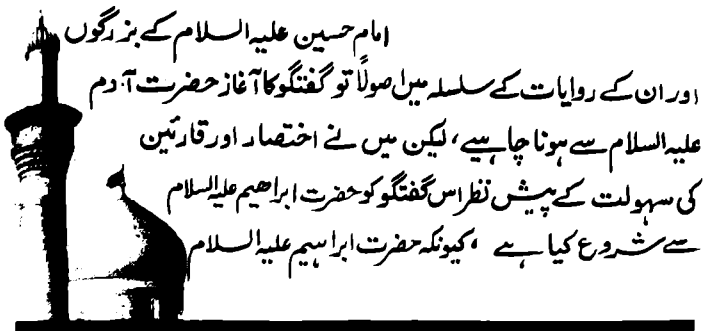
امام حسین علیہ السلام کے بزرگوں
اوران کے روایات کے سلسلہ میں اصولاً تو گفتگو کا آغاز حضرت آدم
علیہ السلام سے ہونا چاہیے، لیکن میں نے اختصار اور قارئین
کی سہولت کے پیش نظر اس گفتگو کو حضرت ابراھیم علیہ السلام
سے شروع کیا ہے ، کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام

وہ اولوالعزم نبی ہیں جن کو حضورِ ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے جد کے لقب سے یاد فرمایا ہے اور جن کو قرآنِ حکیم میں اُمّتِ مسلمہ کا باپ کہہ کر متعارف کرایا گیا ہے:

مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ (سورۂ حج ع۲۲، آیت ع۷۸)

پھر اُمتِ مسلمہ کا نام بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کا رکھا ہوا ہے چنانچہ ارشادِ رب العزت ہے:

هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ (سورۂ حج ع۲۲، آیت ع۷۸)

پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی میراث حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے ذریعہ قریش اور بنی ہاشم میں پہنچی اور جناب قُصَیّ بن کلاب، عبدِمناف، ہاشم، عبدالمطلب، عبداللہ اور ابوطالب علیہم السلام کے ذریعہ علی بن ابی طالب علیہ السلام اور جناب سیدہ علیہا السلام سے ہوتی ہوئی امام حسین علیہ السلام تک پہنچی اور کربلا میں محرم ۶۱ھ کی دس تاریخ کو "ذبحِ عظیم" کی تفسیر بن کر رونما ہوئی ؎

اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر
معنیِ ذبحِ عظیم آمد پسر (علامہ اقبالؒ)

حضرت نوحؑ کے بعد حضرت ابراہیمؑ پہلے نبی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی عالمگیر دعوت پھیلانے کے لیے مقرر کیا تھا، انہوں نے پہلے خود عراق سے مصر تک اور شام و فلسطین سے ریگستانِ عرب کے مختلف گوشوں تک برسوں گشت لگا کر اللہ کی اطاعت و فرماں برداری کی طرف لوگوں کو دعوت دی۔ پھر اپنے مشن کی اشاعت کے لیے مختلف علاقوں میں خلفاء مقرر کیے۔ شرقِ اردن میں اپنے بھتیجے حضرت لوطؑ کو، شام و فلسطین میں اپنے بیٹے

حضرت اسحاقؑ کو، اور اندرونِ عرب میں اپنے بڑے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کو مامور کیا پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے مکے میں وہ گھر تعمیر کیا جس کا نام کعبہ ہے اور اللہ ہی کے حکم سے وہ اس مشن کا مرکز قرار پایا۔

حضرت ابراہیمؑ کا اصل کام دنیا کو اللہ کی اطاعت کی طرف بلانا اور اللہ کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت کے مطابق انسانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی کا نظام درست کرنا تھا۔ وہ خود اللہ کے مطیع تھے، اس کے دیئے ہوئے علم کی پیروی کرتے تھے۔ دنیا میں اس علم کو پھیلاتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ سب انسان مالک کائنات کے مطیع ہو کر رہیں۔ یہی خدمت تھی جس کے لیے وہ دنیا میں امام و پیشوا بنائے گئے تھے۔ ان کے بعد یہ امامت کا منصب ان کی نسل کی اس شاخ کو ملا جو حضرت اسحٰقؑ اور حضرت یعقوبؑ سے چلی اور بنی اسرائیل کہلائی۔ اسی میں انبیاءؑ پیدا ہوتے رہے، اسی کو راہِ راست کا علم دیا گیا۔ اسی کے سپرد یہ خدمت کی گئی کہ اس راہ راست کی طرف اقوامِ عالم کی رہنمائی کرے، اور یہی وہ ملت تھی جسے اللہ تعالیٰ بار بار اس نسل کے لوگوں کو یاد دلا رہا ہے۔

حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں بیت المقدس دعوت الی اللہ کا مرکز قرار پایا اور جب تک یہ شاخ امامت کے منصب پر قائم رہی، بیت المقدس ہی دعوت الی اللہ کا مرکز اور خدا پرستوں کا قبلہ رہا۔ آگے چل کر جب اس شاخ نے شعارِ ابراہیمؑ کو ترک کر دیا اور غیر اللہ کی پرستش میں مبتلا ہو کر ظلم و ستم کے خوگر بن گئی، خدا کے نبیوں کو حق گوئی کی پاداش میں قتل کرنے لگی تو پروردگار عالم نے ان کو امامت کے منصب سے معزول کر دیا۔ تبدیلئ امامت کا اعلان ہونے کے ساتھ ہی قدرتی طور پر تحویل کعبہ کا حکم ہونا بھی ضروری تھا

اب حضرت ابراہیمؑ کی دوسری شاخ، بنی اسمٰعیلؑ میں وہ رسول پیدا کیا جس کے لیے ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ نے دعا کی تھی۔

وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ۝ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَیُزَكِّیْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝

(قرآن حکیم، سورہ بقرہ، آیات، ۱۲۷-۱۲۹)

ان آیات مقدسہ کے معنی ملاحظہ ہوں "اور یاد کرو کہ ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ جب اس گھر کی دیواریں اٹھا رہے تھے، تو دعا کرتے جاتے تھے: "اے ہمارے رب، ہم سے یہ خدمت قبول فرما لے، تو سب کی سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ اے رب ہم دونوں کو اپنا مسلم (مطیع فرمان) بنا، ہماری نسل میں ایسی قوم پیدا کر، جو تیری مسلم ہو۔ ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا، اور ہماری کوتاہیوں سے درگذر فرما تو بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے اور اے رب، ان لوگوں میں خود انہیں کی قوم سے ایک ایسا رسول اٹھائیو، جو انہیں تیری آیات سنائے، ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیاں سنوار دے۔ تو بڑا مقتدر اور حکیم ہے"۔

زندگی سنوارنے میں خیالات، اخلاق، عادات، معاشرت، تمدن، سیاست غرض ہر چیز کا سنوارنا شامل ہے اور پیشوائے اُمت کی یہ اہم ترین ذمہ داری ہے کہ قومی زندگی جن چیزوں سے عبارت ہوتی ہے ان چیزوں کو سنوار لے ورنہ دنیا میں

اس کی آمد کا مقصد فوت ہو جائے گا۔

اس عنوان کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کہ ہمیں حضرت امام حسین علیہ السلام کے بزرگوں کے شاندار روایات کا تذکرہ کرنا مقصود ہے جن کے عظیم کارناموں نے امام حسین علیہ السلام کی شخصیت کو نکھارنے میں مرکزی کردار انجام دیا تھا۔ اسلافِ حسینؑ کا چونکہ خانۂ کعبہ سے براہِ راست تعلق ہے اس لیے مضمون کو مسلسل رکھنے کے لیے ہمیں خانہ کعبہ سے متصل رہنا ہے

طوفانِ نوحؑ کے بعد خانۂ کعبہ منہدم ہو گیا تھا۔ امتدادِ زمانہ نے اس کے نشانات تک مٹا دیئے تھے۔ حضرت ابراھیمؑ کے زمانہ میں صرف اس قدر علم تھا کہ کعبہ سرزمینِ مکّہ میں تھا لیکن کس مقام پر تھا یہ کسی کو علم نہ تھا۔ حضرت ابراھیمؑ نے اپنی زوجہ حاجرہ اور فرزندِ اکبر حضرت اسمٰعیلؑ کو مکہ کی بے آب وگیاہ زمین پر آباد کردیا تھا جن کی برکت سے چاہِ زمزم برآمد ہوا اور قبیلہ بنی جَرہم وہاں آباد ہو گیا۔ حضرت اسمٰعیلؑ نے ان ہی لوگوں میں پرورش پائی اور جوان ہو کر اسی قبیلہ کی ایک دوشیزہ سے شادی کرلی۔ حضرت ابراھیمؑ فلسطین سے اپنی بیوی اور بچے کو دیکھنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ بہرکیف جب حضرت اسمٰعیلؑ جوان ہوئے تو حضرت ابراہیمؑ کو بارگاہِ ایزدی سے پرانی بنیادوں پر خانہ کعبہ کی تعمیر کا حکم دیا گیا اور خدا نے حضرت ابراھیمؑ کے لیے محل بیت اللہ مُعیّن کر دیا۔ محل خانۂ کعبہ معلوم ہو جانے کے بعد دونوں باپ اور بیٹے بیت اللہ کی تعمیر میں مصروف ہو گئے اور حضرت آدمؑ کے زمانے کی پرانی بنیادوں پر اس کی تعمیر کرنے لگے۔ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۲۷ میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

اس مرکزِ توحید کی تعمیر کی تکمیل کے بعد حضرت ابراھیمؑ خانۂ خدا کی تولیت اپنے فرزند اسمٰعیلؑ کے سپرد کر کے شام

واپس چلے گئے اور ہر سال حج کرنے تشریف لاتے تھے۔ جب حضرت اسمٰعیلؑ کی وفات ہوئی تو بیت اللہ کی تولیت آپ کے فرزند نابت بن اسمٰعیلؑ سے متعلق رہی۔ ان کے بعد اس آستانہ قدس کا متولی مضاض بن عمرو جرہمی ہوا نابت بن اسمٰعیلؑ کی اولاد حجاز میں خوب پھلی پھولی لیکن اس کے باوجود تولیت خانہ کعبہ بنی جرہم سے متعلق رہی اور اولادِ نابت نے کبھی اس سلسلے میں بنی جرہم سے نزاع نہیں کی۔ اس کی دو وجوہات ہیں ایک تو یہ کہ بنی جرہم نے اس سلسلہ میں کسی بدعت کو جاری نہیں کیا۔ دوسرے وہ اولاد نابت کے ننھیالی اعزہ تھے۔ آنحضرتؐ کے پانچویں جد قصیّ ابن کلاب کے رئیس مکہ اور متولی کعبہ سے پانچ سو برس پہلے تک ریاست مکہ اور تولیت خانہ کعبہ بنو جرہم کے قبضے میں رہی۔ گو ان کے آخری زمانہ میں ظلم و ستم کا بازار گرم ہوا لیکن بیت اللہ میں کوئی بُت نصب نہیں ہوا، ان کے بعد ریاست مکہ اور کعبہ کی تولیت پر بنو خزاعہ نے قبضہ کر لیا۔ بیت اللہ کی تولیت بنی خُزاعہ میں وراثتاً یکے بعد دیگرے منتقل ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ ان کا آخری متولی حلیل بن حبشہ بن سول بن کعب بن عمرو خزاعی ہوا۔ بنی خزاعہ میں پہلا شخص جس نے کعبہ میں بُت نصب کیے وہ عمرو بن لحی خزاعی تھا۔ اس نے نہ صرف خانہ کعبہ بلکہ پورے عرب میں بت پرستی کو رواج دے دیا۔ بت پرستی کے علاوہ ان سے دیگر مشرکانہ حرکات بھی سرزد ہوئیں۔

بنو خزاعہ کے آخری متولی کعبہ حلیل بن حبشہ کے زمانے میں آنحضرتؐ کے پانچویں جد قُصَیّ بن کلاب پیدا ہوئے انہوں نے بنو خزاعہ کے اس آخری متولی کی بیٹی حُبیّٰ سے عقد کر لیا اس کے یہ ایک ہی اولاد تھی اس لیے اس نے مکہ کی ریاست اور کعبہ کی تولیت کی وصیت اپنے داماد قُصَیّ کے حق میں کی۔ اس بات پر بنو خزاعہ

قُصَیّ سے آمادہ پیکار ہوگئے۔ قُصَیّ نے قریش اور بنو قضاعہ کی مدد سے بنو خزاعہ کا مقابلہ کیا اور ان کو شکست دیکر ریاست مکّہ اور تولیت کعبہ پر قبضہ کرلیا اسطرح صدیوں کے بعد حق بہ حقدار رسید۔ قُصَیّ نے برسراقتدار آتے ہی بت پرستی کے سلسلہ میں اپنا نظریہ ان الفاظ میں ظاہر کیا:

قُصَیّ ابن کلاب "کیا میں ایک پروردگار کی عبادت کروں یا ایک ہزار کی جیسا کہ انہیں بانٹ رکھا ہے۔ میں نے لات اور عزیٰ سب کو چھوڑ رکھا ہے اور صاحب بصیرت شخص ایسا ہی کرتا ہے۔ پس میں نہ عزیٰ کی پوجا کرتا ہوں اور نہ اسکی دونوں بیٹیوں کی اور نہ میں بنی عم کے دونوں بتوں کی زیارت کرتا ہوں"۔ تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ قُصَیّ کے جانشینوں کا بھی یہی مسلک رہا۔ قُصَیّ ابن کلاب کے زمانے سے لیکر آنحضرتؐ کے عہد تک کوئی بت خانۂ کعبہ میں نصب نہیں کیا گیا۔ (تفسیر ابن کثیر جلد اول ص ۱۸۳)

قُصَیّ ہی وہ شخص ہیں جنہوں نے مکّہ اور خانہ کعبہ کی اہمیت کے پیش نظر باقاعدہ آبادی قائم کی اور خانہ کعبہ کے گرد اپنے خاندان کو آباد کیا۔ قُصَیّ پہلے شخص ہیں جنہوں نے بیت اللہ کا احترام ابراھیمیؑ نظریہ کے مطابق کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں تمدنی زندگی کا آغاز انہیں سے ہوا۔ علامہ دیاربکری نے لکھا ہے کہ ان کے احکام قابل اتباع دین بن گئے اور لوگ اس کے خلاف عمل نہیں کرتے تھے۔

طبری اور تاریخ خمیس میں ہے کہ ان کی ایک اہلیہ عاتکہ تھیں، ان سے فرزند پیدا ہوئے ان میں سے بڑے فرزند عبدالدار باپ کی وصیت کے مطابق ان کے جانشین ہوئے لیکن عبدمناف نے اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق قیادت سنبھال لی قُصَیّ نے سنہ ۴۸۰ء میں انتقال کیا۔

عبدمناف بن قُصَیّ بن کلاب عبدمناف نے باپ سے بڑھ کر اعزاز حاصل کیا اور ان کے معتقدین نے قومی خدمات

کے سلے میں انہیں قمرُالبطحاء کا خطاب دیا۔ عبدمناف کا نام، لقب و کنیت دیکھئے تو ان کی تاریخی عظمت کا اندازہ ہوگا۔ مغیرہ نام، ابوعبدالشمس کنیت، عبدمناف عرفیت اور قمر لقب تھا۔ عرب کے کسی مشہور شاعر نے کہا تھا "قریش یوں تو پہلے ہی سردار تھے لیکن ان کی روح کا جوہر خالص عبدمناف ہی ہیں ہے"

خداوندعالم کا کمال اہتمام اور نبی کریمؐ کی جلالت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا کہ ان کے مقدس اجداد میں رہنمائی و اصلاح و عظمت و سرداری کے وہ جوہر موجود تھے کہ سارا ماحول اس سے متاثر تھا۔ ابن خلدون و مصنف سبایک الذہب کے بقول "عبدمناف صاحبِ شان و شوکت اور ستون اعزاز و اکرام تھے" کہتے ہیں کہ آپ نے پتھر پر عبارت کندہ کرائی تھی:

"میں مغیرہ ابن قصی تقویٰ الٰہی اور صلہ رحم کا حکم دیتا ہوں"۔

(مقصد الطالب ص ۱۸ ؛ تاریخ خمیس ج ۱ ص ۱۷۶)

عبدمناف نے عاتکہ بن مرۃ بن سلیم کی صاحبزادی سے عقد کیا اور ان سے چار فرزند پیدا ہوئے۔

عمرو[1] (ہاشم) عبدالشمس۔[2] مُطّلِب[3] اور نوفل[4]

عبدمناف تجارت پیشہ انسان تھے چنانچہ ایک سفر شام میں غزہ پہنچ کے علیل ہوئے اور انتقال فرما گئے۔

ہاشم بن عبدمناف بن قُصَیّ بن کلاب: عمرو اور ہاشم نام قمر اور زاد الرکب لقب پایا۔ اولاد اسمٰعیلؑ اور عدنانیوں میں قصی جیسے تدبر کا مالک ہاشم سے بہتر اور ہاشم سے پہلے کوئی نہیں تھا۔ ہاشم نے اپنے خاندان اور اسلاف کی شہرت کو آفتاب نصف النہار تک پہنچا دیا۔ لوگ ہاشم کا نام سُن کر یوں گردنیں جھکا لیتے تھے۔ جیسے انسانیت اور بزرگی کو خراج تحسین پیش کر رہے ہیں۔

ہاشم پیدائشی سیر چشم، سخی، بہادر، مہمان نواز، ہمدردِ عوام، منتظم اور بلند ہمت تھے۔ عبدالدار اور عبد مناف کے اختلافات نے انہیں بچپنے ہی سے تجربہ کار بنا دیا تھا۔ چونکہ اوائل عمر ہی سے باپ کے ساتھ رہے اور حاجیوں کا استقبال اور ان کی مہمانداری ان کے فرائض میں داخل تھی اسلیے ان کے اعلیٰ فطری جوہر کھلے اور عوام کی محبت کے جذبات اُبھرے۔

ہاشم عرب کے شعلہ بار خطیب تھے۔ جن کی شہرت عام تھی۔ حج کے موقعوں پر ان کی تقریروں میں جوش، ادب اور روانی و اثر کا یہ عالم ہوتا تھا کہ اپنے بیگانے دوست و دشمن سب ان کی تجویزوں کی حمایت کرتے تھے۔

ہاشم پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے تاریخ عرب میں قابل مثال ابواب کا اضافہ کرکے حیاتِ جاوداں حاصل کی۔ مہمان نوازی عرب کا خاصہ ہے لیکن تنگ دستی اور قحط کے زمانے میں ہر ایک معذور سمجھا جاتا ہے۔ ہاشم کی ہمت پر آفرین کہ سنگین قحط کے زمانے میں حجاز سے شام کا سفر کیا اور وہاں سے آٹا اور روٹیاں خرید کر وطن لائے، مکہ کی آبادی قحط سے جاں بلب تھی۔

ہاشم کی آمد، دعوت عام کی خوشخبری نے سوکھے دہانوں پر پانی کا کام کیا۔ دم توڑتے بھوکے زندہ ہوگئے۔ قمر البطحا، کے فرزند جلیل نے اونٹ ذبح کیے اور شام سے لائے ہوئے غلہ کی روٹیاں پکوا کر دعوت کا انتظام کیا۔ گوشت میں روٹی چور کر ڈالی اور سیر شکمی سے ایک ایک کو سیر و سیراب کیا جب تک درآمد کیا ہوا اناج رہا کھانا کھلانے اور غریبوں کا پیٹ بھرنے میں کوتاہی نہ کی۔

ہاشم نے خاندانی اور وطنی اعزاز حاصل کرتے کے بعد بیرونی ریاستوں اور حکمرانوں سے سیاسی تعلقات قائم کیے وہ روم و غسّان کے حکمرانوں سے ملے۔ شیوخ قبائل و سرداران ریاست سے معاہدے کیے، یہود و نصاریٰ کے زعما ان سے ملنے آتے تھے۔ اکابر قوم و ملت ان

سے رشتے قائم کرنا چاہتے تھے۔ شام، فلسطین، یمن و حجاز کے تمام قبائل و شیوخ ان کی عزت و احترام کرتے تھے۔ ہاشم نے اُن سے تجارتی مال کی درآمد و برآمد اور سرکاری ٹیکس کے بارے میں معاملات طے کیے۔

تفسیر درمنثور سیوطی جلد ہفتم صفحہ ۲۹۶ پر جناب ہاشم کی وہ تقریر ہے جو اُنہوں نے قبائلی نمائندوں کے سامنے کی تھی۔ اس کا ترجمہ کچھ اسطرح ہے؛

" اکثریت میں قوت کا راز ہے۔ آپ لوگ عرب کی اکثریت ہیں، دولت مند اور معزز ہیں لیکن یہ احتضار ایسی بُری بلا ہے کہ آپ میں سے اکثر خاندان تباہ ہو گئے ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو اس سلسلہ میں آپ صاحبان کی خدمت میں ایک تجویز پیش کروں۔ لوگوں نے کہا سبحان اللہ۔ ہاشم نے کہا میری رائے یہ ہے کہ تمہارے غربا، امراء کے ذمہ کر دیئے جائیں یعنی سرمایہ دار اپنے ذمہ اپنی حیثیت کے مطابق اور اپنے گھر والوں کی تعداد کے مطابق ایک غریب خاندان کو سمیٹ لے اور اس کی خبر گیری کرے۔ گرمیوں میں سب لوگ شام چلا کریں، جاڑوں میں یمن۔ پھر ان تجارتی سفروں سے جو فائدہ ہو اس سے غربا، کو حصہ دیا کریں۔ اسطرح احتضار کا سلسلہ ختم ہو سکتا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ بڑی اچھی تجویز ہے ہم مانتے ہیں۔

امراء و حکام سے ہاشم کے دوستانہ تعلقات کیوجہ سے تجارتی قوانین اور ٹیکس میں تخفیف ہو گئی لہٰذا ان مراعات کیوجہ سے حاجیوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا، لوگ کثیر تعداد میں خانۂ کعبہ کی زیارت کو آنے لگے۔ ہاشم نے پانی کی قلت دیکھ کر ایک کنواں کوہ خندم کے قریب کھدوا کر وقف کر دیا۔ ہاشم کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ قریش نے اپنی بالادستی کے باوجود ہاشم کو حقِ حکومت دیا اور وہ پہلے باقاعدہ جج قرار پائے۔ ہاشم ابھی عنفوانِ شباب ہی کی منزلوں میں تھے اور ان کی کارآمد عوامی زندگی کا قافلہ

مشکل سے پچیسویں منزل سے آگے بڑھا تھا کہ ایک موسمی سفر میں مقام غزہ میں انہوں نے علیل ہو کر داعی اجل کو لبیک کہا۔

عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف بن قُصَیؒ بن کلاب

جناب ہاشم نے یثرب میں بنی نجار کی لڑکی بی بی سلمیٰ سے عقد کیا۔ انہیں کے بطن سے جناب شیبۃ الحمد کی ولادت ہوئی لیکن اس وقت جناب ہاشم انتقال فرما چکے تھے۔ بی بی سلمیٰ اپنے قبیلے کی معزز ترین خاتون تھی۔ اور حُسن و جمال میں یگانۂ روزگار تھیں۔ ابن ہشام نے لکھا ہے کہ ہاشم بن عبدمناف کسی موقعہ پر مدینہ تشریف لے گئے جہاں سلمیٰ بنت عمر نجار سے عقد کیا اور شیبہ نامی فرزند کی ولادت ہوئی۔ بظاہر بی بی سلمیٰ نے مکّہ جانا گوارہ نہ کیا اور ہاشم کی وفات کے بعد بچے کی ولادت کا حال مکّہ والوں کو معلوم نہ ہو سکا۔ شیبہ کی ولادت ہوئی تو سر کے سفید بال، چہرہ نورانی، اور خدوخال دیکھ کر ہر شخص کہتا تھا ؎

بالائے سرش زہوش مندی
می تافت ستارۂ بلندی

باپ انتقال کر گئے تو ماں نے پرورش شروع کی۔ بچہ نے روزافزوں غیر معمولی صلاحیت کا ثبوت دیا۔ شدہ شدہ مطلب برادر ہاشم کو بھی اس بچے کی مدینہ میں ولادت کا علم ہوا۔ مطلب اس خبر سے بہت مسرور ہوئے کہ مرحوم بھائی کی ایک اور یادگار ملی۔

ابن ہشام کا بیان ہے کہ مُطّلب مدینہ اس نیّت سے آئے کہ برادر زادے کو گھر لے جائیں مگر ماں راضی نہ ہوئیں آخر ماں بیٹے کو راضی کیا اور بھاوج سے کہا:

"میرا برادر زادہ اب سمجھدار ہو گیا ہے۔ یہاں بے وطن اور بے خاندان ہے۔ ہم ایک معزز گھرانے کے سردار ہیں۔ قوم کے بہت سے معاملات ہم سے متعلق ہیں۔ اس لیے اس بچے

کا اپنے خاندان اور اپنے قبیلے میں رہنا بہتر ہوگا۔"

(سیرۃ ابن ہشام ص ۱۴۵)

غرض چچا بھتیجے کو لے کر وطن آئے تو لوگوں نے شور مچایا کہ مُطّلب ایک غلام خرید لائے۔ مُطّلب نے سمجھایا کہ یہ میرا لختِ جگر اور میرے بھائی کا فرزند ہے، مگر عبدالمطّلب نام کچھ ایسا مشہور ہوا کہ قریش کے مرد و زن ہاشم کے اس دُرِ یتیم کو اسی نام سے پکارنے لگے۔ مُطّلب ایک سفرِ یمن میں وفات پا گئے۔ ہاشم کا یہ نونہال اب اپنے عظیم اسلاف کا ہر اعتبار سے وارث تھا۔ مکّہ کی آبادیوں میں شیبۃ الحمد کے اوصافِ عالیہ منظرِ عام پر آنے لگے اور ان کے اعزاز میں روز افزوں ترقی ہونے لگی۔

ابن ہشام کے بقول "پھر عبدالمطلب بن ہاشم، سقایت، رفادت کے نگران مقرر ہوئے۔ انہوں نے اپنے چچا کے بعد عوام کی ایسے انداز میں رہنمائی کی جیسا کہ ان کے بزرگ کرتے تھے اور اکثر امور میں تو انہوں نے وہ اعزاز حاصل کیا جو اُن کے اجداد کو بھی حاصل نہ ہوا تھا۔ وہ قوم میں معزز و محترم بھی تھے اور محبوب و عزیز بھی۔

مکّہ کی ریاست اور قریش کا سردار بن کر حاجیوں کا خیر مقدم اور خانۂ کعبہ کی حفاظت نے انہیں حضرت ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کا جانشین بنایا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی مہمان نواز اور خانہ کعبہ کی آبادی کے طلبگار تھے۔ (ملاحظہ فرمائیے سورۂ بقرآیات ۱۲۶-۱۲۹)

انہوں نے کعبہ کی آبادی اور انسانیت کی خدمت کے لیے اپنی اولاد یہاں بسائی تھی۔ وہ ملکوں کی بجائے دلوں پر حکمرانی چاہتے تھے۔

جناب عبدالمطلب بھی اپنے اس جدِ اعلیٰ کی طرح مشرکانہ رسوم سے بیزار تھے، انہوں نے اپنے بزرگوں کی طرح بت پرستی کو عیب سمجھا، وہ اس فکر میں تھے کہ دینِ حنیف زندہ و عام ہو جائے۔ انہیں آبادی خانہ کعبہ کا شوق تھا۔ چنانچہ کعبہ کا ایک تاریخی جزو چاہ زمزم ایک مدّت سے ناپید ہو گیا تھا۔ بنی جرہم نے جہاں اور چیزوں کو نقصان

پہنچایا تھا۔ چاہ زمزم کو بھی پاٹ دیا تھا۔ عبدالمطلب کے دل میں بار بار خیال آیا کہ اس کو معلوم کیا جائے۔ بالآخر بشارت ہوئی اور آپ نے چاہِ زمزم کا کھوج لگالیا جہاں آج چاہِ زمزم ہے وہیں اسلاف اور نائلہ نامی دو بت نصب تھے۔ اس کے علاوہ خانہ کعبہ کا تمام دفینہ یعنی سونے کے ہرن اور تلواریں جو بنی جرہم دفن کر گئے تھے حضرت عبدالمطلب کو مل گئے۔

عبدالمطلب اپنی مقبولیت کی وجہ سے قریش کی آنکھوں میں کھٹکنے لگے اور ان کے خلاف حریفانہ سازشیں تیز تر ہوگئیں۔ قریش نے انہیں ستایا، ان کا منصوبہ تھا کہ سقایت اور رفادت کے علاوہ ہاشم کا ترکہ اور عبدالمطلب کی زمین بھی چھین لیں چنانچہ خانۂ کعبہ کے قریب کی ملکیتی زمینیں دبالیں۔ حضرت عبدالمطلب نے اپنے عزیزوں اور ننھیالی رشتہ داروں کو جمع کر کے دشمنوں کے منصوبے کو خاک میں ملا دیا اور ان سے ایک عہدنامہ لکھوایا جس کو "معاہدۂ قریش" کہتے ہیں اور اپنی زمینوں پر قبضہ حاصل کرلیا۔ (طبری ج ۲ ص ۱۷۷)

ابرہہ کا حملہ خانہ کعبہ پر ان ہی کے زمانے میں ہوا۔ اس موقع پر ابرہہ کی شکست ان کی دعا، ان کی عظمت اور تقویٰ کی سند ہے۔ سرکار ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے جد بزرگوار جناب عبدالمطلب خانوادۂ ابراہیمؑ کے دُرِ شہوار تھے جن پر آنحضرتؐ فخر کرتے تھے۔ جناب عبدالمطلب ہمیشہ بت پرستی، زنا، خون ریزی، جنگ، دشمنی اور ظلم سے بیزار تھے اور انہوں نے اس سلسلہ میں مفید اصلاحات کیں اور حکم دیدیا کہ کوئی شخص خانہ کعبہ میں برہنہ طواف نہ کرے۔
(تاریخ آئمہ ص ۸۸ سیرتِ طیبہ ج ۱ ص ۴)

وہ منصف و عادل جج، نیک دل اور رحیم سردار اور بڑے مہمان نواز تھے۔ یوں تو آپکے دس فرزند تھے لیکن مضمون کا حاصل آپکے دو جلیل القدر فرزند ہیں

حضرت عبداللہ ۔ حضرت ابوطالب

حضرت عبداللہ حضرت عبداللہ آپ کے سب سے چھوٹے فرزند تھے اور باپ کے نہایت چہیتے تھے. جناب عبدالمطلب نے منت مانی تھی کہ اگر خدا نے اُن کو دس فرزند عطا فرمائے تو وہ ایک فرزند کی قربانی دیں گے. چنانچہ جب حضرت عبداللہ پیدا ہو گئے تو عبدالمطلب نے ان کی قربانی دینا چاہی. اس قربانی کا واقعہ کتب تاریخ میں مذکور ہے اور مشہور ہے کہ عبدالمطلب اس قربانی پر تیار تھے مگر ان کے ننھیال والوں کے اصرار پر قرعہ ڈالا گیا اور سو اونٹوں کی قربانی کے بدلے میں عبداللہ کی جان بچی۔ {ملاحظہ فرمائیے، سیرت ابن ہشام، تاریخ طبری وطبقات ابن سعد}

چنانچہ حضرت اسمٰعیلؑ اور جناب عبداللہ کی طے شدہ قربانیوں کی بنا پر آنحضرتؐ کو "ابن الذبیحین" کے لقب سے یاد کیا گیا ہے. جناب عبداللہ کا عقد مکہ کی مشہور خاتون جناب آمنہ بنت وہب سے ہوا. جناب عبداللہ نے زیادہ عمر نہ پائی اور عالم شباب میں ہی سفر آخرت کو روانہ ہو گئے، اُن کا انتقال مدینہ میں ہوا اور مدینہ کے قریب مقامِ ابوا میں مدفون ہیں.

حضرت ابو طالب چونکہ عبداللہ کا انتقال باپ کے سامنے ہو گیا تھا اس لیے عبدالمطلب کے تمام امتیازات و اختیارات ابو طالب کو حاصل ہو گئے "شیخ البطحا" اور سید القریش کے خطابات سے مشہور ہوئے اور ان امانتوں کے ساتھ ساتھ جو ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کی متروکہ تھیں ایک سب سے بڑی امانت جو ان کی حفاظت میں آئی وہ عبداللہ کے یتیم فرزند حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس تھی. ابتداءً آپ تنہائی میں عبادتِ الٰہی میں مصروف رہتے تھے لیکن دعوت ذوالعشیرہ کے بعد آنحضرتؐ علانیہ بت پرستی کی مذمت کرنے لگے اس وجہ سے قریش ایذارسانی پر آمادہ ہو گئے مگر آپ کے چچا حضرت ابو طالب کی شخصیت آپ کے سامنے سینہ سپر تھی جس کی وجہ سے اکابرین قریش

حضورؐ کا بال بیکا نہیں کر پاتے تھے۔ آخر کار اکابر قریش کا ایک وفد ابو طالب کے پاس آیا اور اس بات کا مطالبہ کیا کہ یا تو تم محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ان باتوں سے روک دو یا اسے ہمارے سپرد کر دو اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو ہمارے تمہارے درمیان جنگ ہوگی۔ جناب ابو طالبؑ نے مناسب سمجھا کہ اب حضورؐ سے اس کا تذکرہ کر دیں۔ حضرتؐ نے پورا واقعہ سنا تو فرمایا "خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے میں چاند لا کر دیدیں تب بھی میں اپنے فرض سے باز نہ آؤں گا۔ خدا اس کام کو پورا کرے گا۔ یا میں خود اس پر نثار ہو جاؤں گا اور یہ کہتے کہتے اُن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ دیکھنا تھا کہ جناب ابو طالب کا دل ہل گیا۔ انہوں نے کہا کہ اچھا تم اپنے فرض کو انجام دیتے رہو میں آخر دم تک تمہارا ساتھ دوں گا۔ چنانچہ جناب ابو طالب نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا اور جب تک زندہ رہے رسولؐ کے سامنے سینہ سپر رہے۔ یہ سعادت بھی انہیں کو نصیب ہونا تھی کہ اسلام کی راہ میں جتنی بھی گرانقدر قربانیاں دی گئیں وہ سب اولاد ابو طالبؑ نے پیش کیں۔ خواہ وہ قربانیاں جنگ موتہ میں دی گئی ہوں یا مسجد کوفہ میں یا میدانِ کربلا میں۔ یہ سب ان ہی کی اولاد تھی۔ جس نے اپنے مقدس خون سے شجر اسلام کو سیراب کیا اور آج بھی دنیا میں جتنے سادات گھرانے آباد ہیں اُن کا تعلق حقیقتاً حضرت ابو طالب ہی سے ہے۔

حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، دنیا کے بڑے بڑے مذاہب کے پیشواؤں میں جن کی تعلیم نے انسان کی وسیع آبادی کو جغرافیائی حدود سے عبور کر کے صدیوں تک متاثر کیے رکھا اور برابر متاثر کر رہی ہیں۔ حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی ایسے پیغمبر ہیں جو عالمی حیثیت رکھتے ہیں اور جن کی حیاتِ طیبہ کے واقعات کامل صحت کے ساتھ محفوظ کیے جا چکے ہیں۔ آنحضرتؐ

یکم عام الفیل مطابق ۵۷۰ء میں مکہ کے نام آور خاندان بنو ہاشم میں پیدا ہوئے جن کا سلسلہ براہِ راست حضرت اسمٰعیلؑ سے ملتا ہے۔ آنحضرت کا ارشاد ہے،
"میں ہمیشہ اصلاب طاہرین سے ارحام مطہرات میں منتقل ہوتا رہا"
آپؐ سن تمیز کو پہنچتے ہی خلق اللہ کی خدمت میں مصروف ہو گئے اور جس اعلیٰ کردار کا مظاہرہ کیا اس سے تمام مکہ متاثر تھا۔ آپؐ کی دیانت اور امانت اس درجہ مسلم ہو چکی تھی کہ آپؐ کو صادق الامین کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا اور ہر شخص آپؐ کا دل وجان سے احترام کرتا تھا۔ آپؐ چالیس سال کے سن میں مبعوث بہ رسالت ہوئے اور آپؐ کی رسالت کی پہلی تصدیق دنیا میں آپؐ کی محترم اور وفاشعار بیوی اُم المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ نے فرمائی۔ منصبِ رسالت پر فائز ہو کر آپؐ نے اپنی قوم کو دعوتِ اسلام دی اور شرک کی علانیہ مذمت کی۔ تاریخ اسلام میں اسلام کا یہ باقاعدہ اور کھلے بندوں اعلان تھا۔ آپؐ کی تبلیغ کا ابتداً کچھ زیادہ اثر نہ ہوا صرف مکہ کی چند معروف ہستیاں مشرف بہ اسلام ہوئیں۔ مگر عام طور سے آپؐ کی تبلیغ کے باعث مکہ کے رؤسا اور اکابرین میں کھلبلی پیدا ہو گئی۔ انہوں نے رسولِ خداؐ کو ان کے مذہب سے روکنے کے لیے ہر قسم کی کوششیں شروع کر دیں۔ بت پرستوں اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگیاں پیدا ہونا شروع ہو گئیں قریش مکہ نے آپؐ کو حد سے زیادہ ستایا اور سخت جسمانی اذیتیں دینا شروع کر دیں۔ جو لوگ دائرہ اسلام میں آجاتے تھے ان کو قریشِ مکہ انتہائی مصائب میں مبتلا کر دیتے تھے۔

آپؐ فرماتے تھے کہ ہر انسان کو صرف ایک ہی خدا کی عبادت کرنی چاہیئے جو ساری کائنات پر محیط اور ہر بات پر قادر ہے۔ لیکن مکہ کے اصنام پرست خدا کے ساتھ دوسرے دیوتاؤں کی پرستش بھی کرتے تھے اور انہیں قدرت اور تصرف کا مالک مانتے تھے۔

آنحضرتؐ کا پیغام اس وقت کے عقائد کی دنیا کے لیے ایک کھڑ کھڑا دینے والا انقلابی انتباہ تھا۔ آپؐ نے شرک والحاد کو جو اس وقت مشرکینِ عرب ہندوستان کے ہندوؤں، چین اور تاتار کے بدھوں اور یورپ کے عیسائیوں میں رائج تھا سختی سے چیلنج کیا۔ عیسائیوں اور یہودیوں کے اس عقیدے کو باطل قرار دیا کہ کوئی انسان یا فرشتہ اللہ کا بیٹا بن سکتا ہے۔ عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث کو بھی خدا کی وحدانیت کے منافی قرار دیا۔ اللہ کے رسولؐ نے زرتشتیوں اور آفتاب پرستوں کے عقائد کی درستی کی جانب بھی ہدایات فرمائیں اور فرمایا کہ کسی شئے یا کسی مظہر کو خدا سمجھنا درست نہیں ہے۔ غرضیکہ اسلام نہ صرف مکّہ اور عرب کے مختلف العقائد باشندوں کے لیے بلکہ دنیا کے جملہ مروج مذاہب کے ماننے والوں کے لیے ایک چونکا دینے والا پیغام تھا جس نے نوعِ انسانی کے افکار و عقائد کی دنیا میں انقلابِ عظیم پیدا کر دیا۔ اور اقوام و ملل کے منتشر اوراق کو ملّتِ واحدہ کے شیرازہ میں منسلک کر دیا۔ اس سلسلے میں جو جان لیوا واقعات ہوئے اور ذاتِ اقدسؐ پر جو قاتلانہ حملے ہوئے تاریخ نے ان سب کو محفوظ کیا ہے۔ منزلِ ابتلا سے گذر کر آپؐ نے صرف ۲۲ سال کی مدت میں ایک ایسی ریاست قائم کی جس کو صحیح معنوں میں خلافتِ الٰہیہ کہہ سکتے ہیں۔

آپ غور فرمائیں کہ معاشرتی، تمدنی اور مذہبی حیثیت سے عرب نہایت پستی اور زبوں حالی کا شکار تھے۔ وہ کسی ایک مذہب کے پابند نہ تھے۔ بلکہ وہ بہت سے مذاہب سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی اکثریت بت پرستی اور ستاروں کی پرستش میں ایمان رکھتی تھی۔ چنانچہ قبلۂ اول اور مرکزِ توحید کعبہ ہی میں سینکڑوں بت موجود تھے ان کے علاوہ یہودی، مجوسی اور عیسائی بھی موجود تھے جو اخلاقی و روحانی اعتبار سے نہایت پستی کے عالم میں تھے۔ اعمالِ قبیح، قبائلی عصبیت، رواداری کا کلی

مفقود ہونا، آپس کی خون آشام لڑائیاں اور اس نوع کی بے شمار خرابیاں ان میں واضح طور پر موجود تھیں۔ اس لیے وقت کا تقاضہ یہ تھا کہ کوئی ایسی منتخب ہستی منظرِ عام پر آجائے جو اپنے ناخنِ تدبیر سے انسانی مسائل کی اُن لاتعداد گتھیوں کو سُلجھائے اور دنیا کو اس مصیبت سے نجات دلائے جس میں وہ مبتلا تھی۔ چنانچہ ساتویں صدی عیسوی کے شروع ہونے پر جزیرہ نمائے عرب سے یہ آفتاب طلوع ہوا جس کی ابتدائی کرنیں اگرچہ حجاز کی سرزمین سے ظاہر ہوئی تھیں مگر رفتہ رفتہ اس کی روشنی مشرق و مغرب میں پھیل گئی اور دنیا کو روشن کر دیا۔ یہ بین الاقوامی مذہب اسلام تھا اور خدائے واحد کے پیغام کو پہنچانے کے لیے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم منتخب ہوئے جن کے ذریعہ کائنات کو ایک خدائے توانا کے سامنے سر جھکانے کی تعلیم دی گئی۔

آپؐ کا کام ان تمام عقائد و توہمات، روایات، مراسم کا عربوں کے دلوں سے محو کرنا تھا جو ان کی زندگی کا جزو لاینفک بن چکی تھیں۔ رسولؐ ان لوگوں کو بردباری، خاکساری، پاکبازی اور عفو کا سبق پڑھانا چاہتے تھے جن کے نزدیک معاف کر دینا کمزوری کی دلیل تھی، اور انتقام نہ لینا ذلت اور بزدلی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔

رسولؐ ان لوگوں کو مساوات و اخوت کی تعلیم دینا چاہتے تھے جو کہ اپنے خاندانی شرف پر فخر کیا کرتے تھے اور اپنے آباء و اجداد کے پورے شجرہ کو نہایت سختی کے ساتھ محفوظ رکھا کرتے تھے۔ ان چیزوں کے علاوہ اسلام کو عربوں کے الٹے بہت سے رجحانات سے برسرِ پیکار ہونا پڑا۔ مثلاً اس نے شراب کی ممانعت کر دی جس کے وہ عادی ہو چکے تھے۔ اور جس کا استعمال وہ سخاوت کی دلیل سمجھتے تھے۔ اس نے قمار بازی بند کرادی جو کہ عربوں کے نزدیک بذل و جود کی ایک قطعی علامت تھی اور بہت سی مخربِ اخلاق عادتوں کو ممنوع قرار دے دیا، عرب اس کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے کہ

سب سے زیادہ مقدس انسان کیونکر خدا کی بادگاہ میں سب سے زیادہ معزز ہو سکتا ہے یا اسلام قبول کرنے کے بعد کوئی پست انسان کیونکر عرب کے شریف ترین خاندانوں کے اشخاص سے برتری کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ (شہید انسانیت ص ۳۸)

خواجہ غلام السیدین مرحوم نے اسے بہت اچھے الفاظ میں لکھا ہے:

"اسلام ایک ایسی دنیا کے لیے جو پجاریوں کے قبضۂ اقتدار اور دولت مندوں کے زیر حکومت مصیبت کے دن کاٹ رہی تھی، پیغام آزادی لے آیا۔ آزادی پجاریوں کی قید سے جو عبد و معبود کے درمیان واسطہ بننے کی دعویدار تھی، آزادی گروہ امراء کی حکومت سے، جو نہ کسی خدا کے قانون کی پرواہ کرتے تھے اور نہ کسی انسانی قانون کی، بلکہ بغیر روک ٹوک کے حریصانہ طریقہ پر دوسروں کی محنت و مشقت کے پھلوں سے خود لطف اندوز ہو رہے تھے۔ آزادی غلاموں اور نیچ ذاتوں کے لیئے ان کے مالکوں کے مظالم اور خلافِ انسانیت بیرحمانہ سلوک سے۔ آزادی طبقۂ نسواں کے لیے اس عملی غلامی سے جس میں وہ انسانی حقوق کے ابتدائی منازل سے بھی محروم کردی گئیں تھیں۔ آزادی عام انسانوں کے لیے ان قیود سے، جن میں وہ ذات پات، رنگ و نسل اور تنگ نظری کی بندشوں میں مبتلا تھے۔ جس سے اُن کی حیاتِ اجتماعی فنا ہو رہی تھی اور وہ متخاصمین کے گروہ میں منقسم ہو رہے تھے۔ گروہ انسانی اسطرح اپنی خودساختہ ظالمانہ قیدوں میں مقید ہو رہا تھا۔"

پاکستان کے مشہور شاعر اور فیلسوف اقبالؒ نے اس منظر کی تصویر کشی ذیل کے اشعار میں یوں کی ہے:۔

بود انساں در جہاں انساں پرست	ناکس و نابود ماند زیر دست
سطوت کسریٰ و قیصر رہزنش	بندھا در دست و پا و گردنش
کاہن و سلطاں و پاپا و امیر	بر یک نخچیر صد نخچیر گیر
در غلامی فطرت او دوں شدہ	نغمہ ہا اندر نئے او خوں شد

اسلام نے اسے ایک پیغامِ آزادی سنایا، حریت و مساوات اور انسانی برادری کی تلقین کی اور تواریخ انسانی میں پہلے پہل شہری اور انسانی حقوق پورے طور پر عام انسانوں کو بالعموم عطا کیے جس سے وہ بہ سبب قومیت، رنگ یا جنس کے یا بہ سبب غربت و فلاکت کے محروم تھے۔ غرباء، مظلوم اور عام انسانوں کے عام طبقہ کو جو ابتک بڑی بیدردی سے پیسا جارہا تھا، نئی امیدوں اور اپنے کارآمد ہونے کا نیا احساس عطا کیا۔

تا امینے حق بہ حقداراں سپرد	بندگان را مسندِ خاقاں سپرد
اعتبار کاربنداں را فزود	خواجگی از کارفرمایاں ربود
قوت او ہر کہن پیکر شکست	نوع انساں را حصارِ تازہ بست
تازہ جان اندر تن آدم دمید	بندہ را باز از خداوندان خرید
حریت زاد از ضمیر پاک او	ایں مئے نوشیں چکید از تاک او
ناشکیب امتیازات آمدہ	در نہاد او مساوات آمدہ
عصرِ نو کیں صد چراغ آوردہ است	چشم در آغوش او وا کردہ است

یہ قیمتی خیالات تھے جن کو حضرت پیغمبر اسلام (ص) عربوں کی زندگی میں داخل کرنا چاہتے تھے اور عربوں کی وساطت سے تمام انسانوں میں پہنچانا چاہتے تھے۔ اس میں زمان و مکان کی قید نہ تھی۔

اس سلسلہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مخلص صحابہ بالخصوص حضرت علی ابن ابوطالب علیہ السلام کی سرفروشیاں ناقابلِ فراموش ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام ابن ابوطالب بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف بن قصی ابن کلاب

آپ (ع) ۳۰ عام الفیل کو حضرت فاطمہ بنت اسد کے بطن سے مکہ میں خانۂ کعبہ کے اندر پیدا ہوئے۔ یہ وہ شرف تھا جو اگلوں اور پچھلوں میں کسی کو حاصل نہ ہوسکا۔ بقول سید محمد احسن شہید شمس آبادی ؎

بنایا اس لیے کعبہ علی ؑ آئیں مکیں ہوکر

جناب فاطمہ بنت اسد کو جب آثارِ وضع حمل محسوس ہوئے تو آپ نے حرم محترم کے سامنے مناجات کی کہ "خدایا میں ایمان لائی ان تمام انبیاء پر جو تو نے اپنے برگزیدہ بندوں پر نازل فرمائے، خدایا ان کی برکت سے اس بچہ کی ولادت مجھ پر آسان کر دے۔" لوگوں نے دیکھا کہ دیوار کعبہ شق ہوئی اور فاطمہ بنت اسد اس میں داخل ہو گئیں اور وہ بچہ منصۂ شہود سے عالم وجود میں آیا جس کی حیات مبارکہ کا ایک ایک لمحہ خدمتِ اسلام میں صرف ہوا۔ چنانچہ مولانا علی نقی صاحب نے شہید انسانیت میں تحریر فرمایا ہے کہ:

"اسی طرح حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام نے تقریباً چوبیس برس کی عمر تک ایک دفعہ بھی تلوار نیام سے نہیں نکالی، حالانکہ ان کے مربی حضرت پیغمبر خداؐ کے جسم مبارک پر پتھروں کی بارش ہوتی تھی اور طرح طرح کی ایذائیں پہنچتی تھیں، مگر وہ اس نوعمری میں اسے محسوس کرتے تھے کہ فرمانِ ایزدی ابھی رسولؐ کے لیے جنگ کا نہیں آیا ہے، تو ان کے کسی پیروکار کا بھی کوئی اس طرح کا اقدام درست نہیں ہے۔ مگر جب حکمِ جہاد آگیا تو اب ہر میدان میں علیؑ ہی علیؑ نظر آتے ہیں۔ بدر و احد، خندق و خیبر اور ہر بڑی جنگ کے فاتح حضرت علی ابن طالب علیہ السلام ہی ہیں، لیکن حدیبیہ میں جب رسولؐ صلح پر مامور تھے، تو دوسروں کی زبانوں پر جوش میں نہ جانے کیا کیا آرہا تھا۔ مگر علیؑ کی زبان سے ایک دفعہ بھی نہیں نکلا کہ ہم صلح کیوں کریں بلکہ جس طرح جنگ میں علم ان کے ہاتھ میں ہوتا تھا، اسی طرح آج صلح نامہ کے لکھنے میں قلم ان کے ہاتھ میں تھا، اور پھر رسولؐ کے بعد تو پچیس برس خاموشی میں گذار دیئے اور کتنے ہی جوش دلانے والے حالات کے باوجود تلوار نیام سے نہیں نکالی۔ لیکن آخر عمر میں جب فریضۂ جہاد ذمہ ہوا تو جمل و صفین اور نہروان کے معرکوں

ہیں وہی تلوار چمکتی نظر آئی۔ جو پہلے بدر و اُحد میں چمک چکی تھی۔"

حضرت علی علیہ السلام کی سوانح عمری ایک لبنانی عیسائی جارج جرداق نے پانچ جلدوں میں لکھی ہے۔ کتاب کا نام ہے:

"THE GREAT LEADER ALi – THE VOiCE OF HUMAN JUSTiCE"

اس کتاب کے بعض اقتباسات ہدیۂ ناظرین ہیں:

"کسی عرب کے رہنے والے کو کسی غریب عرب پر فخر نہیں سوائے فضیلت پرہیزگاری اور نیکی کے انسان انسان کا بھائی ہے، احترامِ انسانیت کی یہ آواز بھی محمد مصطفےٰ (صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم) کی آواز تھی۔ پیغمبر (علیہ السلام) کی آواز کے بعد علی ابن ابی طالبؑ کی آواز تھی جس نے انسان کو مکارمِ اخلاق کیطرف دعوت دی۔ علی ابن ابی طالب (علیہ السلام) بزرگوں کے بزرگ، ایک ایسی منفرد ہستی تھے، جس کی نظیر نہ مشرق میں پیدا ہوئی نہ مغرب میں، نہ پہلے کبھی، نہ بعد میں۔ دنیا کی بزرگ ہستیوں کے درمیان جو شخص محبت و وفا میں سب سے آگے تھا وہ علی (علیہ السلام) تھا، وفا اُن کی سرشت، عادت اور جان و دل میں پیوست تھی۔ وہ لوگوں سے محبت رکھتے تھے لیکن اسے اپنی ذات سے پیوستہ نہیں کرتے تھے۔ اپنا عہد پورا کرتے تھے وفاداری ان کی ذات کی حقیقت تھی۔ انہوں نے اپنی فطری اور گہری ذہانت کی بدولت یہ دریافت کیا کہ آزادی سب سے مقدس چیز ہے۔ صحیح قوت فکر اور اچھی خصلت آزاد آدمیوں کا شیوہ ہے۔ سچی محبت اور خالص وفاداری بغیر آزادی کے ممکن نہیں ہے۔" مسلمان ملکوں کا سب سے بڑا المیہ یہ ہی ہے کہ وہ آزادی کی نعمت سے محروم ہیں اور یہ ہی وجہ ہے کہ وہ اپنا ملّی وجود کھو چکے ہیں۔

جارج جرداق لکھتا ہے:

"کیا تم کسی ایسے فرمانروا کو پہچانتے ہو، جس نے پیٹ بھر کر روٹی کھانے سے ہمیشہ محض اس لیے پرہیز کیا ہو کہ اس کی رعایا میں

سے اکثر لوگوں کو شکم سیری نصیب نہیں، نفیس کپڑا کبھی اس وجہ سے نہ پہنا ہو کہ بہت سے انسان موٹی کملی اوڑھ کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ پیسہ کبھی اس سبب سے جمع نہ کیا ہو کہ فقیر اور حاجت مند آدمی بہت ہیں۔ اور اپنی اولاد اور دوستوں کو وصیت کی ہو کہ میرے نقشِ قدم پر چلو۔ مسلمانوں کے بیت المال سے بغیر استحقاق کے مطالبہ کرنے پر اپنے بھائی کو ایک دینار دینے سے بھی انکار کر دیا ہو۔ اپنے عامل کو ان الفاظ میں تنبیہ کی ہو:

"خدا کی قسم اگر تم نے لوگوں کے مال میں کچھ بھی خیانت کی تو تم پر ایسی سخت کارروائی کروں گا جو دوسروں کے لیے عبرت کا موجب ہو۔"

پھر ایک رشوت خور افسر کو لکھا:

"خدا سے ڈرو اور لوگوں کا مال انہیں واپس کر دو، نہیں تو میں وہی کروں گا جو میرا فرض ہے۔"

تم نے کوئی ایسا بادشاہ سنا ہے جو اپنے ہاتھ سے چکی پیسے اور اپنی خوراک کے لیے ایسی خشک روٹی تیار کرے جو زانوں سے دبا کر توڑی جا سکے۔ جو اپنے ہاتھوں سے اپنی جوتیوں کو پیوند لگائے جس کی زبان سے نکلا ہوا یہ فقرہ ہو:

"آیا میں صرف اس بات پر قناعت کر لوں کہ لوگ مجھے امیرالمومنین کہتے ہیں اور میں زمانے کی سختیوں میں ان کا شریک نہ بنوں"

علامہ اقبال فرماتے ہیں:

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰ اورا بہا است
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است

اور سرورِ کائنات (ص) کا سب سے بڑا اعجاز تربیتِ
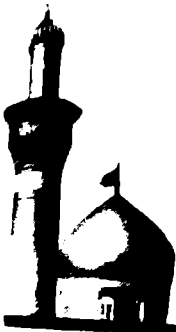
جناب امیر علیہ السلام ہے ۔ آنحضرتؐ نے اپنی حیاتِ مبارکہ میں کئی ہزار انسانوں کا تزکیہ نفس فرمایا۔ لیکن ان فیض یافتگان بارگاہ نبویؐ میں حضرت علی (علیہ السلام) کی ذات جامع حیثیات نظر آتی ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ جس طرح آنحضرت صلعم اللہ تعالیٰ کی صفت تخلیق کا سب سے بڑا شاہکار ہیں۔ اسی طرح حضرت علی (علیہ السلام) حضور سرورِ دو عالمؐ کی شانِ نبوت و رسالت کا سب سے بڑا معجزہ ہیں۔

اسلام کے متعلق حضرت علی علیہ السلام کا خطبہ بلیغ

" حمد اس خدا کو سزاوار ہے جو میدانوں میں وحشی جانوروں کی پکار اور تنہائیوں میں بندوں کے گناہوں سے با خبر ہے وہ گہرے سمندروں میں مچھلیوں کی آمد و رفت، اور طوفانی ہواؤں سے پانی کے تلاطم کو جانتا ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم خدا کے برگزیدہ اور وحی کے سفیر اور اس کی رحمت کے رسول ہیں۔

اما بعد! تمہیں اس اللہ کے تقویٰ کی نصیحت کرتا ہوں، جس نے پہلے پہل تمہاری تخلیق کی، اور اسی کی طرف تمہیں پلٹ کر جانا ہے۔ اسی سے تمہارے مطالبات کامیاب اور رغبتوں کی انتہا ہے تمہارے راستے کا سیدھا رخ ادھر ہی ہے تمہاری پریشانیوں میں مرکز بھی وہی ہے۔ یہ تقویٰ دلوں کی دوا، نابینائی میں دل میں روشنی، جسموں، بیماریوں کی شفاء اور فساد سینہ کی اصلاح نفس کی گندگی کے لئے طہارت بخش ہے اور یہ تقویٰ آنکھوں کے پردوں کو ہٹانے والا، دل کی گھبراہٹ میں سکون، تاریکیوں میں روشنی ہے۔

لہٰذا اطاعتِ خدا کو اوڑھنا بچھونا بنالو، اسے اپنے دل میں اُتار لو اور پہلوؤں میں سنبھال لو، اور دعاؤں کے لیے سفارشی اور اپنی گھبراہٹ والے دن کے لیے سپر، اور شکم قبر کے لیے

چراغ اور طولانی وحشتوں کے لیے سکون، منزلوں کی تکلیف کے لیے بچالو۔ کیونکہ طاعت خدا ہلاکت کے مقامات میں اور متوقع خوف و بلا سے اور جلتی آگ کے شعلوں سے بچاؤ ہے تو جس نے تقویٰ کو بچالیا، اس کی سختیاں قریب نہ ہونے کے بعد بھی دُور رہیں گی۔ اور معاملات کی تلخیاں میٹھی بن جائیں گی، موجیں تہہ بہ تہہ ہونے کے بعد پھٹ جائیں گی، سختیاں نرمیاں بن جائیں گی اور قحط کے بعد کرامتیں برس پڑیں گی۔ رحمت اُٹھنے کے بعد جھک پڑے گی۔ نعمتیں ختم ہونے کے بعد بڑھیں گی اور بوندا باندی کے بعد برکتیں ٹوٹ کے برسیں گی۔۔ اس لیے تم اس اللہ سے تقویٰ اختیار کرو جس نے تمہیں اپنی نصیحت سے نفع پہنچایا اور اپنی رسالت سے نصیحت کی اور اپنی نعمت کے ذریعہ تم پر احسان کیا۔ اب تمہارے لیے ضروری ہے کہ تم اپنے نفوس کو اس کی عبادت کے لیے آمادہ کرو اور اس کی اطاعت کے حق سے عہدہ برآ ہو۔

پھر یہ اسلام خدا کا دین ہے جس نے اسے اپنے لیے پسند فرمایا اور اپنی نگرانی میں پروان چڑھایا۔ اپنے منتخب بندوں کے لیے چُنا، اس کے ستون اپنی محبت پر قائم کیے، دوسرے خودساختہ مذاہب کو اس کی عظمت کے سامنے گرادیا، اس کی بلندی کے لیے دوسری ملتوں کو پست کردیا۔ اس اسلام کی کرامت سے دشمنوں کو ذلیل اور اس کی مدد کے لیے حریفوں کا ساتھ چھوڑ دیا اس کے رکن کی وجہ سے گمراہی کے رکن گرا دیئے۔ پیاسوں کو اسی کے حوض (چشمے) سے سیراب کیا اور ان حوضوں کو پانی کھینچنے والے آئمہ اہل بیتؑ جو علوم کا پانی

چشمہ الوہیت سے لاتے ہیں' سے بھروادیا۔

پھر اس دین کو وہ رسی قرار دیا، جو کبھی ٹوٹے گی نہیں نہ اس کے حلقے کھل سکتے ہیں' نہ اس کی بنیاد گر سکتی ہے۔ نہ اس کے ستون اپنی جگہ چھوڑ سکتے ہیں۔ نہ اس کا درخت اُکھڑے گا۔ نہ اس کی مدت ختم ہوگی، نہ اس کی آسانیاں سختیاں ہوں گی، نہ اس کی وضاحتیں تاریک اور گنجلک ہوں گی، نہ اس کی استواری میں کمی ہوگی، نہ اس کی لکڑی مُڑے گی، نہ کھلے راستے ریگستانی ہوں گے' نہ اسکے چراغ بجھنے والے ہیں' نہ اس کی حلاوت میں کمی آنے والی ہے بلکہ یہ دین قیامت تک نور پاش وضو فگن و تازہ و پائندہ رہے گا

اسلام کے ستون خدا نے حق کی گہرائیوں میں قائم کیے ہیں اور بنیاد کو استوار و مضبوط کیا ہے۔ اس کے چشموں کو اتھاہ بنایا اور اس کے چراغوں کے شعلے تیز بھڑکائے اور منارے ایسے بنائے کہ مسافرین راہ علم وحق اس کی روشنی میں چلیں' وہ علامتیں قرار دیں کہ راہِ حق کا قصد کیا جائے وہ چشمے بنائے کہ پیاسے اُترنے والے سیراب ہوں۔ اس دین میں انتہائی رضا قرار دی۔ اپنے ستونوں کی بلندی' اپنی اطاعت کی چوٹیاں بنائیں تو یہ دین خدا کے نزدیک مضبوط ارکان' بلند بنیاد و روشن دلیل' روشن چراغ، معزز شاہی' بلند نشان ہے اس کی خاک اُڑانا (مٹانا) ناممکن ہے۔

اس لیے اس کی عزت کرو پیروی کرو اس کا حق ادا کرو۔ جو اس کی جگہ ہے وہاں رکھو (اپنی رائے اور بے جا مداخلت فی الدین سے بچو) پھر خدائے پاک و برتر نے

آنحضرت صلعم کو حق پر مبعوث فرمایا جب کہ قریب تھا کہ دنیا ختم ہو جائے اور آخرت کی خبریں قریب آ جائیں (قیامت ہونے کو تھی کیونکہ) رونق (دنیا) چمکنے کے بعد تاریک ہو گئی تھی اور اہل دنیا کے لیے پوری سختیوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس کا فرش ناقابل آرام اور اس (ناقہ) کی لگام کھینچنے والے (ہلاکت خیز واقعات) کے ہاتھ میں تھی۔ حدت ختم ہو رہی تھی، شرطیں پوری ہو رہی تھیں۔ اہل (دین جو دنیا میں تھے) آدمی فنا اور حلقے ٹوٹ رہے تھے۔ اسباب منتشر، نشانات بے نشاں اور کمزوریاں برہنہ مدت مختصر ہو رہی تھی۔ خدا نے حضرتؐ کو اپنے پیغام کا رسولؐ اور ان کی امت کا شرف اور زمانہ والوں کی بہار مددگاروں کی سربلندی اور انصار (دین) کی عزت بنا دیا

اس کے بعد حضرت صلعم پر کتاب نازل کی کہ یہ ایسا نور ہے جس کی شمعیں گل نہ ہوں گی۔ ایسا چراغ ہے جس کی روشنی بجھے گی نہیں ایسا سمندر ہے جس کی تھاہ نہیں ملتی۔ ایسا راستہ ہے جس پر چلنے سے گمراہی نہیں، وہ شعاع ہے جس کی روشنی مدھم نہیں ہوتی۔ حدود باطل کی وہ حد ہے جس کی دلیل سست اور وہ بنیاد ہے جس کے رکن منہدم نہ ہونگے۔ وہ شفا ہے جس کے بعد بیماریوں کا ڈر نہیں، وہ عزت ہے جس کے مددگار شکست نہیں کھاتے، وہ حق ہے جس کے معاون بے یار و مددگار نہیں چھوڑے جائیں گے۔ وہ (قرآن) ایمان کا خزانہ اور اس کا بہی مرکز سرچشمہ بلکہ علمی سمندروں کا معدن ہے۔ اور عدل کا باغ اور اس کے حوض اسلام کے سنگ بنیاد حق کی وادیاں اور اس کے ہموار جنگل (اسی قرآن میں) ہیں۔ قرآن وہ سمندر ہے جسے کھینچنے والے خشک نہیں کر سکتے وہ سرچشمہ ہے جس

پر آنے والے اس کا پانی تہہ نشین اور ختم نہیں کر سکتے۔ اس میں وہ منزلیں ہیں جس کے مسافر راستہ نہیں بھول سکتے، وہ نشانات ہیں جنہیں چلنے والے فراموش نہیں کر سکتے وہ جھاڑیاں ہیں جن سے گزرنے والوں کا گزرنا مشکل ہے۔

خدا نے اس قرآن کو علماء کی پیاس میں سیرابی، فقیہوں کے دل کی بہار صالحین کے طریقوں کا راستہ، وہ دوا جس کے بعد کوئی مرض نہیں، وہ نور بنایا جس کے ساتھ ظلمت نہیں، مضبوط رشتہ اور وہ محفوظ پناہ گاہ جس کی چوٹی اونچی ہے یہ اپنے محبت کرنے والوں کی عزت اور حلقہ (اسلام) میں آنے والوں کے لیے صلح اور پیروی کرنے والوں کے لیے ہدایت ہے، جو اسے اپنائے اس کے لیے عذر اور جو اس کے ذریعہ بولے اس کے لیے دلیل اور جو اس کی امداد سے بڑھے اس کے لیے گواہ، جو اس سے حجت قائم کرے اس کے لیے کامیابی، جو اسے اُٹھا لے (اپنالے) اسے سنبھالنے والا، جو اسے کام میں لائے اس کی سواری و منزل رساں، جو اسے پہچان لے اس کے لیے نشانی، جو اس سے صلح و سلامتی مانگے اس کے لیے سپر اور ڈھال ہے، جو محفوظ رکھے اس کے لیے علم، جو دوسروں کو بتائے اس کے لیے روایت، جو اس کے ذریعہ فیصلہ کرے یہ اس کے لیے قرآن حکیم ہے۔" (نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۱۸۸)

صفات امام اے رنگارنگ مزاج اور پراگندہ پریشان دل رکھنے والو جن کے جسم حاضر اور عقلیں غائب ہیں، میں تمہیں حق کے راستے پر لے چلنا چاہتا ہوں، لیکن تم اس سے یوں بھاگتے ہو جسطرح بکری شیر کی دھاڑ سن کر بھاگتی ہے کس قدر مشکل ہے یہ کام کہ تمہاری کمک سے عدل پنہاں کو آشکار کر دوں اور حق کو (کہ جسے

گمراہوں نے کج کردیا ہے) راست کردوں۔

بارِ خدایا! تو آگاہ ہے کہ جو کچھ ہم نے (تبلیغ کا کام) کیا وہ اسلیے نہ تھا کہ ہم سلطنت وخلافت کیطرف میل رکھتے ہیں نہ اسلئے تھا کہ متاع دنیا سے ہم کچھ حاصل کرتے، بلکہ صرف اسلیے تھا کہ جب فتنہ وفساد، ظلم وستم کا صدور ہو، اور حلال وحرام میں تغیر شروع ہو، تو تیرے دین کے آثار ہیں (جو تغیر ہوگیا تھا ہم نے چاہا کہ) اسے واپس لائیں اور تیرے شہروں میں اصلاح و آسائش کو برقرار کردیں تاکہ تیرے ستم کشیدہ بندے، امن و آسودگی حاصل کریں، اور تیرے احکام جو ضایع کیے جارہے تھے پھر جاری ہوجائیں۔

بارِ خدایا! میں وہ سب سے پہلا شخص ہوں جس نے حق کیطرف رجوع کیا، حق کی دعوت سنی اور حق کی صدا پر لبیک کہا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ کسی نے مجھ سے پہلے نماز نہیں پڑھی۔

تم جانتے ہو کہ وہ شخص ناموس وخون عوام، غنیمت، احکام اسلام اور امانت مسلمین کا سزاوار نہیں جو بخیل ہو، کہ وہ طمع وحرص میں مبتلا ہوجائے گا۔ نہ اسے جاہل ہونا چاہیئے ورنہ اپنی نادانی سے دوسروں کو گمراہ کردے گا۔ نہ ستمگر ہونا چاہیئے ورنہ اپنے ظلم وجور سے لوگوں کو پریشان کردے گا۔ نہ تغیرِ ایام سے ڈرنے والا ہونا چاہیئے ورنہ وہ ایک (طاقتور) گروہ سے مل کر دوسرے (کمزور) گروہ کو ذلیل وخوار کرے گا۔ نہ اسے رشوت لینے والا ہونا چاہیئے (کہ مال لے کر باطل کو حق اور حق کو باطل کردے) ورنہ حقوق ضایع ہوجائیں گے اور حدود الٰہی نافذ نہ ہوسکیں گے۔ نہ سنت کا معطل کرنے والا ہونا چاہیئے ورنہ وہ امت کو ہلاک کردے گا۔" (نہج البلاغۃ خطبہ ۱۳۱)

ذکرِ بیعت حضرت علی علیہ السلام نے اِس خطبہ میں ان حالات کا ذکر فرمایا ہے جو ان کی بیعت خلافت سے پہلے اور بعد میں

پیش آئے :۔

"ان لوگوں نے مجھ پر اسطرح اژدھام کیا جس طرح پیاسے اونٹوں کی رسیاں کھول دی جائیں۔ اور ساربان چھوڑ دے اور وہ بگٹٹ گھاٹ کی طرف بھاگیں۔ یہاں تک کہ میں گمان کرنے لگا کہ یہ لوگ کہیں مجھے یا آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرنے تو نہیں آرہے ہیں۔

یا تو ان کے جوشِ عقیدت کا یہ عالم تھا کہ بیعت کے لیے اسطرح ٹوٹے پڑ رہے تھے اور یا اب یہ کیفیت ہے کہ طلحہؓ و زبیرؓ اور بعض دوسرے لوگ نقض بیعت کر رہے ہیں اور پیمان شکنی کا عہد کر رہے ہیں۔

میں نے اس امر کے ظاہر و باطن پر اچھی طرح غور کیا اور اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار اپنے لیے نہ پایا کہ ایسے لوگوں سے جنگ کروں یا پھر ان چیزوں کا منکر ہو جاؤں جو محمدؐ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (من جانب اللہ) اپنے ساتھ لائے تھے جنگ کا معالجہ میرے نزدیک آسان تر ہے۔ عذابِ الٰہی کا معالجہ قبول کر لینے سے اور دنیا کی موت میرے لیے کہیں آسان ہے قیامت کی موت سے"۔ (نہج البلاغہ خطبہ ۵۳)

خبردار!

دنیا فنا اور نیستی کے دروازے پر کھڑی ہے اس کی زبان پر "الوداع" آچکا ہے اس کا معروف منکر بن چکا، وہ تیزی کے ساتھ منہ موڑ چکی ہے یہ دنیا فنا کے ہاتھوں، اپنے باشندوں کو ڈھکیلتی ہے اور موت کے ذریعہ اپنے پڑوسیوں کو ہنکا کر عالمِ آخرت کیطرف لے جاتی ہے۔ اس کا شیریں پانی تلخ اور صاف و شفاف چشمہ مکدر ہو چکا ہے اب اس کے پاس اس تلچھٹ کے سوا کچھ باقی نہیں رہ گیا ہے جو برتن کی تہہ میں رہ جاتی ہے، اس گھونٹ کیطرح جو مقلہ کا ہوتا ہے جسے پیاسے چوستے ہیں تو سیراب نہیں ہوتے۔

تو اے بندگانِ خدا! اس دنیا سے کوچ کرنے کا سامان کر لو،

جس کے ساکنوں کے لیے موت مقدر ہو چکی ہے اور ہاں کہیں ایسا نہ ہو کہ آرزوئیں اور تمنائیں تم پر غلبہ پالیں اور مدّت زندگانی (ناپائیدار) تمہاری نظر میں طولانی بن جائے خدا کی قسم اگر تم بچہ مردہ اونٹ کے مانند نالہ کرو کبوتر کی صدائے دردمند کیطرح پکارو اور راہب تارک الدنیا کی طرح فریاد و زاری کرو اور مال و اولاد سے کنارہ کش ہو کر تقرب خداوندی حاصل کرنے کے لیے نکل پڑو، تاکہ تمہارا ایسا کوئی درجہ (اس کی جناب میں) بلند کر دیا جائے، یا ایسا کوئی گناہ بخش دیا جائے جسے کاتبانِ نامۂ اعمال اپنی کتاب میں لکھ چکے ہیں، تو یہ ساری چیزیں اس ثواب کے مقابلے میں کہیں کم ہوں گی جس کی میں تمہارے لیے امید کر رہا ہوں، اسی طرح اس عذاب کے مقابلے میں تمہارے بارے میں خائف رہتا ہوں۔

واللہ!

اگر تمہارے دل، شوقِ لقائے باری تعالیٰ میں گداختہ ہو جائیں اور اس کے اجر کے شوق اور عذاب کے خوف سے تمہاری آنکھیں خون برسانے لگیں اور جب تک دنیا باقی ہے تمہیں موت نہ آئے تب بھی تمہارے اعمال، خداوند تعالیٰ کی ان نعمت ہائے بزرگ کی مکافات نہ ہو سکیں گے جو اس نے ازراہ کرم و رحم تم پر ارزانی فرمائی ہیں اور ایمان کی طرف رہبری فرمائی ہے، اگرچہ تم سعی اور کوشش کا کوئی ذریعہ باقی نہ چھوڑو۔ (نہج البلاغہ، خطبہ ۵۲)

خونِ عثمان "خبردار! شیطان نے اپنے گروہ کو برانگیختہ کر دیا ہے اور اپنی سپاہ کو جمع کر لیا ہے تاکہ ظلم و ستم کو اس کے وطن میں واپس لے آئیں اور باطل کو اس کی منزل پر پہنچا دیں۔ خدا کی قسم ان لوگوں نے کوئی میری بات ایسی نہیں سُنی تھی جسے مجھ پر نہ ڈالا ہو پھر میرے اور اپنے درمیان انصاف کو نہ آنے دیا۔

جس حق کو یہ خود ترک کر چکے ہیں اس کا مجھ سے مطالبہ کرتے

ہیں، جس خون کو انہوں نے خود بہایا ہے، اس کا خوں بہا طلب کر رہے ہیں۔

اگر اس خون میں ان لوگوں کا میں شریک تھا تو اس میں ان کا بھی حصہ ہے اور اگر انہوں نے قتل عثمان کا ارتکاب کیا تو پھر اس کی ذمہ داری اور مواخذہ بھی صرف اُن ہی پر ہے۔

ان کی سب سے بڑی دلیل خود ان ہی پر عائد ہو رہی ہے، یہ اس ماں کا دودھ پی رہے ہیں جس کا دودھ ختم ہو چکا ہے۔ یہ اس بدعت کو زندہ کر رہے ہیں جو مر چکی ہے۔ ولئے ناکام داعی (بطور تذلیل) لیکن داعی کون ہے اور کس چیز کا جواب چاہا جا رہا ہے؟ خدا نے ان پر جو حجت قائم کر دی ہے اس پر راضی ہوں۔ خدا کو ان کی جن باتوں کا علم ہے میں اس پر بھی راضی ہوں۔

اگر یہ سرکشی کریں گے تو میں ان کو تلوار کی باڑھ پر رکھ لوں گا۔ کہ (آخری چارہ کار کے طور پر) وہی ایک چیز ہے جو حق کی مددگار ہے اور باطل کی سرکوبی کا باعث ہوتی ہے۔ کس قدر حیرت اور تعجب کا مقام ہے کہ یہ مجھے پیام دیتے ہیں کہ نیزہ زنی کے لیے باہر نکل آؤں اور تلوار کے مقابلہ میں ثابت قدم رہوں۔

ان کی مائیں ان پر ماتم کریں، میں تو وہ شخص ہوں کہ مجھے کبھی جنگ و پیکار سے دہشت زدہ نہیں کیا گیا۔ نہ ضرب شمشیر سے مرعوب کیا گیا۔ خدا نے مجھے یقین (ایمان) کی جو دولت دی ہے میں اس پر بھروسہ رکھتا ہوں۔ اور اپنے مسلک کے (حق ہونے میں) ذرا بھی شک و شبہ نہیں رکھتا۔"

(نہج البلاغہ خطبہ ۲۲)

عہدِ علوی پر ایک نظر

کہا جاتا ہے کہ " حضرت علی علیہ السلام کی خلافت
کا پورا زمانہ خانہ جنگی اور شورش کی نذر ہوا، اس پنجسالہ مدت میں آپ کو
ایک لمحہ بھی سکون و اطمینان نصیب نہ ہوا۔ اس لیے آپؑ کے زمانے
میں فتوحات کا سلسلہ تقریباً بند ہوگیا۔ ملکی انتظامات کی طرف
بھی توجہ کرنے کی فرصت آپ کو نہ مل سکی۔ لیکن ان گوناگوں

مشکلات کے باوجود جناب علی مرتضیٰ علیہ السلام کی زندگی کے عظیم الشان کارناموں پر نظر کرنے سے پہلے یہ امر قابل غور ہے کہ خلافتِ مرتضوی میں اس قدر افتراق و اختلاف اور شر و فساد کے اسباب و علل کیا تھے ؟ اور حضرت علی علیہ السلام نے کس تحمل، استقلال اور سلامت روی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا۔

"شام میں بنو اُمیہ معاویہ کے زیرِ قیادت خلافت کو اپنی سلطنت میں تبدیل کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے چنانچہ معاویہ حسب ذیل وجوہ کو آڑ بنا کر میدان میں اُترے:۔

(۱) حضرت علیؑ نے مفسدین کے مقابلے میں عثمانؓ کو مدد نہیں دی۔

(۲) اپنی خلافت میں قاتلین عثمانؓ سے قصاص نہیں لیا۔

(۳) محاصرہ کرنے والوں کو قوتِ بازو بنایا اور ان کو بڑے بڑے عہدے دیئے۔

"یہ وجوہ تمام خانہ جنگیوں کی بناء قرار پائے، اس لیے غور کرنا چاہیے کہ اس میں کہاں تک صداقت ہے اور حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام کس حد تک اس میں معذور تھے، پہلا سبب یعنی مسفدین کے مقابلے میں مدد نہ دینے کا الزام صرف حضرت علی علیہ السلام ہی پر نہیں بلکہ طلحہؓ، زبیرؓ، سعد ابن وقاصؓ اور تمام اہل مدینہ پر عائد ہوتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کو یہ منظور ہی نہیں تھا کہ ان کے عہد میں خانہ جنگی کی ابتدا ہو، چنانچہ انصار کرام بنو امیہ اور دوسرے وابستگانِ خلافت نے جب اپنے کو جاں نثاری کے لیے پیش کیا تو حضرت عثمانؓ نے نہایت سختی کے ساتھ کشت و خون سے منع کر دیا۔ حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام نے اس باب میں جو کچھ کیا ان کے لیے اس سے زیادہ ممکن نہ تھا۔ چنانچہ پہلی مرتبہ آپؑ نے مفسدین کو راضی کر کے واپس کیا تھا لیکن جب دوسری مرتبہ وہ پھر لوٹے تو مروان کی غداری نے ان کی آتش غیظ و غضب کو اس قدر بھڑکا دیا

تھا کہ کسی قسم کی سفارش کارگر نہیں ہو سکتی تھی، ام المومنین ام حبیبہؓ نے محاصرہ کی حالت میں حضرت عثمانؓ کے پاس کھانے پینے کا کچھ سامان پہنچانا چاہا تو مفسدین نے ان کا بھی پاس و لحاظ نہ کیا، اور گستاخانہ مزاحمت کی، اسی طرح حضرت علی علیہ السلام نے سفارش کی کہ آب و دانہ کی بندش نہ کی جائے تو ان شوریدہ سروں نے نہایت سختی سے انکار کر دیا، جنابِ امیرؑ کو اس کا اسقدر صدمہ ہوا کہ عمامہ پھینک کر اسی وقت واپس چلے آئے اور تمام معاملات سے کنارہ کش ہو کر عزلت نشین ہو گئے، پھر یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اگر عثمانؓ محصور تھے تو دوسرے بڑے صحابہؓ بھی آزاد نہ تھے اور مفسدین نے ان لوگوں کی نقل و حرکت پر نہایت سخت نگرانی قائم کر دی تھی۔

"رہا قاتلوں کو سزا نہ دینے کا الزام تو اس کی صورت یہ ہے کہ اگر قاتل سے مراد وہ مخصوص اشخاص ہیں، جنہوں نے براہِ راست قتل میں حصہ لیا تو بے شک اُنہیں کیفرِ کردار تک پہنچانا حضرت علی علیہ السلام کا فرض تھا لیکن جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے۔ پوری تفتیش و تحقیقات کے باوجود ان کا سراغ نہ ملا، اور اگر قاتل کا لفظ تمام محاصرہ کرنے والوں پر مشتمل ہے، جیسا کہ معاویہ وغیرہ کے مطالبہ سے ظاہر ہے تو ایک شخص کے قصاص میں ہزاروں آدمیوں کا خون نہیں بہایا جا سکتا تھا اور نہ شریعت اس کی اجازت دیتی تھی۔ اس بڑی جماعت میں بعض صحابہ کرام اور بہت سے صلحائے روزگار بھی شامل تھے جن کا مطمحِ نظر صرف طلبِ اصلاح تھا، ان لوگوں کو قتل کر دینا یا معاویہ کے خنجرِ انتقام کے نیچے دے دینا صریحاً ظلم تھا۔

"تیسری بات محاصرہ کرنے والوں کو قوّتِ بازو بنانے اور ان کو بڑے بڑے عہدے دینے سے متعلق ہے۔ جس کے سلسلہ میں حضرت علی علیہ السلام مجبور تھے، کیونکہ

اس وقت دنیائے اسلام میں تین فرقے پیدا ہو گئے تھے "شیعیان عثمانؓ یعنی عثمانی فرقہ جو علانیہ جنابِ امیر علیہ السلام کا مخالف اور اپنی ایک مستقل سلطنت قائم کرنے کا خواب دیکھ رہا تھا، دوسرا گروہ اکابر صحابہ کا تھا، جو اگرچہ حضرت علی علیہ السلام کو برسرِ حق سمجھتا تھا لیکن اپنے ورع و تقویٰ کے باعث خانہ جنگی میں حصہ لینا پسند نہیں کرتا تھا چنانچہ حضرت علی علیہ السلام نے مدینہ سے کوفہ کا قصد کیا اور صحابہ کرام سے چلنے کے لیے کہا تو بہت سے محتاط صحابہ نے معذرت کر لی۔

حضرت سعد بن وقاص نے کہا "مجھے ایسی تلوار دیجیئے جو مسلم و کافر میں امتیاز رکھے، میں صرف اسی صورت میں جان بازی کے لیے حاضر ہوں"۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے کہا: "خدا کے لیے مجھے ایک ناپسندیدہ فعل کے لیے مجبور نہ کیجیئے"۔ حضرت محمد بن مسلمہ نے کہا کہ "قبل اس کے کہ میری تلوار کسی مسلم کا خون گرائے اس زور سے اسے جبل احد پر پٹک ماروں گا کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی"۔ حضرت اسامہ بن زید نے عرض کی "امیر المومنین مجھے معاف کیجیئے، میں نے عہد کیا ہے کہ کسی کلمہ گو کے خون سے اپنی تلوار رنگین نہ کروں گا"۔ غرض یہ گروہ عملی اعانت سے قطعی کنارہ کش تھا، تیسرا گروہ شیعان علی کا تھا، جس میں ایک بڑی جماعت ان لوگوں کی تھی جو یا تو خود محاصرہ میں شریک تھے، یا وہ ان کے زیر اثر تھے، اس لیے جناب امیرؑ خواہ مخواہ بے رخی کر کے اس بڑی جماعت کو قصداً اپنا دشمن نہیں بنا سکتے تھے، تاہم آپؑ نے ان ہی لوگوں کو مقرب خاص بنایا جو درحقیقت اس کے اہل تھے، حضرت عمار یاسرؓ ایک بلند پایہ صحابی اور مقبول بارگاہ نبوت تھے۔ محمد بن ابی بکر خلیفہ اول کے صاحبزادے اور آغوش حیدر کے تربیت یافتہ تھے اسی طرح اشتر نخعی ایک صالح، نیک سیرت اور جاں نثار تابعی تھے"۔

(نہج البلاغہ مطبوعہ شیخ غلام علی طبع اوّل مقدمہ ص ۹۴ - ۹۶ سے اقتباس)

صفات علوی حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام نے ایام طفولیت ہی سے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے دامن عاطفت میں تربیت پائی تھی، اس لیے وہ قدرتاً محاسنِ اخلاق اور حُسنِ تربیت کا نمونہ تھے۔ آپ ؑ کی زبان نہ کبھی کلمہ شرک و کفر سے آلودہ ہوئی اور نہ آپ کی پیشانی غیر خدا کے سامنے جھکی، جاہلیت کے ہر قسم کے گناہ سے مبرا اور پاک رہے، شراب کے ذائقہ سے جو عرب کی گھٹی میں تھی اسلام سے پہلے بھی آپ کی زبان آشنا نہ ہوئی اور اسلام کے بعد تو اس کا کوئی خیال ہی نہیں کیا جا سکتا۔" (نہج البلاغہ ص ۱۰۱)

ان کی ذاتِ گرامی جو قتلِ عثمانؓ کے سلسلے میں مابہ النزاع بنی ہوئی ہے مولانا مودودی کی زبانی اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:۔

قتلِ عثمانؓ کے بعد مدینہ میں سراسیمگی پھیل گئی کیونکہ امت یکا یک بے سردار اور مملکت بے سربراہ رہ گئی تھی۔ باہر سے آنے والے شورشی اور مدینہ کے مہاجرین و انصار و تابعین، دونوں اس پریشانی میں مبتلا ہو گئے کہ سرحد روم سے یمن تک اور افغانستان سے شمالی افریقہ تک پھیلی ہوئی امت اور مملکت چند روز بھی بے سربراہ کیسے رہ سکتی ہے لامحالہ جلدی جلدی ایک خلیفہ کا انتخاب ہونا چاہیے تھا، اور یہ انتخاب بھی لازماً مدینہ ہی میں ہونا چاہیے تھا کیونکہ وہی مرکزِ اسلام تھا، اور یہیں وہ اہلِ حل و عقد موجود تھے جن کی بیعت سے اسوقت تک خلافت منعقد ہوتی رہی تھی۔ اس معاملہ میں نہ تاخیر کی جا سکتی تھی اور نہ مدینہ سے باہر دُور دراز کے دیار و امصار کی طرف رجوع کرنے کا کوئی موقع تھا۔ ایک خطرناک صورت حال پیدا ہو چکی تھی۔ فوری ضرورت تھی کہ کسی موزوں ترین شخصیت کو سربراہ بنایا جائے تاکہ امت اس پر جمع ہو سکے اور وہ مملکت کو انتشار سے بچا سکے۔

" اس وقت ان چھ اصحاب میں سے چار موجود تھے جن

کو حضرت عمرؓ نے اپنی وفات کے وقت اُمت کے مقدم ترین اصحاب قرار دیا تھا. ایک حضرت علیؑ دوسرے حضرت طلحہؓ، تیسرے حضرت زبیرؓ، چوتھے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ۔ ان میں سے حضرت علیؑ ہر لحاظ سے پہلے نمبر پر تھے۔ شوریٰ کے موقع پر حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے امت کی عام رائے معلوم کرنے کے بعد یہ فیصلہ دیا تھا کہ حضرت عثمانؓ کے بعد دوسرے شخص جن کو اُمت کا زیادہ سے زیادہ اعتماد حاصل ہے. حضرت علیؑ ہی ہیں اس لیے یہ بالکل فطری امر تھا کہ لوگ خلافت کے لیے انہی کیطرف رجوع کرتے. صرف مدینہ ہی میں نہیں، پوری دنیائے اسلام میں دوسرا کوئی شخص ایسا نہ تھا جس کی طرف اس غرض کے لیے مسلمانوں کی نگاہیں اُٹھتیں. حتیٰ کہ اگر آج کے رائج طریقوں کے مطابق بھی کوئی انتخاب کرایا جاتا تو لازماً عظیم اکثریت کے ووٹ انہیں کو حاصل ہوتے، چنانچہ تمام معتبر روایتوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحابؓ اور دوسرے اہلِ مدینہ اُن کے پاس گئے اور اُن سے کہا کہ" یہ نظام کسی امیر کے بغیر قایم نہیں رہ سکتا ہے، لوگوں کے لیے ایک رہنما کا وجود ناگزیر ہے، اور آج آپ کے سوا ہم کوئی ایسا شخص نہیں پاتے جو اس منصب کے لیے آپ سے زیادہ مستحق ہو، نہ سابق خدمات کے اعتبار سے، اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ قرب کے اعتبار سے"۔ آپ نے انکار کیا اور لوگ اصرار کرتے رہے۔ آخرکار آپ نے کہا: "میری بیعت گھر بیٹھے خفیہ طریقہ سے نہیں ہو سکتی، عام مسلمانوں کی رضا کے بغیر ایسا ہونا ممکن نہیں ہے"۔ پھر مسجدِ نبوی میں اجتماع عام ہوا اور تمام مہاجرین و انصار نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی. صحابہؓ میں سے ۱۶ یا ۲۰ ایسے بزرگ تھے جنہوں نے بیعت نہیں کی۔

اس روداد سے اس امر میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ حضرت علیؑ کی خلافت قطعی طور پر ٹھیک ٹھیک انہی اصولوں

کے مطابق منعقد ہوئی جن پر خلافتِ راشدہ کا انعقاد ہو سکتا تھا۔ وہ زبردستی اقتدار پر قابض نہیں ہوئے۔ آپ نے خلافت حاصل کرنے کے لیے برائے نام بھی کوئی کوشش نہیں کی۔ لوگوں نے خود آزادانہ مشاورت سے آپ کو خلیفہ منتخب کیا۔ صحابہؓ کی عظیم اکثریت نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور بعد میں شام کے سوا تمام بلادِ اسلامیہ نے آپ کو خلیفہ تسلیم کیا۔ اب اگر حضرت سعد ابن عبادہؓ کے بیعت نہ کرنے سے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی خلافت مشتبہ نہیں ہوتی تو ۱۷ یا ۲۰ صحابہ کے بیعت کرنے سے حضرت علیؑ کی خلافت کیسے مشتبہ قرار پا سکتی ہے علاوہ بریں ان چند اصحابؓ کا بیعت نہ کرنا تو محض ایک منفی فعل تھا جس سے خلافت کے معاملے کی آئینی پوزیشن پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کیا مقابلے میں کوئی دوسرا خلیفہ تھا جس کے ہاتھ پر انہوں نے جوابی بیعت کی ہو، یا ان کا کہنا یہ تھا کہ اب امت اور مملکت کو بے خلیفہ رہنا چاہیئے، یا یہ کہ کچھ مدت تک خلافت کا منصب خالی رہنا چاہیئے، اگر ان میں سے کوئی بات بھی نہ تھی تو محض ان کے بیعت نہ کرنے کے یہ معنی کیسے ہو سکتے ہیں کہ اکثریت اور عظیم اکثریت نے جس کے ہاتھ پر بیعت کی تھی وہ جائز طور پر فی الواقع خلیفہ نہ بنا۔

اسطرح امت کو یہ موقع مل گیا تھا کہ خلافت راشدہ کے نظام میں جو خطرناک رخنہ حضرت عثمانؓ کی شہادت سے پیدا ہوا تھا وہ بھر جاتا اور حضرت علیؑ پھر سے اس کو سنبھال لیتے۔ لیکن تین چیزیں ایسی تھیں جنہوں نے اس رخنے کو نہ بھرنے دیا بلکہ اسے اور بڑھا کر ملوکیت کیطرف اُمّت کو ڈھکیلنے میں ایک مرحلہ اور طے کر دیا۔

ایک، حضرت علیؑ کو خلیفہ بنانے میں ان لوگوں کی شرکت جو حضرت عثمانؓ کے خلاف شورش برپا کرنے کے لیے باہر سے آئے ہوئے تھے۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جنہوں نے بالفعل جرم قتل کا ارتکاب کیا تھا اور وہ بھی جو قتل کے محرک اور اس

میں اعانت کے مرتکب ہوئے تھے۔ اور ویسے مجموعی طور پر اس فساد کی ذمہ داری ان سب پر عائد ہوتی تھی۔ خلافت کے کام میں ان کی شرکت ایک بڑے فتنے کا موجب بن گئی۔ لیکن جو شخص بھی ان حالات کو سمجھنے کی کوشش کرے گا جو اس وقت مدینہ میں درپیش تھے وہ یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس وقت ان لوگوں کو انتخابِ خلیفہ کے کام میں شریک ہونے سے کسی طرح باز نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ پھر بھی انکی شرکت کے باوجود جو فیصلہ ہوا وہ بجائے خود ایک صحیح فیصلہ تھا اور اگر اُمت کے تمام با اثر اصحاب اتفاق رائے کے ساتھ حضرت علیؓ کے ہاتھ مضبوط کر دیتے تو یقیناً قاتلین کیفر کردار کو پہنچا دیئے جاتے اور یہ صورت جو بد قسمتی سے رونما ہو گئی تھی بآسانی ختم ہو جاتی۔

دوسرے بعض اکابر صحابہؓ کا حضرت علیؓ کی بیعت سے الگ رہنا، یہ طرز عمل اگرچہ ان بزرگوں نے انتہائی نیک نیتی کے ساتھ محض فتنے سے بچنے کی خاطر اختیار فرمایا تھا، لیکن بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ جس فتنے سے وہ بچنا چاہتے تھے اس سے بدرجہا بڑے فتنے میں ان کا یہ فعل الٹا مددگار بن گیا وہ بہرحال امت کے نہایت با اثر لوگ تھے ان میں سے ہر ایک ایسا تھا جس پر ہزاروں مسلمانوں کو اعتماد تھا۔ ان کی علیحدگی نے دلوں میں شک ڈال دیئے اور خلافتِ راشدہ کے نظام کو از سر نو بحال کرنے کے لیے جس دل جمعی کے ساتھ امت کو حضرت علیؓ سے تعاون کرنا چاہیے تھا، جس کے بغیر وہ اس کام کو انجام نہ دے سکتے تھے وہ بد قسمتی سے حاصل نہ ہو سکا۔

تیسرے، حضرت عثمانؓ کے خون کا مطالبہ جسے لے کر دو طرف سے دو فریق اُٹھ کھڑے ہوئے تھے ایک طرف حضرت عائشہؓ اور حضرت طلحہؓ و زبیرؓ اور دوسری طرف امیرِ شام۔ ان دونوں فریقوں کے مرتبہ و مقام اور جلالت قدر کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے بھی یہ کہے بغیر

چارہ نہیں کہ دونوں کی پوزیشنیں آئینی حیثیت سے کسی طرح درست نہیں مانی جا سکتیں۔ ظاہر ہے کہ یہ جاہلیت کے دور کا قبائلی نظام تو نہ تھا کہ کسی مقتول کے خون کا مطالبہ لے کر جو چاہے اور جسطرح چاہے اُٹھ کھڑا ہو اور جو طریقہ چاہے اسے پورا کرانے کے لیے استعمال کرے۔ یہ ایک باقاعدہ حکومت تھی جس میں ہر دعویٰ کے لیے ایک ضابطہ اور قانون موجود تھا۔ خون کا مطالبہ لے کر اٹھنے کا حق مقتول کے وارثوں کو تھا جو زندہ تھے اور وہیں موجود تھے۔ حکومت اگر مجرموں کو پکڑنے اور ان پر مقدمہ چلانے میں واقعی دانستہ طور پر تساہل کر رہی تھی تو بلاشبہ دوسرے لوگ اس سے انصاف کا مطالبہ کر سکتے تھے لیکن کسی حکومت سے انصاف کے مطالبے کا یہ کونسا طریقہ ہے اور شریعت میں کہاں اس کی نشاندہی کی جا سکتی ہے کہ آپ سرے سے اس حکومت کو جائز حکومت ہی اس وقت تک نہ مانیں جب تک وہ آپ کے اس مطالبہ کے مطابق عملدرآمد نہ کر دے؟ حضرت علیؓ اگر جائز خلیفہ تھے ہی نہیں تو پھر ان سے اس مطالبہ کے آخر معنی کیا تھے کہ وہ مجرموں کو پکڑیں اور سزا دیں؟ کیا وہ قبائلی سردار تھے جو کسی قانونی اختیار کے بغیر جسے چاہیں پکڑ لیں اور سزا دے ڈالیں؟

اس سے بھی زیادہ غیر آئینی طریق کار یہ تھا کہ پہلے فریق نے بجائے اس کے کہ وہ مدینہ جا کر اپنا مطالبہ پیش کرتا، جہاں خلیفہ اور مجرمین اور مقتول کے ورثا سب موجود تھے اور عدالتی کارروائی کی جا سکتی تھی، کعبہ کا رُخ کیا اور فوج جمع کر کے خونِ عثمانؓ کا بدلہ لینے کی کوشش کی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا تھا کہ ایک خون کے بجائے دس ہزار مزید خون ہوں اور مملکت کا نظام الگ درہم برہم ہو جائے۔ شریعت الٰہی تو درکنار دنیا کے کسی آئین و قانون کی رو سے بھی اسے ایک جائز کارروائی نہیں مانا جا سکتا۔ اس سے بدرجہا زیادہ غیر آئینی طرز عمل دوسرے فریق یعنی امیر شامؒ کا تھا جو معاویہ ابنِ

ابوسفیان کی حیثیت سے نہیں بلکہ شام کے گورنر کی حیثیت سے خونِ عثمانؓ کا بدلہ لینے کے لیے اُٹھے، مرکزی حکومت کی اطاعت سے انکار کردیا، گورنر کی طاقت اپنے اس مقصد کے لیے استعمال کی اور مطالبہ بھی یہ نہیں کیا کہ حضرت علیؓ قاتلانِ عثمانؓ پر مقدمہ چلاکر انہیں سزادیں بلکہ یہ کیا کہ وہ قاتلانِ عثمانؓ کو اُن کے حوالے کردیں تاکہ وہ خود انہیں قتل کردیں۔ یہ سب کچھ دَورِ اسلام کی نظامی حکومت کے بجائے زمانہ قبل از اسلام کی قبائلی بدنظمی کا تجربہ ہے۔ خونِ عثمانؓ کے مطالبہ کا حق اول تو حضرت معاویہ کے بجائے حضرت عثمانؓ کے شرعی وارثوں کو پہنچتا تھا۔ تاہم اگر رشتہ داری کی بناء پر حضرت معاویہ اس مطالبہ کے مجاز ہو بھی سکتے تھے تو اپنی ذاتی حیثیت میں، نہ کہ شام کے گورنر کی حیثیت میں۔ حضرت عثمانؓ کا رشتہ جو کچھ بھی تھا، معاویہ ابن ابوسفیان سے تھا، شام کی گورنری ان کی رشتہ دار نہ تھی۔ اپنی ذاتی حیثیت میں وہ خلیفہ کے پاس مستغیث بن کر جا سکتے تھے اور مجرموں کو گرفتار کرنے اور مقدمہ چلانے کا مطالبہ کر سکتے تھے۔ گورنر کی حیثیت سے انہیں کوئی حق نہ تھا کہ جس خلیفہ کے ہاتھ پر باقاعدہ آئینی طریقے سے بیعت ہو چکی تھی جس کی خلافت کو ان کے زیرِ انتظام صوبے کے سوا باقی پوری مملکت تسلیم کر چکی تھی اسکی اطاعت سے انکار کردیتے اور اپنے زیرِ انتظام علاقے کی فوجی طاقت کو مرکزی حکومت کے مقابلے میں استعمال کرتے اور ٹھیٹھ جاہلیتِ قدیمہ کے طریقے پر یہ مطالبہ کرتے کہ ملزموں کو عدالتی کارروائی کے بجائے مدعی قصاص کے حوالے کردیا جائے تاکہ وہ خود اس سے بدلہ لے۔" (خلافت وملوکیت ص ۱۲۶-۱۲۱)

اس سلسلے میں صحیح شرعی پوزیشن قاضی ابوبکر ابن العربی نے احکام القرآن میں اسطرح بیان کی ہے:

"قتلِ عثمانؓ کے بعد لوگوں کو بلا امام چھوڑ دینا ممکن نہ تھا چنانچہ امارت ان باقی ماندہ صحابہؓ کے سامنے پیش کی گئی

جن کا ذکر، حضرت عمرؓ نے شوریٰ میں کیا تھا۔ مگر انہوں نے رد کر دیا اور حضرت علیؓ نے جو ان کے سب سے زیادہ حقدار اور اہل تھے، اسے قبول کر لیا تاکہ امت کو خونریزی اور آپس کی پھوٹ سے بچایا جا سکے۔ جس سے دین وملت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ جانے کا خطرہ تھا پھر جب ان سے بیعت کر لی گئی تو شام کے لوگوں نے ان کی بیعت قبول کرنے کے لیے یہ شرط لگائی کہ پہلے حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کو گرفتار کر کے ان سے قصاص لیا جائے۔ حضرت علیؓ نے ان سے کہا پہلے بیعت میں داخل ہو جاؤ، پھر حق کا مطالبہ کرو اور وہ تمہیں مل جائے گا مگر انہوں نے کہا کہ آپ بیعت کے مستحق ہی نہیں ہیں جب کہ ہم قاتلین عثمانؓ کو صبح وشام آپ کے ساتھ دیکھ رہے ہیں۔ اس معاملے میں حضرت علیؓ کی رائے زیادہ صحیح تھی اور ان کا قول زیادہ درست تھا۔ کیونکہ اگر وہ اس وقت قاتلانِ عثمانؓ سے بدلہ لینے کی کوشش کرتے تو جو قبائل ان کی حمایت میں تھے ان کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوتے اور لڑائی کا ایک تیسرا محاذ کھل جاتا۔ اس لیے وہ انتظار کر رہے تھے کہ حکومت مضبوط ہو جائے اور تمام مملکت میں ان کی بیعت منعقد ہو جائے، اس کے بعد باقاعدہ عدالت میں اولیا مقتول کی طرف سے دعویٰ پیش ہو اور حق کے مطابق فیصلہ ہو۔ علماء امت کے درمیان اس امر میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ امام کے لیے قصاص کو موخر کرنا ایسی حالت میں جائز ہے جبکہ اس سے فتنہ بھڑک اُٹھنے اور تفرقہ برپا ہونے کا خطرہ ہو۔" آگے چل کر قاضی صاحب فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتّٰى تَفِيءَ إِلٰى أَمْرِ اللّٰهِ (سورۂ حجرات۴۹ آیت ۹) کی تفسیر پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں "حضرت علیؓ نے ان حالات میں اسی آیت کے مطابق عمل کیا، انہوں نے ان باغیوں کے خلاف جنگ کی جو امام پر اپنی رائے مسلط کرنا چاہتے تھے اور ایسا مطالبہ کر رہے تھے جس کا انہیں حق نہ تھا۔ ان کے لیے صحیح طریقہ یہ

تھا کہ وہ حضرت علیؑ کی بات مان لیتے اور اپنا مطالبۂ قصاص عدالت میں پیش کر کے قاتلین پر مقدمہ ثابت کرتے۔ اگر ان لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہوتا اور پھر حضرت علیؑ مجرموں سے بدلہ نہ لیتے تو انہیں کشمکش کرنے کی بھی ضرورت نہ ہوتی، عامہ مسلمین خود ہی حضرت علیؑ کو معزول کر دیتے۔"

(احکام القرآن ج ۴ ص ۱۷۶-۱۷۷)

یہ سب کچھ اس چیز کا نتیجہ تھا کہ امیر شام یہ سولہ سترہ سال ایک ہی صوبے اور بھی جنگی نقطۂ نظر سے انتہائی اہم صوبے کی گورنری پر رکھے گئے اسی وجہ سے شام خلافتِ اسلامیہ کے ایک صوبے کی بہ نسبت ان کی ریاست زیادہ بن گیا تھا۔ حضرت علیؑ کے امیرِ شام کو معزول کرنے کا واقعہ کچھ ایسے انداز میں بیان کیا گیا ہے جس سے پڑھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ وہ تدبر سے بالکل ہی کورے تھے۔ مغیرہ بن شعبہ نے ان کو عقل کی بات بتائی تھی کہ وہ معاویہ کو نہ چھیڑیں مگر انہوں نے اپنی نادانی سے یہ رائے نہ مانی اور حضرت معاویہ کو خواہ مخواہ بھڑکا کر مصیبت مول لے لی۔ حالانکہ واقعات کا جو نقشہ خود انہیں مورخین کی لکھی ہوئی تاریخوں سے ہمارے سامنے آتا ہے اسے دیکھ کر کوئی سیاسی بصیرت رکھنے والا آدمی یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ حضرت علیؑ اگر امیرِ شام کی معزولی کا حکم صادر کرنے میں تاخیر کرتے تو بہت بڑی غلطی ہوتی۔ اس کے اس اقدام سے ابتدا ہی میں یہ بات کھل گئی کہ کس مقام پر کھڑے ہیں۔ زیادہ دیر تک ان کے موقف پر پردہ پڑا رہتا تو یہ دھوکہ کا پردہ ہوتا اور رجوع زیادہ خطرناک ہوتا۔" (خلافت و ملوکیت ص ۱۳۳)

یہ تھے امام حسین علیہ السلام کے بزرگ اب کیا امام حسین علیہ السلام بھلا سکتے تھے اپنے خاندانی خصوصیات اور قدیم روایات کو بقول مولانا ڈاکٹر سید مجتبیٰ حسین صاحب کامونپوری مرحوم:

" حسینؑ جس نسل کی یادگار تھے وہ صدیوں سے

قربانی و فداکاری کی ایک مسلسل تاریخ تیار کر رہی تھی" امام حسین علیہ السلام نے دیکھا نہیں مگر کانوں سے سنتے تو رہے کہ ہمارے مورث اعلیٰ ابراہیمؑ خدا کی رضا کے لیے بیٹے کے ذبح پر تیار ہو گئے۔ ہمارے پردادا عبدالمطلبؓ اپنے بیٹے عبداللہؓ کو قربان گاہِ عبودیت میں پیش کیا۔ ہمارے جدِ بزرگوار ہاشم نے اپنے مال و دولت اور اثر کو ہمیشہ خلق خدا کی خدمت میں صرف کیا، ہمارے خاندان نے مظلوموں کی امداد اور ظالموں سے مقابلہ کا حلف اٹھایا ہے۔ جس کی بہترین مثال معاہدہ حلف الفضول ہے۔ اس لیے اگر خلقِ خدا کسی ظالم کے ہاتھ سے پریشان ہو' ہمارا فرض ہے کہ ہم مظلوموں کی دستگیری کے لیے آگے بڑھ جائیں۔

والدۂ ماجدہ:

حضرت فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا

از: سید حسین مرتضیٰ
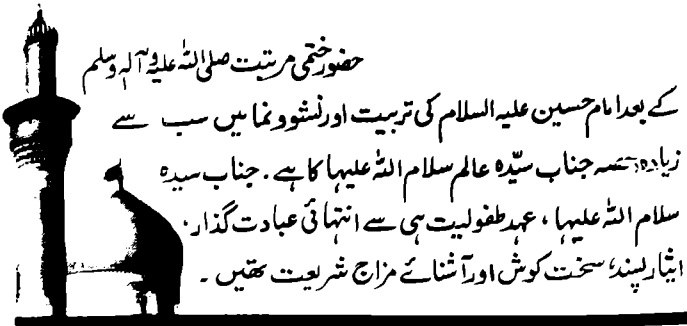
اُنہیں اُم المومنین حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا کی فرزندی کا شرف حاصل تھا اور ان کی تربیت کے ساتھ ساتھ انہیں اپنے والد ماجد حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی جانب سے خصوصی توجہات اور احترامات حاصل تھے اس لیے ان میں معجزانہ خودداری و خدا اعتمادی موجود تھی اور انہیں امام حسین علیہ السلام جیسی اولاد کی پرورش کی تمام تر صلاحیتیں حاصل تھیں۔

حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کی شادی ایسے دَور میں ہوئی جو مسلمانوں کے لئے بہت سختی اور تنگدستی کا زمانہ تھا۔ حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم حضرت علی علیہ السلام اور آپ کے خاندان کے دوسرے افراد نیز مکہ کے مسلمان وطن چھوڑنے پر مجبور ہو چکے تھے اور انتہائی مخدوش حالت میں مدینہ پہنچے تھے۔ ابھی مدینہ کی صورت حال بھی واضح نہیں ہوئی تھی اور مہاجرین اسلام کی آمد سے مدینہ اور اہلِ مدینہ کی معاشی اور معاشرتی زندگیوں میں بھی اچھی خاصی تبدیلی واقع ہو گئی تھی۔ ایسے حالات میں بصیرت وتَدَ بُّن کا تقاضہ یہ تھا کہ حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اپنی اس منفرد اور عظیم خوشی کی تقریب ایسی سادگی اور خاموشی سے انجام دیتے جس سے ہجرت کے باعث مصیبت زدہ اور لُٹے پٹے مسلمانوں اور مدینہ کے تیسرے درجہ کے افراد میں کسی قسم کی گھٹن، بے چینی اور اضطراب بھی نہ پیدا ہو اور ان کو قدم بڑھانے اور اپنے ضروری تقریبات کو سہل طریقہ سے بجالانے کے لیے ایک مناسب راستہ بھی مل جائے۔

یہی وجہ ہے کہ جنابِ سیّدہ سلام اللہ علیہا کے نکاح اور شادی کی ایسی تقریب جس کے لیے فقط ایک باپ کی حیثیت سے آنحضرتؐ کے دل میں نہ جانے کیا کیا ارمان ہوں گے، انتہائی سادگی سے انجام پائی۔ پھر اس پر مستزاد یہ کہ جنابِ سیّدہ

سلام اللہ علیہا آنحضرتؐ کی محبوب ترین زوجہ جناب خدیجہ سلام اللہ علیہا کی منفرد نشانی، آپ (ص) کی اکلوتی صاحبزادی اور اسلام کی محترم ترین خاتون تھیں۔ شادی کے بعد جناب سیدہ سلام اللہ علیہا جب سے اپنے گھر تشریف لائیں اُس وقت سے اپنی حیات مبارک کے آخری لمحات تک جناب سیدہؑ کو ایک لمحہ کے لئے بھی چین و آرام نصیب نہیں ہوا۔

جناب سیدہ سلام اللہ علیہا حضرت علی علیہ السلام کی زوجہ تھیں اس لیے اُن کا گھر ہر لحاظ سے مسلمانوں میں آنحضرتؐ کے گھر کے بعد سب سے زیادہ عظمت و احترام کا حامل تھا۔ لیکن اس گھر کی بود و باش اتنی سادہ اور عجیب تھی جس کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ عالم یہ تھا کہ دونوں حضرات نے گھر کے کام آپس میں تقسیم کر رکھے تھے۔ بازار سے سودا سلف کی فراہمی، پانی لانے اور اس قسم کے گھریلو کام حضرت علی علیہ السلام انجام دیتے تھے۔ اور اندرونی کام مثلاً آٹا پیسنا، کھانا پکانا، جھاڑو برتن اور گھر کی صفائی وغیرہ جیسے کام سیدہؑ کونین سلام اللہ علیہا انجام دیتی تھیں۔

حضرت امام حسین علیہ السلام جناب سیدہ کونین سلام اللہ علیہا کے دوسرے فرزند تھے۔ ان دونوں فرزندوں یعنی امام حسن و امام حسین علیہما السلام کی موجودگی سے گھریلو کاموں میں خاص طور سے زیادہ اضافہ ہوگیا۔ جس کا زیادہ تر بوجھ جناب سیدہ سلام اللہ علیہا پر پڑتا تھا۔ اب انہیں بچوں کی تربیت کا فریضہ، ان کی نظافت کا اہتمام اور گھر کے دوسرے کام بھی سرانجام دینا پڑتے تھے۔ حضرت علی علیہ السلام جہاں عام مسلمانوں کے حالات کو پیش نظر رکھتے تھے وہاں گھر خصوصاً جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کے حالات و ضروریات کا بھی خاص خیال رکھتے تھے، اس لیے اب انہوں نے بیرونی کاموں

کے علاوہ اندرونی کاموں یعنی بچوں کی دیکھ بھال، گھر کی نظافت اور اس جیسے مختلف امور میں بھی جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔ اس کے باوجود جناب سیدہ سلام اللہ علیہا پر کام کا بوجھ اتنا زیادہ تھا کہ وہ انتہائی کمزور ہوگئی تھیں، چکی پیسنے کی وجہ سے ان کے دونوں ہاتھ زخمی اور کھُردرے ہو چکے تھے اور پانی کی مشک اٹھانے کی وجہ سے ان کے بازوؤں اور پشت پر نشان پڑ چکے تھے۔ ایسے حالات میں ایک مرتبہ حضرت علی علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ جائیے، ذرا بابا جان سے ان حالات کا تذکرہ کر کے ایک لونڈی رکھنے کی اجازت لے لیجئے۔ مجھ سے آپ کی تکلیف نہیں دیکھی جا سکتی۔ جناب سیدہ سلام اللہ علیہا اپنے والد ماجد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بنوت کدہ پر تشریف لے گئیں، تو آپ ص کے پاس اصحاب رض حاضر تھے۔ اس لیے انہوں نے آنحضرت ص کو سلام کیا، کچھ دیر گھر میں ٹھیریں اور واپس تشریف لے آئیں۔

آنحضرت ص جناب سیدہ کا خاص خیال رکھتے تھے اور ان کا بے انتہا احترام فرماتے تھے، چونکہ اصحاب رض موجود تھے۔ اس لیے کچھ پوچھ نہیں سکے، لیکن بہت بے چین رہے۔ جیسے ہی اصحاب رض رخصت ہوتے آپ ص اٹھے اور خانۂ زہرا پر تشریف لا کے سلام کیا۔ حضرت علی علیہ السلام استقبال کو بڑھے اور جواب سلام کے ساتھ آپ ص کو خوش آمدید کہا، آنحضرت ص نے تشریف فرما ہوتے ہی جناب سیدہ سلام اللہ علیہا سے اُن کی تشریف آوری کا مدعا پوچھا تو آپ ع نے نظریں جھکا لیں۔ اس لیے حضرت علی علیہ السلام نے خود ہی عرض کی کہ میں نے انہیں آپ ص کی خدمت میں اس لیے بھیجا تھا کہ اب کام اتنا زیادہ ہو چکا ہے کہ ان کو بہت زیادہ تکلیف ہونے لگی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ آپ ص اجازت مرحمت فرما دیں تو ایک ملازمہ رکھ لی جائے تاکہ ان کا ہاتھ بٹ جائے۔

آنحضرتؐ کچھ دیر خاموش رہے۔ غالباً عام مسلمانوں کے حالات کا جائزہ لیا ہوگا، سوچا ہوگا، ابھی مسلمانوں کے حالات اس بات کی اجازت دیتے ہیں یا نہیں کہ میری بیٹی کے لیے ایک ملازمہ رکھی جائے؟ کیا عام طور سے سب مسلمانوں کو ان کی ضرورت کی تمام چیزیں دستیاب ہیں؟ کیا سب مسلمان آرام اور سکھ کی زندگی گذار رہے ہیں؟ اگر نہیں! تو کیا ایسی صورت میں کسی بھی طرح یہ مناسب ہے کہ ان کا سردار اپنی لختِ جگر کو آرام و آسائش کی زندگی بسر کرنے کی اجازت دیدے؟ صرف اسلیے کہ وہ حکمران خانوادہ سے متعلق ہے؟ یا ضرورت اس بات کی ہے کہ اگر وہ ایک ملازم رکھنے کی استطاعت رکھتی ہے۔ اور دوسرے لوگ مصیبت میں گرفتار ہیں تو ملازم رکھنے کے بجائے ان مصیبت زدوں کی فریاد رسی کی جائے؟ وغیرہ وغیرہ۔ اس خاموشی میں آنخضرتؐ نے نہ جانے کیا کیا سوچا ہوگا۔ بہرحال چند لمحوں بعد آنحضرتؐ اپنی صاجزادی سے مخاطب ہوئے اور فرمایا، "لختِ جگر! کیا میں آپ کو ایک ایسا عمل نہ بتادوں جو آپ کے لیے ایک سے زیادہ لونڈیوں کے بجائے کافی ہو!؟"

جناب سیدہ سلام اللہ علیہا مزاج آشنائے نبوت بھی تھیں اور خود فطری طور پر عبادت کی رسیا اور خدا اعتمادی کا پیکر بھی، اسی لیے اتنی تکلیفوں کے باوجود خود ان کی زبان پر نہ کبھی حرفِ شکایت آیا تھا اور نہ ہی انہوں نے خود یہ فرمائش کی تھی۔ چنانچہ آنحضرتؐ کا فقرہ ختم ہوا تو یقیناً انہوں نے یہ فقرہ انتہائی للک کے ساتھ عرض کیا ہوگا کہ:

بابا جان! کیوں نہیں!۔ میرے لیے اس سے بڑھ کر سعادت اور کیا ہوسکتی ہے۔ تب حضورِ ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں مشہور تسبیح جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کی تعلیم دی۔ اور فرمایا کہ سونے سے پہلے ۳۳ مرتبہ "سبحان اللہ"، ۳۳ مرتبہ

"الحمد للہ" اور ۳۴ مرتبہ "اللہ اکبر" پڑھ لیا کرو۔

گویا اس طرح آنحضرتؐ نے یہ تعلیم دی کہ ایک تو ہمارا رہن سہن عام مومن برادری کے رہن سہن کے مطابق ہونا چاہیئے ہے، ہماری آمدنی اور وسائل کے مطابق نہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر خدا پر سچا یقین ہو تو ان عبادات کے ذریعہ ہم اپنی کھوئی ہوئی قوتوں کو اس سے زیادہ بہتر انداز میں دوبارہ مجتمع کر سکتے ہیں۔ جس انداز میں ہم اپنے مادی وسائل کو بروئے کار لاکر یہ کام انجام دیتے ہیں۔

کچھ عرصہ بعد جب مسلمانوں کے حالات بہتر ہوئے تو حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جناب فضہؓ کو جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کی خدمت پر مامور فرما دیا لیکن اس خادمہ کے آنے کے باوجود جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کے معمولات میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ بلکہ انہوں نے گھر کا پروگرام کچھ اس انداز پر مرتب کیا کہ ایک دن جناب فضہؓ خدمت کے فرائض سرانجام دیں اور دوسرے دن جناب سیدہ سلام اللہ علیہا خود کام کریں اور اب بھی ایثار پسندی کے سبب گھریلو زندگی کا عالم یہ تھا کہ جو کچھ ہوتا وہ غرباء میں تقسیم کر دیا جاتا اور گھر کے افراد سوکھے ٹکڑوں پر بسر کرتے۔ جس کی وجہ سے امام حسن وحسین علیہما السلام سخت علیل ہو گئے۔ ایک مرتبہ آں حضرتؐ تشریف لائے اور آپؐ نے بچوں کی یہ حالت دیکھی تو فرمایا کہ صحت کے لئے روزے نذر کرتے ہیں۔ جناب سیدہ سلام اللہ علیہا نے یہ سنا تو فوراً تین روزے نذر کر لئے۔ جب دونوں فرزند صحت یاب ہوئے تو بچوں سمیت گھر کے سب افراد نے روزے رکھے لیکن اتفاق کہ تینوں دن یہی ہوا کہ افطار کے لئے جو کچھ دسترخوان پر رکھا جاتا عین افطار کے وقت کوئی سوالی آجاتا اور سب اپنا اپنا حصہ بخوشی اس سوالی کو پیش کر دیتے اور خود سادہ پانی پر گزارہ کرتے۔ چوتھے دن آنحضرتؐ نے اپنے دونوں

فرزندوں کی یہ حالت ملاحظہ فرمائی کہ بھوک سے تھر تھرا رہے ہیں۔ اور اپنی لختِ جگر کو اس حالت میں دیکھا کہ بھوک اور محنت کی وجہ سے سوکھ کے کانٹا ہو چکی ہیں لیکن محرابِ عبادت میں مشغولِ عبادت ہیں۔ ظاہر ہے یہ دیکھ کر آپؐ کو تکلیف ہوئی ہوگی۔ لیکن غالباً ابھی آپؐ اپنی اس تکلیف کا اظہار بھی نہ کرنے پائے تھے کہ جبرئیل خداوندِ عالم کے سلام رحمت کے ساتھ "سورۂ دہر" لے کر نازل ہوئے اور فرمایا کہ یہ خداوندِ عالم کی طرف سے ان حضرات کے ایثار کا ثمر ہے۔

اس کے علاوہ بھی قرآن حکیم میں بے شمار مقامات پر خاتونِ جنت سلام اللہ علیہا کی عزت و حرمت اور اوصافِ حمیدہ کے حوالے سے خداوندِ عالم نے آپؑ کا تعارف کروایا ہے۔ جس میں سے ایک مقام "آیۂ تطہیر" کے نام سے پہچانا جاتا ہے جس کے متعلق ہم اس مقام پر کچھ تفصیلات اس لئے بیان کرنا چاہتے ہیں کہ ہم آپؑ کی جلیل القدر شخصیت کے مراتب سے آگاہ ہو سکیں اور اس بات پر غور کرنے کی کوشش کریں کہ حکیمِ مطلق نے جناب سلام اللہ علیہا کے تعارف میں جو اہتمام فرمایا ہے اس کے اسباب و علل کیا ہیں ——— !؟

چنانچہ، سورۂ احزاب۳۳ کی تینتیسویں۳۳ آیت میں ارشادِ رب العزت ہے:

"بے شک اللہ جل جلالہٗ نے یہ قطعی ارادہ فرمالیا ہے کہ اے اہل البیتؑ آپ حضرات کو ہمیشہ ہر قسم کی آلائشوں سے دُور رکھے اور آپ سب کو حقیقی معانی و مفہوم میں طہارت و پاکیزگی مرحمت فرمائے۔"

اس آیۂ وافی ہدایہ کے ذیل میں تفسیر و حدیث کے تمام محققین نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ یہ آیت حضور ختمی مرتبت صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور حضرات علی بن ابی طالبؑ و فاطمۃ الزہراؑ و حسن و حسین علیہم السلام کی شان اقدس میں نازل ہوئی ہے۔

کسی محقق اور قابلِ اعتماد شخص نے یہ اختلاف نہیں کیا کہ قرآن حکیم میں اس مقام پر ان پانچ مقدس ہستیوں کے علاوہ کسی اور شخصیت کی طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے بلکہ مُسلم و بخاری، مالک و ابی داؤد اور نسائی جیسے اکابر حدیث نے تو اس آیۂ مبارکہ سے فقط ان ہی پانچ افراد کی تحدید کے سلسلہ میں یہ روایت نقل کی ہے کہ :۔ حضرت اُمِّ سلمہ رضوان اللہ علیہا فرماتی ہیں کہ :۔

"آیۂ تطہیر میرے گھر میں نازل ہوئی تھی۔ میں دروازۂ خانہ کے نزدیک بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے عرض کی : یا رسول اللہؐ! کیا میں اہل البیتؑ میں سے نہیں ہوں ؟

تو آپؐ نے جواب مرحمت فرمایا، تم یقیناً بھلائی پر ہو، لیکن تم ازواج سے ہو"

اور اس وقت گھر میں، آں حضرتؐ ، حضرات علی و فاطمہ و حسن و حسین علیہم السلام تھے۔ آپؐ نے ان حضرات کو اپنی چادر کے نیچے لے لیا اور کہا :

" خداوندا ! یہ میرے اہل بیت ہیں۔ ان سے رجس کو دُور رکھ اور ان کو ایسا پاک فرما دے جیسا کہ پاک فرمانے کا حق ہے۔"

اس آیۂ وافی ہدایہ کے نزول کے واقعہ کو مختلف راویوں نے مختلف انداز سے نقل کیا ہے۔ اور ان روایتوں میں کئی مقامات پر تھوڑا بہت اختلاف بھی پایا جاتا ہے لیکن کسی ایک روایت میں بھی یہ نہیں ملتا کہ اس آیت میں ان پانچ ہستیوں کے علاوہ کوئی اور ہستی بھی شامل تھی۔

اس سلسلہ کی روایتوں میں سب سے مستند اور اہم روایت صاحبِ العوالم کی وہ روایت ہے جسے انہوں نے جلیل القدر صحابی حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضوان اللہ علیہ کے حوالے سے "العوالم" میں نقل کیا ہے اور جابرؓ نے اس روایت میں یہ واقعہ خود سرکار عصمت و طہارت جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کی زبانی ہم تک پہنچایا۔

ہم یہاں یہ روایت مکمل طور پر تو نقل نہیں کر رہے ہیں لیکن موضوع کے حدود میں رہتے ہوئے اس روایت کا وہ حصہ بیان کریں گے جو حدیث قدسی ہے اور جسے سرکار عصمت وطہارت ؑ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے حوالے سے بیان فرمایا ہے۔

اس حصہ کا پس منظر کچھ اس طرح ہے کہ جب آں حضرت ؐ نے اصحاب کساء کے جمع ہو جانے کے بعد بارگاہ ایزدی میں ان کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے ان کے لئے دُعا فرمائی تو پروردگار عالم نے ملائکہ سے ارشاد فرمایا کہ میں نے تمام کائنات اور اس میں جو کچھ ہے صرف اور صرف ان پانچ ہستیوں کی خاطر خلق کی ہے، جو زمین پر اس چادر کے نیچے جمع ہیں۔ اس پر ملائکہ نے ان کے تعارف کا مطالبہ کیا تو رب العزت نے ایک عجیب انداز میں یہ تعارف پیش کیا، ارشاد ہوا:

"هُمْ فَاطِمَةُ وَ أَبُوْهَا وَ بَعْلُهَا وَ بَنُوْهَا"

یہ فاطمہ ؑ ہیں اور ان کے والد ماجد ؐ، ان کے شوہر ؑ ہیں اور ان کے دونوں فرزند ؑ۔

یوں پروردگار عالم نے ملائکہ کی محفل میں سرکار عصمت ؑ طہارت سلام اللہ علیہا کی مرکزیت وبلندیٔ مرتبت کا اعلان فرمادیا۔

ظاہر ہے کہ قرآن حکیم اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس سوال کا جواب نفی ہی میں ملے گا کیونکہ وہ، نوح ؑ کے فرزند کو تنبیہ کرتا ہے کہ اس کے اعمال صالح نہیں ہیں اور زوجۂ لوط کی مذمت فرماتا ہے کہ اس کی حرکتیں منافیٔ ادب تھیں۔ لیکن اس کے برعکس وہ، فرعون کی زوجہ جناب آسیہ کو شرف وبزرگی عطا فرماتا ہے کہ وہ ایمان کے بلند درجوں پر فائز تھیں، اور آذر کے بھتیجے (حضرت ابراہیم علیہ السلام) کو نبوت سے سرفراز کرتا ہے کہ وہ علوم واسرارِ نبوت کی حفاظت اور کارِ رسالت کی انجام دہی کی بہترین صلاحیتوں کے حامل ہیں۔

اس پر مستزاد یہ کہ یہ تمام مراتب اہلبیت کے بعد سخت

اور شدید امتحانوں میں کامیابیوں کی بنیاد پر عطا ہوتے ہیں، تو کیسے ممکن ہے کہ جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کو یہ مراتب امتحان کے بغیر عطا ہوئے ہوں۔

چنانچہ قرآن حکیم کے مزاج آشنا اور دین اسلام کی معرفت رکھنے والے حضرات جانتے ہیں کہ جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کو یہ شرف ان نسلی اور ازدواجی اسباب کی بنا پر عطا نہیں ہوتے تھے بلکہ شدید ہمت شکن امتحانات میں کامیابی کے بعد ہی انہیں آں حضرتؐ جیسے سیّد المرسلین کی لختِ جگر، حضرت علی علیہ السلام جیسے امام کی زوجہ اور حضرات حسنین علیہما السلام جیسے سردارانِ جنت کی والدۂ ماجدہ ہونے کی منزلت عطا ہوئی تھی۔

یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ آپؑ حضور ختمی مرتبت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ دلبند تھیں جنہوں نے اپنے معرفت میں ڈھلے ہوتے اعمال کی بنا پر عصمت وطہارت، زہد وورع، اخلاق وآداب اور صبر وشکیبائی جیسے اعلیٰ انسانی صفات کے بلند درجوں کو حاصل فرما لیا جو آپؑ ہی کا حصہ ہیں۔

نیز، اس گوہرِ رسالت کی علمی منزلت کا عالم یہ تھا کہ خود حضور ختمی مرتبت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپؑ کی تعلیم وتربیت کا فریضہ سرانجام دیا تھا اور آپؑ کی صلاحیتوں کے پیشِ نظر نہ صرف یہ کہ آں حضرتؐ نے آپؑ کو مستقبل کے حالات کا علم تعلیم فرما دیا تھا بلکہ آپؑ کو فنِ حدیث میں "الجامعہ" جیسی مہتم بالشان کتاب بھی املاء کروادی تھی۔

"الجامعہ" کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگانے کی کوشش کیجئے کہ سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زندگی میں قرآن حکیم کے علاوہ فقط دو ہی کتابیں املاء کروائی تھیں جن میں سے ایک "صحیفہ علی علیہ السلام" اور دوسری "الجامعہ" ہے۔

آنحضرتؐ کی رحلت سے قبل عالم یہ تھا کہ
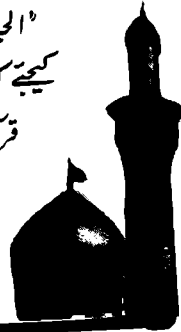
سرکار دوعالم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم آپؑ کے احترامات کا پورا پورا خیال رکھتے تھے۔ آپؑ کو آتا دیکھتے تو سروقد کھڑے ہوجاتے، آپؑ کو بیٹی کے بجائے "جگر گوشۂ رسالت"، "معدنِ نبوت"، اور "ام ابیہا" (اپنے باپ کی ماں) کے القاب سے یاد فرماتے تھے۔

لیکن ـــــــ، ادھر، آں حضرتؐ نے اپنے محبوب حقیقی کی پکار پر لبیک کہی اور ادھر خانوادۂ نبوت و رسالت خصوصاً جناب سیدہ سلام اللہ علیہا پر مصیبتوں کے وہ پہاڑ ٹوٹے کہ آپؑ جیسی صابرہ کو کہنا پڑا ؎

صُبَّتْ عَلَیَّ الْمَصَائِبُ لَوْ اَنَّھَا   صُبَّتْ عَلَی الْاَیَّامِ صِرْنَ لَیَالِیَا

(مجھ پر مصیبتوں کے وہ پہاڑ ٹوٹے ہیں کہ اگر یہ دنوں پر پڑتے تو رات ہوجاتے۔)

مگر ـــــــ! اس سخت تکلیف و پریشانی کے عالم میں بھی جب ایک مرتبہ آپؑ کو مسلمانوں سے خطاب کا موقعہ ملا، تو آپؑ نے علم و عرفان کے موتی لٹانا شروع کردیئے، فرمایا:۔

"...... اے خدا کے بندو! تم خدا کے اوامر و نواہی کو بجالانے کیلئے مقرر ہوئے ہو، اس کا دین اور وحی تمہیں عطا ہوئی ہے۔ تم اپنی جانوں پر اللہ کے امین اور دوسری قوموں کی جانب اس کے مبلغ ہو...... خداوند عالم نے تمہارے لئے ایمان کو شرک سے پاک ہونے، نماز کو تکبر سے بری ہونے، زکوٰۃ کو نفس کی طہارت اور رزق کی زیادتی، روزہ کو خلوص کے استقلال، حج کو دین کے استحکام، عدل کو دلوں کی تنظیم، ہم اہلبیتؑ کی اطاعت کو ملت کے نظام کی درستگی، ہماری امامت کو پھوٹ اور اختلاف سے بچت، جہاد کو اسلام کے لئے عزت اور اہلِ کفر و نفاق کیلئے ذلت، صبر کو حصولِ اجر
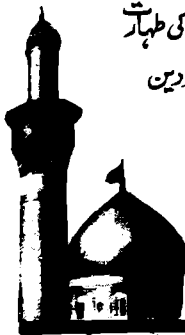
میں معاونت نیز امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو عوام کی اصلاح کا سبب اور ذریعہ قرار دیا۔ والدین کے ساتھ نیکی واجب کی تا کہ تم خداوند عالم کی ناراضگی سے محفوظ رہو۔ عزیز داروں سے تعلقات کی استواری کا حکم اس لئے دیا کہ تمہاری عمریں بڑھتی رہیں' قصاص اس لئے مقرر فرمایا کہ خونریزی رک جائے' نذر پوری کرنے کا حکم اس لئے دیا کہ وہ چاہتا ہے کہ اپنے بندوں کو بخش دے' پیمانہ اور اوزان کو پورا کرنے کا حکم نحوست دور کرنے کے لئے دیا، شراب پینے سے اس لئے روکا کہ لوگ برے اخلاق سے محفوظ رہیں، زنا کا بہتان لگانے سے اس لئے روکا کہ لعنت کے سامنے ایک رکاوٹ پیدا ہو جائے اور چوری کی ممانعت اس لئے کی کہ لوگ دوسروں کے مال میں اجازت کے بغیر تصرف نہ کریں۔ نیز اللہ تبارک و تعالیٰ نے شرک کو حرام قرار دیا تا کہ اس کی ربوبیت خالص رہے۔ اس لئے خداوند عالم سے ایسا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ تقویٰ اختیار کرنے کا حق ہے اور کوشش کرو کہ جب مرو تو مسلمان مرو۔

چنانچہ اللہ عزّوجل کے اوامر و نواہی میں اس کی اطاعت کرو' لوگو! جان لو کہ میں "فاطمہ" ہوں اور میرے والد "محمد" (مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) ہیں۔ میں تم سے وہی بات کہتی رہوں گی جو پہلے سے کہتی آئی ہوں اور میں کوئی غلط بات نہیں کہہ رہی ہوں اور میں جو کچھ کر رہی ہوں اس میں حدود سے تجاوز نہیں ہے۔

'یقیناً تمہارے پاس تمہیں لوگوں میں سے ایک رسول مبعوث ہوا، جس پر تمہاری تکلیف بہت

گراں ہے، اسے تمہاری فلاح و بہبود کا ہوکا ہے اور وہ مومنین کے لئے حد درجہ شفیق و مہربان ہے۔ (سورۂ توبہ آیت ۱۲۸)

تو، اگر تم اس رسولؐ کی جانب نسبت دو، اور ان کا تعارف کراؤ تو تم انہیں میرا باپ پاؤ گے نہ کہ اپنی عورتوں کا۔ اور میرے چچازاد (حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام) کا بھائی پاؤ گے، نہ کہ اپنے مردوں میں سے کسی کا۔ اور آں حضرتؐ ان لوگوں میں بہترین ہستی ہیں جن کی جانب نسبت باعثِ شرف ہوتی ہے....

تو جب خداوند عالم نے اپنے پیغمبر کے لئے گزشتہ انبیاء کے گھر اور اپنے برگزیدہ بندوں کے ٹھکانے کو پسند کر لیا تو تم لوگوں میں چھپی ہوئی دشمنی ظاہر ہوگئی۔ دین کی چادر بوسیدہ ہوگئی، خاموش گمراہوں کی زبان کھل گئی، چھپے ہوتے ذلیل لوگ اُبھر آئے، باطل پرستوں کا بندھا ہوا اُونٹ بولنے لگا اور اُس نے تمہارے صحنوں میں دُم ہلانا شروع کر دی، نیز شیطان نے اپنی کمین گاہ سے سر نکالا اور تمہیں آواز دی۔ اور اس نے تمہیں اس طرح موہ لیا کہ تم نے اس کی آواز پر لبیک کہا اور اس سلسلہ میں اس کے دھوکہ پر اعتماد کر لیا۔ پھر اس نے تم کو اپنی فرماں برداری کے لئے اُٹھنے کا حکم دیا تو تمہیں فوراً تیار ہونے والا پایا، اور تمہیں بھڑکایا، تو اپنی مدد میں تمہیں بہت تیز رفتار پایا، پھر تم نے اپنے اونٹ کے بدلے دوسرے کے اونٹ کو داغا اور اپنا گھاٹ چھوڑ کر دوسرے کے گھاٹ پر پانی پیا۔ حالانکہ ابھی تم سے رسول کے عہد و پیمان کا وقت قریب، ان کا کلام واضح اور ان کی جدائی کا زخم مندمل نہیں ہوا تھا....''

(توفیق أبوعلم، اہل البیت (علیہم السلام) مصر ۱۳۹۰ھ ص ۱۵۸-۱۶۱)

جناب سیّدہ سلام اللہ علیہا کے اس خطبہ سے ان کے مزاج کا علم حاصل ہوتا ہے اور واضح طور پر یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ ان کی زندگی کتنی باوقار، مجاہدانہ اور انقلابی تھی اور ان میں کس قدر قائدانہ صلاحیتیں موجود تھیں۔

بہرحال اس طرح کی زندگی بسر کرتے ہوئے جناب سیّدہ سلام اللہ علیہا نے امام حسین علیہ السلام کی فکری نشوونما اور ان کی صلاحیتوں کو اجاگر فرمایا اور ۳ رجمادی الثانی ۱۱ھ کو مدینہ میں رحلت فرما کر جنت البقیع میں دفن ہوئیں۔
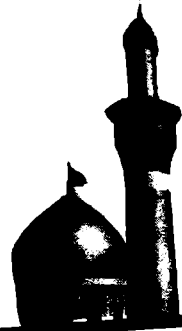
سبطِ اکبر:

حضرت امام حسن علیہ السلام

از: سید حسین مرتضیٰ
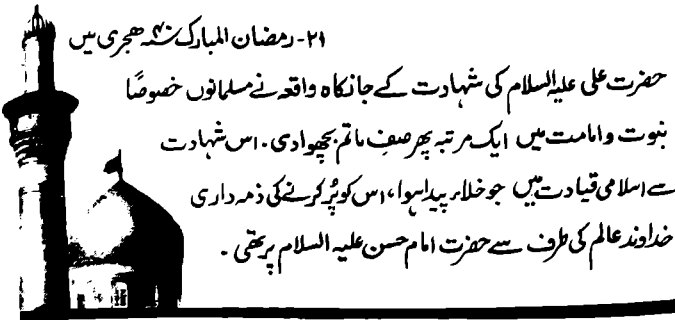
جمہور مسلمین بھی جانتے تھے کہ اس عظیم الشان منصب سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت امام حسن علیہ السلام کے علاوہ کسی اور میں نہیں ہے۔ اس لیے فوراً ہی تمام مسلمان زعماء و علماء نے جمع ہو کر اس بات پر اجماع کیا اور مسجد کوفہ میں عام بیعت کر لی گئی۔ یوں امام حسن علیہ السلام اپنے والد گرامی کی جانشینی میں اصلاح امت کے لیے آگے بڑھے۔ اب بھی امام حسین علیہ السلام ان کے قوتِ بازو اور تمام معاملات میں اسی طرح ان کے دست راست تھے جس طرح یہ دونوں بھائی حضرت علی علیہ السلام کی حیات طیبہ میں ان کے معاون و مددگار تھے۔ ظاہر ہے امام حسن علیہ السلام نے امام حسین علیہ السلام کو ملکی اور ملی معاملات میں براہِ راست شریک کیا ہوگا، کیونکہ ایک تو یہ بات خاندانی روایت میں داخل تھی، دوسرے امام حسین علیہ السلام ہی ان کے سب سے معتمد ساتھی تھے، پھر سب سے بڑھ کے یہ کہ انہیں معلوم تھا کہ میرے بعد اُمت کی امامت کے فرائض ان ہی کو سرانجام دینا ہیں۔ اس لیے میرے عہد میں یہ جتنے زیادہ تجربات حاصل کر لیں، رموزِ امامت کو سمجھنے میں انہیں اتنی ہی آسانی ہو گی۔

اس لیے جب آغاز امامت میں امام حسن علیہ السلام نے مسلمانوں کے اصرار اور حالات کے تقاضوں کے طور پر امیر شام کے خلاف لشکر کشی کی تیاری فرمائی تو اس میں امام حسین علیہ السلام کا مشورہ شامل رہا، اور اس لشکر کی تنظیم و ترتیب امام حسین علیہ السلام کی نگرانی میں انجام پائی۔

ادھر امام حسن علیہ السلام نے لشکر کی تیاری اور امیر شام سے مقابلہ کا انتظام و انصرام شروع کیا اور ادھر امیر شام نئے سرے سے چوکنے ہو گئے۔

انہوں نے حالات کا مکمل جائزہ لیا اور امام حسن علیہ السلام سے جنگ کو اپنے لیے کسی صورت بھی مناسب نہیں سمجھا۔ دوسری طرف انہیں صلح کا وہی عیارانہ منصوبہ ایک مرتبہ پھر یاد آیا جس نے

صفین جیسی ہولناک جنگ کے خوفناک نتائج سے انہیں مامون کردیا تھا۔ لیکن اس مرتبہ انہوں نے گذشتہ تجربہ کی روشنی میں زیادہ بہتر انداز اختیار کیا۔ اور براہِ راست صلح کی درخواست کردی۔

امیرِ شام کی اس درخواست کے بعد صورت حال بالکل بدل گئی تھی۔ اب تک صورت حال یہ تھی کہ امیرِ شام حضرت علی علیہ السلام کو خلیفہ تسلیم کرنے سے انکار کررہے تھے۔ اُن کے احکام سے سرتابی کررہے تھے اور اُن کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیے ہوئے تھا۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں ان کے خلاف جنگ واجب تھی۔ لیکن اب صورت یہ ہوگئی کہ انہوں نے اپنی طرف سے صلح کی پیشکش کردی تھی۔

اب امام المومنین اور خلیفۃ المسلمین کی حیثیت سے امام حسن علیہ السلام کے سامنے دو صورتیں تھیں۔ ایک یہ کہ آپ اس درخواست کو رد کردیتے اور جس حملہ کی تیاری کرچکے تھے اس پر روانہ ہوجاتے۔ دوسرے یہ کہ آپ اس درخواست کو قبول کرکے ایک طرف عالمِ انسانیت کو ایک زبردست خونریزی سے بچالیتے اور دوسری طرف معاویہ کو ایک اور موقعہ دیتے کہ وہ اس درخواست کی قبولیت کے بعد یا تو ایفائے عہد کرکے اپنی اصلاح کریں یا مزید عہد شکنی کرکے عام مسلمانوں کے سامنے اپنے عیوب کو اور اچھی طرح واضح کردیں۔

اگرچہ امام حسن علیہ السلام پہلی صورت کو اختیار فرماتے تب بھی بظاہر شرعی لحاظ سے کوئی سقم اور پیچیدگی نظر نہیں آتی۔ کیونکہ امیرِ شام کی مسلسل عہد شکنی کی وجہ سے بظاہر حالات اسی قابل تھے کہ ان کی توبہ کو قبول نہ کیا جائے۔

اس صورت میں قرآن حکیم کی یہ آیت امام حسن علیہ السلام ہی کی تائید فرماتی:

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ البقرۃ ۔ آیۃ ۱۷۹

(اے صاحبانِ عقل و خرد! تمہارے لیے قصاص میں زندگی کا راز پنہاں ہے۔ شاید اسی طرح تم تقویٰ اختیار کرلو)

اور اگر امام حسن علیہ السلام دوسری صورت اختیار فرماتے تو ہر صاحب عقل وخرد کے نزدیک یہی صورت مناسب تر اور شجاعت وشہامت، حلم وعلم اور ایمان والیقان کی مظہر اور فتح مبین کی دلیل تھی۔ پھر یہ بات خلّاق کائنات کے مزاج سے زیادہ قریب، اس کی مزید قربت کا سبب اور اس کی محبوبیت کی ایک اور دلیل تھی۔ اور اسطرح شرعی اور سیاسی لحاظ سے امام حسن علیہ السلام کی حیثیت مزید مستحکم اور مضبوط ہوتی تھی۔

اس صورت حال کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد ہے:

فَبِمَا نَقْضِهِم مِّيثَاقَهُمْ لَعَنَّاهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ قَاسِيَةً ۖ يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَن مَّوَاضِعِهِ ۙ وَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلَىٰ خَائِنَةٍ مِّنْهُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ۝ (المآئدہ آیت ۱۳)

"ان کی مسلسل عہد شکنی کے سبب ہم نے نہ صرف یہ کہ ان پر لعنت کی ہے بلکہ ان کے دلوں کو بھی سخت بنا دیا ہے، (یہ سزا انہیں اس لیے دی گئی ہے کہ یہ لوگ) الفاظ (اور ان کے مفاہیم) میں اُلٹ پھیر کرتے ہیں اور انہیں جن باتوں کی نصیحت کی جاتی ہے ان میں سے اکثر کو بھلا دیتے ہیں اور اے رسول! آپ تو آئے دن ان میں سے چند کے علاوہ کسی نہ کسی کی خیانت پر تو مطلع ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اس لیے آپ ان کو معاف ہی کر دیجئے اور ان کے سلسلہ میں درگذر ہی سے کام لیجیے، کیونکہ بلاشبہ خدا احسان کرنے والوں سے محبت فرماتا ہے۔"

غالباً اسی بنا پر امام حسن علیہ السلام نے شجاعت وشہامت، عفو وکرم، جود واحسان اور فتح ونصرت کا راستہ اختیار فرمایا۔ اور ایک با اعتماد حکمران اور مقتدر امام کی حیثیت سے امیر شام

کی درخواستِ صلح منظور فرما کے سفارتی ردّوبدل اور گفت گو کے بعد ایک صلح نامہ پر اپنی رضامندی کا اظہار فرمادیا تاکہ امت فتنہ وفساد سے مامون رہے اور دین کو استحکام حاصل ہو۔ (محقق وحید شیخ راضی آل یٰسین رحمۃ اللہ) نے اپنی مشہور کتاب صلح الحسن علیہ السلام کے صفحات ۲۵۹-۲۶۱ پر اس کا جو تحقیقی متن تحریر فرمایا ہے اس کے مطابق یہ عہدنامہ کچھ اس طرح تھا:

۱۔ معاویہ کو اس شرط پر سلطنت کا منتظم قرار دیا جاتا ہے کہ وہ کتابِ خدا، سنت نبوی اور صالح حکمرانوں کی سیرۃ پر عمل کا پابند رہے۔

۲۔ یہ کہ معاویہ کے بعد تمام انتظامات (امام) حسن (علیہ السلام) کا حق ہوں گے، اور اگر اس وقت تک وہ نہ رہے تو یہ تمام انتظامات (امام) حسین (علیہ السلام) کا حق ہوں گے اور معاویہ کو کسی طرح یہ حق نہیں ہوگا کہ وہ یہ انتظامات اپنے طور پر کسی اور کے سپرد کرے۔

۳: یہ کہ (معاویہ اپنے دائرۂ اقتدار میں) امیرالمومنین علیہ السلام پر سب وشتم اور نماز کی قنوت میں ان کے خلاف دعا کو ترک کر دے اور حضرت علی علیہ السلام کو اچھائی کے علاوہ اور کسی طریقہ سے یاد نہ کرے۔

۴۔ یہ کہ کوفہ کے بیت المال میں جو پچاس لاکھ درہم ہیں ان پر معاویہ کا کوئی حق نہیں ہوگا۔ اور معاویہ کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ (امام) حسین (علیہ السلام) کو دس لاکھ درہم سالانہ ادا کرے۔ نیز مالی تقسیم اور نماز کے سلسلہ میں بنی ہاشم کو بنی عبد شمس پر فوقیت حاصل رہے گی، اور دارابجرد کے خراج میں دس لاکھ درہم ان مقتولین کی اولاد میں تقسیم کرنا ہوں گے جو جمل وصفین کی جنگوں میں امیرالمومنین حضرت علی بن ابی طالب

علیہ السلام کا ساتھ دیتے ہوئے شہید ہوئے۔

۵۔ا۔یہ کہ زمین خدا پر شام و عراق و حجاز و یمن وغیرہ میں جہاں جہاں لوگ بستے ہیں وہ امن میں رہیں گے، نیز سیاہ فام و سفید فام لوگ بھی مامون رہیں گے۔ معاویہ ان کی نادانیوں پر گرفت نہیں کرے گا۔ کسی کے ماضی کے سلسلہ میں اس پر کوئی گرفت نہیں ہوگی۔ اور اہل عراق سے کینہ نہیں نکالا جائے گا۔

ب۔ نیز اصحاب علی جہاں کہیں بھی رہیں، مامون رہیں گے، اور شیعان علی کو کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچنے دی جائے گی۔ نیز اصحاب علی اور شیعیان حیدر کرار کی جان و مال، آل اولاد محفوظ و مامون ہوگی اور ان پر کسی معاملہ میں کسی قسم کی گرفت نہیں کی جائے گی، نہ ہی ان میں کسی کے ساتھ بُرا برتاؤ کیا جائے گا، ان کے ہر حقدار کو اس کا حق پہنچایا جائے گا۔

ج۔ نیز معاویہ اس بات کا بھی پابند ہوگا کہ وہ (حضرت) حسن بن علی اور ان کے بھائی (امام) حسین (علیہما السلام) اور اہل بیت علیہم السلام میں سے کسی بھی شخص کے خلاف خفیہ یا علانیہ کسی بھی طور سے بغاوت نہیں کرے گا اور دنیا جہان میں وہ جہاں کہیں بھی ہوں اُن کو خوفزدہ نہیں کریگا۔

یہ قرارداد صحیح ترین روایت کے مطابق ۱۵ جمادی الاول ۴۱ھ کو طے پا گئی۔ ہر صاحب بصیرت شخص پر اس معاہدہ کے مطالعہ سے کئی اہم گوشے واضح ہو سکتے ہیں۔ اس کا متن واضح طور پر یہ بات ثابت کر رہا ہے کہ یہ عبارت تحریر کرنے والی شخصیت ذہنی اور عملی طور پر مکمل اقتدار کی حامل ہے اور وہ یہ معاہدہ پورے اعتماد کے ساتھ مکمل فاتحانہ انداز میں اسطرح طے فرما رہی ہے کہ اس میں کسی مقام پر کوئی جھول یا لچک نہیں پائی جاتی، اور اس کا کوئی لفظ فریق کے لیے کسی طرح سے حیلہ جوئی کا راستہ بناتے

ہوتے نظر نہیں آتا۔ نیز عہد نامہ کی دوسری اور چوتھی شق اور پانچویں شق کا آخری پیراگراف واضح طور پر اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ فریقین نے اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ فریق ثانی یعنی امیرِ شام کو حکمرانی نہیں بلکہ صرف گورنری یا مملکت کا نظم و نسق دیا جا رہا ہے، جس کے سلسلہ میں بھی ان کے اختیارات محدود ہیں، کیونکہ اگر حکومت ان کے سپرد کی گئی ہوتی تو کسی قانون یا شرط کی رو سے اپنے بعد کسی کو جانشین مقرر کرنے سے روکنا اور اس کے بعد ان تمام انتظامات کو امام حسن علیہ السلام یا ان کی عدم موجودگی میں امام حسین علیہ السلام کا حق قرار دینا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا اور اگر اس نکتہ کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تب بھی پانچویں شق کا آخری پیراگراف اس سے زیادہ واضح ہے جس میں امیرِ شام نے اس بات کی پابندی قبول کی ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ اس عہد نامہ پر رضامند ہونے اور انتظامات سنبھالنے کے بعد خلیفۂ مسلمین اور امام المومنین حضرت امام حسن علیہ السلام کے احکام سے سرتابی اور ان کے خلاف بغاوت نہیں کریں گے بلکہ وہ ان کی موجودگی میں بھی امام حسین علیہ السلام اور خاندان اہلِ بیت کے تمام سربرآوردہ افراد کے مطیع و فرمانبردار بن کر رہیں گے، ان سے بغاوت کے مرتکب نہیں ہوں گے۔

ظاہر ہے کہ دب کر کی جانیوالی صلح کے شرائط یہ نہیں ہوا کرتے بلکہ یہ قرارداد ایک حاکم اعلیٰ کی جانب سے اس کے ایک ایسے ماتحت حکمران کے نام ایک ایسے عہد نامہ کے مصداق ہے، جسے اول الذکر اپنے دائرہ اقتدار میں رکھتے ہوئے کچھ خاص قسم کے اختیارات سپرد کر رہا ہو۔

امیرِ شام کی طرف سے اس صلح نامہ پر رضامندی واضح طور پر اس بات کی دلیل ہے کہ معاویہ نے اس پابندی کو قبول کر کے نہ صرف یہ کہ اصولی اور عملی طور پر اپنی دائمی شکست تسلیم کر لی ہے بلکہ اس شکست کے ساتھ انہوں نے امام حسن علیہ السلام کے

دائمی اقتدار کو تسلیم کر کے ان کی باجگذاری بھی قبول کی ہے۔ اور جمل و صفین میں بھی اپنی شکست کا اعتراف کر کے تاوانِ جنگ کی ادائیگی کا اقرار کر لیا ہے۔
چنانچہ چوتھی شق کا ایک مرتبہ پھر غور سے مطالعہ فرمایئے۔ جس میں ہے کہ:

"کوفہ کے بیت المال میں جو پچاس لاکھ درہم ہیں ان پر معاویہ کا کوئی حق نہیں ہوگا۔ نیز معاویہ (امام) حسن (علیہ السلام) کو دس لاکھ درہم سالانہ ادا کرنے، مالی تقسیم اور نماز کے سلسلے میں بنی ہاشم کو بنی شمس پر فوقیت دینے اور حضرت علی علیہ السلام کا ساتھ دیتے ہوئے جنگِ جمل اور جنگ صفین میں شہید ہونے والوں کے ورثاء کو ابجرد کے خراج میں سے دس لاکھ درہم تقسیم کرنے کے پابند ہوں گے۔"

اس قرارداد کے بعد امام حسن علیہ السلام کا اقتدار اور بھی مستحکم ہو گیا تھا، اور اگرچہ ان کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا تھا لیکن عملی طور پر ان کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا کیونکہ اب مملکت کا انتظام و انصرام اور حفاظت و دفاع امیرِ شام کی ذمہ داری تھی اور ان معاملات میں کسی بھی کوتاہی پر امام حسن علیہ السلام اس کی پوری گرفت کر سکتے تھے۔ لیکن چونکہ امام حسن علیہ السلام کو اپنی حقانیت پر یقین اور خداوندِ عالم کی نصرت و امداد پر بے پناہ اعتماد تھا اس لیے امیرِ شام کی طرف سے اقرار و تعہد کے بعد اس کی جانب سے ہونے والی مختلف خلاف ورزیوں کو نظر انداز کرتے رہے اور اگرچہ وہ اس عہدنامہ کے بعد تقریباً ۹ سال مزید زندہ رہے اور اس نو سال کے طولانی عرصہ میں امیرِ شام نے خود ان کی ذات اقدس کے خلاف عجیب عجیب طرز کے پروپیگنڈے کیے لیکن امام حسن علیہ السلام خاموش رہے اور انہوں نے اس پر کوئی گرفت نہیں کی۔ اس تمام مدت میں لازمی طور پر انہیں امام حسین علیہ السلام کے مشورے اور ان کی مکمل تائید و حمایت حاصل رہی۔

اس نوسال کے عرصہ میں جو بہت سے تکلیف دہ واقعات پیش آئے، ان میں سب سے زیادہ شرمناک اور غالباً خاندان اہلِ بیت علیہم السلام کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ واقعہ سرکاری سطح پر حضرت علی علیہ السلام پر سب وشتم کا جاری رہنا اور اس کے ساتھ ساتھ امام حسن علیہ السلام کے خلاف من گھڑت اور بے بنیاد پروپیگنڈا تھا جس میں انہیں بہت زیادہ شادیاں کرنے اور بہت زیادہ طلاق دینے والا بنایا گیا تھا۔ اس مسئلہ پر یوں تو بہت سے محققین نے تحقیق کا حق ادا کیا ہے لیکن اس وقت ہمارے سامنے مصر کے ایک سُلجھے ہوئے محقق جناب توفیق ابوعلم کی کتاب اہل البیت (علیہم السلام) ہے جس میں صفحہ ۲۷۷ سے ۲۸۲ تک موصوف نے اس مسئلہ پر کافی دقت نظر کے ساتھ اپنے تحقیقات کا نچوڑ انتہائی مدلل انداز میں محکم شواہد کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ہمارے الفاظ میں ان کی اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ:

"امام حسن علیہ السلام نے اپنی پوری حیات اقدس میں صرف پندرہ شادیاں کیں جن میں سے صرف تین کو طلاق دی اور باقی اپنے انتقال تک امام علیہ السلام ہی کے ساتھ رہیں۔
ان کا کہنا ہے کہ یہ الزام قطعاً بے بنیاد ہے اور تاریخ سے کسی صورت میں بھی پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچایا جا سکتا، کیونکہ تاریخ میں لاتعداد فرضی بیویوں کے نام نہیں ملتے اور پھر یہ الزام مدائنی اور اس جیسے ان مورخین کے مجرد اقوال پر مبنی ہے جو حکومت کے زیر اثر ہے اور یہ مجرد اقوال ہی ہیں، تاریخ نہیں ہیں۔"

ممکن ہے کہ اگر یہ تحقیقات جاری رہیں اور اس سلسلہ میں مزید احتیاط اور چھان پھٹک سے کام لیا جائے تو ایک موڑ پر

پہنچنے کے بعد یہ بھی ثابت ہو جائے کہ تین بیویوں کو بھی طلاق دینے کا واقعہ افسانہ اور غیر محققانہ بات ہے کیونکہ امام حسن علیہ السلام سے یہ بات بظاہر حالات بعید معلوم ہوتی ہے کہ وہ " ابغض الحلال عنداللہ " کو عملی صورت دیں۔ اگرچہ یہ عمل ان کی شانِ اقدس کے خلاف یا مزاجِ شریعت کے منافی نہیں ہے۔

بہرحال، ان تکلیف دہ حالات میں امام حسن علیہ السلام نے ۲۱ رمضان المبارک ۴۰ھ ہجری سے ۲۸ صفر ۵۰ھ ہجری تک نو سال اور چند ماہ اپنی امامت کے فرائض ادا کئے اور مستند مورخین کے بقول موخر الذکر تاریخ کو امام حسین علیہ السلام نے اسرارِ امامت ودیعت کر کے جعدہ بنت اشعث کے ذریعہ امیرِ شام کے دلوائے ہوئے زہر سے جامِ شہادت نوش فرمالیا۔

اس سب سے زیادہ تجرباتی دور میں امام حسین علیہ السلام نے اپنے برادر بزرگوار کی سرپرستی میں اپنی تجرباتی زندگی کے آخری مراحل طے فرمائے اور اپنے آپ کو پورے طور پر براہِ راست امت کی سربراہی کے لیے تیار کر لیا اور اب آپ کی امامت کے دور کا آغاز عمل میں آگیا۔
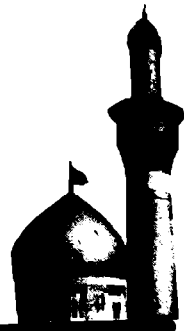
دوسرا حصّہ

ولادت سے امامت تک۔!

امام حسین علیہ السلام ۳۔ ھجری کو
پیدا ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمان غزوۂ بدر میں عظیم الشان فتح
حاصل کر چکے تھے۔ چونکہ گذشتہ صفحات میں آپ امام حسین علیہ السلام
کے آبا و اجداد اور ان کے طرزِ فکر و عمل کا تعارف حاصل کر چکے
ہیں اس لیے اس باب میں امام حسین علیہ السلام کی زندگی کے

پہلے حصہ یعنی ولادت سے امامت تک کے دور پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ امام حسین علیہ السلام کی امامت کے آغاز سے کربلا تک کے دور کا مطالعہ میں نے "کربلا" کے عنوان سے کتاب کے تیسرے حصّہ کے لیے منتخب کیا ہے امام حسین علیہ السلام کی زندگی کے اس سینتالیس سالہ دور کا مطالعہ بھی میں اُن کے اس روحانی اور سیاسی ماحول کے حوالے سے کرنا ضروری سمجھتا ہوں جس میں امام حسین علیہ نے پرورش پائی اور اپنی فکری اور عملی صلاحیتوں میں کمال پیدا کیا تاکہ کربلا کا مزاج اور مقصد پوری طرح سامنے آجائے۔

اس مقصد کے لیے میں نے اس باب کو دو حصوں میں منقسم کیا ہے جو:

۱۔ روحانی ماحول

اور ۲۔ سیاسی ماحول

روحانی ماحول ، روحانی ماحول کے سلسلہ میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ امام حسین علیہ السلام کی تربیت کے موضوع پر محققِ وحید حاج سیّد مرتضیٰ حسین صاحب قبلہ صدرالافاضل مدظلہ العالی کا ایک مقالہ ناظرین کے سامنے پیش کردیا جائے کہ اس سے موضوع کو سمجھنے میں کافی مدد ملے گی، ہم اس مقالہ کی ترسیل کے سلسلہ میں بصمیم قلب علامہ موصوف کے شکرگذار ہیں۔
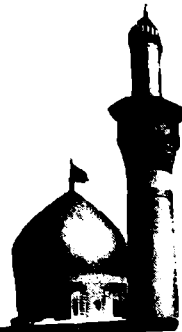
امام حسین علیہ السلام کی تربیت

از: محققِ وحید علامہ حاج سید مُرتضیٰ حسین صاحب
صدر الافاضل مدظلہ العالی
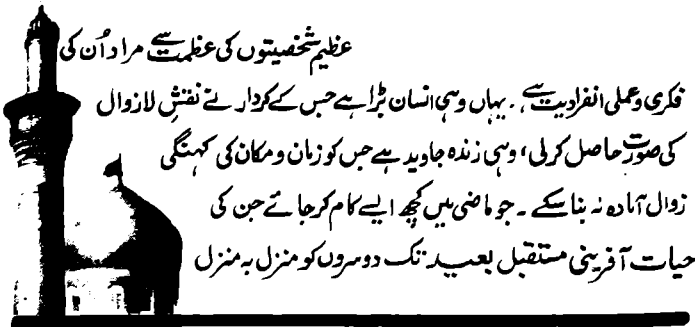
آگے بڑھاتی ہے۔ ایسی شخصیتیں دو طرح کی ہیں قائد قوم وملت اور ہادی دنیا و دین ۔ ہم اس مختصر وقفے میں دین و دنیا کے عظیم رہنما اور امام کے تربیتی دور کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔

آپ جانتے ہیں کہ مثالی عظمتیں بنانے سے نہیں بنتیں۔ یہ خدا کی دین ہے اور غیبی انعام اگر شخصیت شناسی کے اصول کسی بچے کو عظیم بنانے کے لیے کار آمد ہوتے تو لاکھوں خاندانوں میں ہزاروں عظیم افراد جنم لیا کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ "دیدہ ور" انسان خدا کی دی ہوئی بصیرتوں اور ذاتی جوہر کو خود صیقل کرنے سے بنا کرتے ہیں۔

عبقریت، قد آور شخصیتوں کی ناپ سے نہیں حاصل ہوتی بلکہ قد آور شخصیتیں اپنی ذہانت سے اُبھرتی ہیں۔ ان کی منفرد خصوصیتیں آہستہ آہستہ لوگوں پر اپنی عظمت کے نقش بٹھاتی ہیں اور دنیا پر چھا جاتی ہیں۔ امام حسین علیہ السلام مثالی عظمت کے مالک تھے وہ عبقریت کے انتہائی درجہ کے مالک تھے۔ حد یہ کہ امام تھے، ضامن اسلام اور ہادی امت تھے ان کے بارے میں یہ چھان بین کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے روک روک کر، ٹوک ٹوک کر انہیں سکھایا، یا ان کے شعور و تحت الشعور کو اعلیٰ نفسیاتی اصول تعلیم کی روشنی میں اٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے اور دوسرے فکری و عملی پہلوؤں کو استوار کیا۔ میرے خیال میں کوئی نتیجہ خیز کوشش نہیں۔ امام حسین علیہ السلام جس منصب کے لیے خلق ہوئے تھے اس کی بنا پر جبلی قوتوں سے بھی آراستہ ہو کر آئے تھے۔ ان قوتوں کو نمایاں کرنے کے لیے انہیں خاص ماحول دیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حرم سرا میں متعدد گودیں نومولود کی منتظر رہیں لیکن خدا نے حضرت اُم المومنین خدیجہؑ کو سیدہ کونین فاطمہ زہراؑ کے وجود سے آراستہ کیا۔ پھر سیدہ کونینؑ کے لئے حضرت امیر المومنین

علیہ السلام کا انتخاب ہوا۔ حضرت علیؑ کی متعدد اولادیں متعدد ازدواج سے پیدا ہوئیں مگر حسنؑ و حسینؑ جیسے سردارِ جنت سیدہ کونینؑ کی آغوش میں آئے، پھر انہیں رسول اللہ علیہ و آلہ وسلم کی صورت و سیرت ملی، دونوں کو امامت سے سرفرازی حاصل ہوئی امام حسنؑ کو رسولؐ کی صباحت جمال عطا ہوئی لوگ دیکھ کر کہتے تھے، بالائی خدوخال، چہرۂ انور، سینہ اقدس نانا کا آئینہ تھا اور امام حسینؑ کو "منی" کہہ کر کمال عروج بخشا گیا۔ اسی کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے،

این سعادت بزورِ بازو نیست — تانہ بخشد خدائے بخشندہ

زمانہ تربیت میں عظمت کے مظاہرے قرآن مجید کی روشنی میں

اللہ کی عطا اور رسول مقبولؐ کی رضا اور امام حسینؑ کی عظمت ہمیں اس وقت نظر آتی ہے، جب گھر کے لوگ تین روزے نذر کرتے ہیں اور امام حسنؑ اور امام حسینؑ بھی روزے رکھتے ہیں، افطار کے وقت مسکین صدا دیتا ہے۔ گھر کے بزرگ افطار کا سامان یعنی دسترخوان کا کھانا اٹھا کر سائل کو عطا کرتے ہیں ان کے ساتھ بغیر کسی چشم نمائی، بغیر کسی اشارے کے بیماری سے اٹھے ہوئے بچے بھی اپنا کھانا راہِ خدا میں پیش کر کے پانی سے روزہ کھولتے اور دوسرے دن صبح سے پہلے پھر نیت کر لیتے ہیں، یہ واقعہ تین دن ہوا، اس کے بعد خداوندِ عالم نے اس ایثار و کرم، خلوص و عمل و حسنِ کردار کی تعریف فرمائی اور آیتیں اتریں۔

يُوفُونَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُونَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا ۝
وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ۝
إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا ۝
إِنَّا نَخَافُ مِن رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوسًا قَمْطَرِيرًا ۝ فَوَقَاهُمُ اللَّهُ
شَرَّ ذَٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقَّاهُمْ نَضْرَةً وَسُرُورًا ۝

(سورۃ دہر آیات ۷۔۱۱)

"نذر پوری کرتے ہیں اور اُس دن سے ڈرتے ہیں جس دن کی سختی ہر طرف پھیلی ہوئی ہوگی، اور اس کی محبت میں محتاج و یتیم اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں' (اور کہتے ہیں) ہم تو صرف تمہیں خوشنودی اللہ کے لیے کھلاتے ہیں' ہم نہ تم سے بدلہ چاہتے نہ شکرگذاری، ہم کو اپنے پروردگار سے اس دن کا ڈر ہے جس دن چہرے بگڑ جائیں گے اور منہ پر ہوائیاں اڑتی ہوں گی، تو اللہ نے انہیں اس دن کی سختی سے بچالیا اور انہیں چہرے کی شادابی اور دلی مسرت عطا کی۔"

مدح و ثنا کی اس تفصیل میں چھوٹے بڑے سب شامل ہیں' علی و فاطمہ حسنؑ و حسین علیہم السلام میں سے دو کو الگ کر کے یہ نہیں فرمایا کہ دو شخص یہ سب کچھ کرتے ہیں اور ان کے ننھے ننھے بچے بھی ان کے کہنے سے ایثار دکھاتے ہیں لہٰذا ہم نے دو کو انعام دیا۔ اور بچوں کو ان کا شریک کیا۔ آیتوں میں افعال و ضمائر، اعمال و انعام کے لیے جمع کے صیغے استعمال کر کے معجزانہ طور پر سب کے عقیدہ و عمل کی یکسانیت بتائی اور سب کے لیے ایک ہی قسم کا انعام بیان کیا۔ (جار اللہ زمخشری: تفسیر کشاف ج ۲ ص ۵۱۱' فخر الدین رازی، تفسیر کبیر ج ۸ ص ۲۹۵، اور بہت سی کتب حدیث و تفسیر)

اسی کم سنی میں ایک اور شعوری عمل اور لاجواب واقعہ وہ ہے جسے "حدیث کسا" یا سبب نزول آیۂ تطہیر کہتے ہیں' یعنی ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جناب سیدۂ کونین کے گھر میں تشریف لائے اور چادر طلب فرمائی، پھر چادر اوڑھ کر استراحت کے لیے آرام فرما ہوئے' ایک لمحہ نہ گذرا تھا کہ امام حسنؑ گھر میں آئے اور آداب بجالانے کے بعد والدہ ماجدہ سے سوال کیا، اماں گھر میں جد بزرگوار کی خوشبو مہک رہی ہے، نانا گھر میں کہاں ہیں؟ جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا نے فرمایا، وہ چادر کے نیچے آرام فرما رہے ہیں، امام حسنؑ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب آئے، آداب بجالائے اور اجازت لے کر چادر میں داخل ہو گئے، کچھ دیر بعد امام حسین

علیہ السلام آئے اور یہی واقعہ ہوا امام حسینؑ کے بعد حضرت علیؑ و فاطمہؑ بھی باری باری چادر کے اندر جمع ہو گئے اور یمنی چادر تلے جمع ہونے والوں میں فاطمہ زہراؑ رسولِ خداؐ علی مرتضیٰؑ حسن مجتبیٰؑ اور حسین علیہ السلام تھے۔ رسول خداؐ نے ہاتھ اٹھائے اور بارگاہِ الٰہی میں دعا کی "یا اللہ یہ میرے اہل بیت ہیں ان سے رجس کو دُور رکھنا" سورہ الاحزاب۳۳ کی ۳۳ ویں آیت اتری، جو قرآنی سند اور عظمت اہل بیت کی دستاویز ہے:

"اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا"

"اللہ کا حتمی ارادہ ہے کہ تم اہل بیت سے ہر قسم کی نجاست و رجس کو دور رکھے اور تمہیں اسطرح طہارت سے آراستہ رکھے جو حق طہارت ہے۔"

(صحیح ترمذی ج ۲ ص ۲۰۹ تفسیر کشاف ج ۱ ص ۲۴۹ تفسیر طبری ج ۲۲ ص ۵)

اس آیت میں گھر کے کمسن فرزند امام حسینؑ کی شرکت اور مدح میں ان کا حصہ گواہ ہے کہ: ع این خانہ تمام آفتاب است

قرآن مجید میں ایک اور واقعہ امام حسین علیہ السلام کے جبلی کمال پر دلیل ہے ایک مرتبہ عیسائی علماء و زعما کا ایک وفد دربارِ نبوت میں باریاب ہوا اور مذہبی بحث کرنے لگا یہ بحث ایک چیلنج پر ختم ہوئی جس کے الفاظ وحی یہ تھے:

اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَہٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ۝ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّکَ فَلَا تَکُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِیْنَ ۝ فَمَنْ حَآجَّکَ فِیْہِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَکَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَکُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَکُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَکُمْ ثُمَّ نَبْتَہِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰہِ عَلَی الْکٰذِبِیْنَ ۝ (آل عمران)

خدا کے نزدیک عیسیٰ کی حالت ویسی ہے جیسے آدم جنہیں مٹی سے بنایا پھر کہا "ہوجا" وہ موجود ہو گئے،

حق تمہارے رب کی طرف سے ہے تو تم شک کرنے والوں میں نہ ہونا، جب تمہارے پاس علم کی بات آچکی تو اب اگر کوئی حجت کرے تو کہو، آؤ ہم اپنے بیٹوں کو تم اپنے بیٹوں کو اور ہم اپنی عورتوں کو تم اپنی عورتوں کو ہم اپنے نفسوں کو تم اپنے نفسوں کو بلائیں پھر ہم سب مل کر خدا کی بارگاہ میں گڑگڑائیں اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت کریں؟

۲۴ ذی الحج ۹ھ کو فریقین کا اجتماع تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایسے صادق و صدیق افراد کو لے کر برآمد ہونا تھا جن کی سیرت و کردار، قول و فعل اتنا سچا ہو کہ جھوٹوں پر لعنت کر کے فریق مخالف کو رسوا کر سکے، مفسر و محدث و مورخ کہتے ہیں کہ عیسائی لاٹ پادری دیکھ رہے ہیں کہ رسول اللہ ص کیسے افراد لے کر آتے ہیں، ادھر حضور سرور دو عالم، امام حسین ع کو آغوش مبارک میں اور امام حسن ع کا ہاتھ ہاتھ میں، پشت پر فاطمہ زہراء ع اور ان کے پیچھے حضرت علی ع کو لیے ہوئے تشریف لاتے ہوئے نظر آئے۔ لاٹ پادری، عاقب و سید نے اپنے ساتھیوں سے کہا: یہ افراد ایسے ہیں جن کی بد دعا رد نہیں ہو سکتی، اگر یہ بد دعا کریں تو پہاڑ اپنی جگہ چھوڑ دیں اور عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے ان سے مباہلہ اچھا نہیں، اس کے بعد صلح ہو گئی۔

(تفسیر کشاف ج ۱ ص ۱۴۹، صحیح ترمذی ج ۲ ص ۱۶۶، فتوح البلدان بلاذری ص)

اس موقع پر امام حسین ع کی موجودگی، زیر تربیت بچے کی حیثیت سے نہیں بلکہ کامل و مکمل ممبر کی حیثیت سے تھی۔ خدا کا حکم تھا اور رسول اللہ ص کی نظر میں حسین ع کی بد دعا اور مباہلہ فتح کی علامت تھی۔ یعنی امام حسین ع کم سنی میں بھی دینی زعماء کی صف اول کے رکن تھے۔

غور کیجئے ان تین آیتوں میں اہل بیت ع کی غیر مشروط، کامل و مکمل عصمت و طہارت، صداقت و حقانیت اور عمل میں

سیادت و زعامت کا اعلان ہے۔ ان حضرات میں "رجس" کا شائبہ نہیں، یہ لوگ شعوری اور تحت الشعوری کمزوریوں سے پاک، فکری اور عملی پستیوں سے مبرا، عیوب و نقائص سے بہت دور تھے، بیان محاسن و فضائل میں دو بڑوں اور دو بچوں کی شرکت ہی کیا کم اعزاز تھا کہ بیان شرف میں دونوں کی یکسانیت "نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٌ" نہیں تو کیا ہے۔

تینوں مرحلوں میں امام حسینؑ مساوی حصہ دار کی حیثیت سے ہمارے سامنے ہیں اور ان کی انتہائی کم سنی کے قرآنی واقعات یہ حقیقت واضح کر رہے ہیں کہ مزاج کی اٹھان اور شخصیت کی تعمیر خدا کی طرف سے ہوئی تھی، ان کو منصب امامت کے لیے پیدا کیا تو بصیرت عظمیٰ پہلے سے عطا کی گئی۔ وہ روزِ اوّل سے آئینہ صفات و کمالات نبیؐ تھے۔

زمانہ تربیت میں مظاہرِ عظمت
حدیث و سیرت کے آئینہ میں:

امام حسینؑ پیدا ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زبان مبارک چُسائی، خود آذان واقامت کہی، ذرا بڑے ہوئے تو لوگوں نے دیکھا۔ حضور (ص) ننھے فرزند کے دونوں ہاتھ مُٹھیوں میں لیے اوپر اُٹھانے جاتے ہیں اور ننھے ننھے پاؤں اپنے مقدس سینے تک لا کر ٹھہراتے ہیں اور فرماتے جاتے ہیں" تَرَقَّ تَرَقِّ عَیْنُ بَقَّہْ" "میوں میوں اوپر آؤ، مچھر کی آنکھ اندھی" پھر منہ سے منہ ملا کے چُومتے اور فرماتے "یا اللہ یہ مجھے پیارا ہے تُو بھی اس سے محبت فرما"۔ (الاستیعاب ج ا ص ۱۴۴)

کبھی مبارک کاندھوں پر بٹھا کر مدینے کی گلیوں، بازاروں میں پھرتے، لوگ کہتے " حسینؑ کتنی اچھی سواری ہے" آپؐ فرماتے: "یہ نہ کہو، بلکہ یہ کہو کتنا اچھا سوار ہے" مسجد میں ناقہ بن کر بچوں کو اوپر بٹھاتے اور صحن مسجد میں چلتے اور" العفو.

العفو" فرماتے. جب حسینؑ قدم قدم گھر سے نکل کر صحنِ مسجد میں آجاتے تو حضور خطبہ روک کر منبر سے اترتے، جھک کر حسینؑ کو اٹھاتے گود میں بٹھا کر پھر تقریر جاری کر دیتے۔

بخاری و ترمذی نے یہ واقعہ بھی لکھا ہے کہ حضورؐ نے امام حسین علیہ السلام کو اٹھایا اور اصحاب سے فرمایا "حُسَيْنٌ مِنِّيْ وَأَنَا مِنْ حُسَيْنٍ، أَحَبَّ اللّٰهُ مَنْ أَحَبَّ حُسَيْنًا حُسَيْنٌ سِبْطٌ مِنَ الْأَسْبَاطِ" (صحیح ترمذی ج ۲، باب مناقب الحسن وحسینؑ ص ۳۰۷)

" حسینؑ مجھ سے اور میں حسینؑ سے ہوں، جو حسینؑ سے محبت کریگا اللہ اس سے محبت کرے گا حسینؑ اسباط میں سے ایک سبط ہیں" (بخاری، ادب المفرد ص ۴۵ طبع آگرہ)

اس حدیث کے بعد واقعات و احادیث نقل کرنے میں طوالت ہوگی، اہلِ نظر کے لیے اس سے جامع و مانع تعریف اور کیا ہو سکتی ہے کہ سب سے کم سن فرزند اس وقت بھی اسی بے مثال درجہ پر فائز ہے جو آخر عمر میں اس نے ثابت کر دیا، حسین (ع) محبت الٰہی کا ذریعہ، حسینؑ اسباط میں سے ایک سبط اور محمد مصطفٰےؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دار و مدار حسینؑ پر اور وہ بھی معنی خیز اور معجز نما لفظوں میں — "حسینؑ مجھ سے، میں حسینؑ سے"، اللہ اکبر، نمود مصطفٰےؐ حسینؑ سے، وجودِ مصطفٰےؐ حسینؑ سے، سنّت وسیرت، دعوت و اسلام مصطفٰےؐ حسینؑ سے۔ غرض ذات رسولؐ جس جس صفت سے عبارت ہے، حسینؑ اس مفہوم و مطلب سے وابستۂ محمد (ص) ہیں، ایک دوسرے سے جدا نہیں کیے جا سکتے۔

"حُسَيْنٌ مِنِّيْ وَأَنَا مِنْ حُسَيْنٍ" — ایسی حقیقت کا بیان ہے جس کی مثال نہ اس سے پہلے دیکھی گئی نہ اس کے بعد۔

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجسم محبت و سراپا

شفقت تھے۔ آپؐ بچوں سے بے حد محبت فرماتے تھے مگر کسی بچے کے فضائل واوصاف کا بیان اور چیز ہے اور محبت چیزِ دیگر ہے۔ حسینؑ کے فضائل کا بیان اس لیے منفرد بات ہے کہ یہ بچے مشتبہ مستقبل اور امیدوں کے سہارے بڑے ہونے والے نہ تھے، یہ بچے سبطِ نبیؐ، فرزندِ علیؑ جگر بندِ فاطمہؑ ہونے کے ساتھ ساتھ فطری جوہر اور پیدائشی طور پر صاحبِ منصبِ امامت تھے۔ اس پر طرہ یہ تھا، کہ لعابِ پیغمبرؐ اور شیرِ طیب و طاہر معصومہؑ سے پروان چڑھے۔ گوشت و پوست میں رسولِ آخر الزماں کا خون اور امیر المومنینؑ کی قوت تھی۔

اس طرح کے عصمت مآب، نورٌ علیٰ نور، پس منظر میں امام حسینؑ کا زمانہ تربیت گذرا اور شہزادۂ رسولؐ دنیا کے تمام مثالی بچوں سے الگ مزاج و خلقت و جبلت کی بناء پر نکھری توانائیوں اور چمکتی دمکتی رعنائیوں کے ساتھ زمان و مکان کو نور و بلندی سے ضوفشاں کرتے رہے۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّآلِ مُحَمَّدٍ

سیاسی ماحول

بیعت عقبیٰ و اولیٰ کے بعد اوس وخزرج کے وعدہ نصرت پر آنحضرتؐ مکہ کو خیرباد کہہ کر یثرب تشریف لے آئے تھے، اسطرح کفار کے دل سے یہ کانٹا نکل جانا چاہیے تھا کہ اب ان کے خود ساختہ خداؤں کو بُرا کہنے والا وہاں کوئی نہیں رہا اور نہ انکے مشرکانہ کرتوت پر لے دے کرنے والا باقی رہا ہے لیکن وہ آنحضرتؐ کے تشریف لے آنے پر بھی خاموش نہ بیٹھے بلکہ سازشوں کا رخ یثرب کی طرف موڑ دیا اور عبداللہ ابن ابی بن سلولؓ کو جو یثرب کا ایک مقتدر رئیس اور منافقوں کا سردار تھا، اکابر قریش نے ایک خط لکھا جس میں کہا گیا کہ تمہارے شہر میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پناہ لی ہے جو ہمارے خداؤں کو برا کہتا ہے، اس کو ہمارے سپرد کردو ورنہ ہم سے جنگ کے لیے آمادہ رہو۔ اس خط کے مضمون سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اکابر قریش آنحضرتؐ کے دورِ مدینہ کو اپنی گوناگوں مصلحتوں کی بنا پر حد درجہ خطرناک خیال کرتے تھے ترویج و اشاعت اسلام کے علاوہ ان کو مسلمانوں سے جو سب سے بڑا خطرہ لاحق تھا وہ یہ تھا کہ قریش کے کاروانِ تجارت شام کو اس راہ سے جاتے تھے کہ یثرب کا شہر درمیان میں پڑتا تھا۔ اور اس امر کا قوی اندیشہ تھا کہ ذرا بھی زور پکڑنے پر مسلمان اس قومی شاہراہ کو قریش پر بند کردیں گے اور اس جانب ایک دفعہ سعد ابن معاذؓ نے اشارہ بھی کردیا تھا۔ واقعہ اس طرح ہوا کہ سعد ابن معاذؓ مکہ گئے، حرم کے طواف کے موقع پر ان کے ہمراہ امیہ بن خلف بھی تھے، ابوجہل نے ان کو دیکھ کر کہا کہ اگر تم تنہا طواف خانہ کعبہ کے لیے آتے تو "مسئلہ کچھ اور" ہی ہو جاتا اس پر معاذ نے فوراً یہ جواب دیا کہ تم ہم کو خدا کے گھر آنے سے روکو گے تو ہم تمہارے وہ کاروانِ تجارت جو شام کو جاتے ہیں ہرگز نہیں گذرنے دیں گے"۔ یہ بات قریش کو بری طرح کھٹک رہی تھی اور وہ مدینہ میں کسی بھی قیمت پر مسلمانوں کی بالادستی
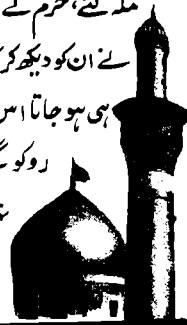
کو برداشت نہیں کر سکتے تھے اور قریش مسلمانوں کو ان کی تنظیمِ ملی کے ابتدائی منازل ہی میں ختم کر دینے پر تلے ہوئے تھے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ایک طرف وہ عبداللہ ابن ابی ابن سلول سے گفت و شنید کر رہے تھے دوسری طرف بنی نضیر، بنی قریظہ، بنی قینقاع (یہودی قبائل) سے مل کر سازشیں کر رہے تھے کہ جسطرح بھی ممکن ہو سکے یثرب میں مسلمان جمنے نہ پائیں۔ مدینہ میں اگرچہ آنحضرتؐ نے ان یہودی قبائل سے نہایت باعزت معاہدہ کیا تھا اور ان کو مذہبی آزادی کی رعایت بھی دی تھی لیکن ان کی شقاوتِ قلبی کسی طرح بھی اسلام کی حقانیت کے پیغام کو نہ سمجھ سکی۔ بہرحال قریش مکہ نے مدینہ پر چڑھائی کر دینے کا مذموم منصوبہ بنایا اور ایک تجارتی قافلہ شام کو روانہ کیا۔ مولوی شبلی نعمانی نے اس واقعہ کو اسطرح درج کیا ہے کہ مکہ کی کل آبادی نے اس قافلہ میں اپنا روپیہ لگا دیا تاکہ اس کے نفع سے مسلمانوں سے بدلہ لیا جائے۔ قافلہ ابو سفیان ابن حرب کی نگرانی میں روانہ کیا گیا تھا۔ ابھی قافلہ شام سے روانہ بھی نہ ہوا تھا کہ مکہ میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ مسلمان قافلہ کا راستہ روکیں گے۔ اور قافلہ کو تاراج کریں گے۔ واقعات کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے یہ بات صریح طور پر غلط ہو جاتی ہے کہ اگر مسلمانوں کا مقصد اس قافلہ کو لوٹنا ہوتا تو ان کا رخ اس طرف ہوتا جس طرف سے یہ قافلہ آ رہا تھا اور جہاں وہ قبائل آباد تھے جو نہ قریش کے زیرِ اثر تھے نہ مسلمانوں کے، اس راستہ کو چھوڑ کر مسلمانوں کا رُخ مکہ کیطرف ہونا اس کی قطعی دلیل ہے کہ وہ اس فوج سے اپنا دفاع کرنا چاہتے تھے جو مکہ سے مدینہ پر حملہ آور ہونے کے مقصد سے آ رہی تھی۔ اور پھر جبکہ قافلہ خیریت سے مکہ پہنچ ہی گیا تھا تو پھر قریش کے پاس اس قسم کے حملے کا کیا جواز باقی رہ جاتا ہے سوائے اس کے کہ وہ مسلمانوں کے وجودِ ملی کو تباہ و برباد کر ڈالیں۔

ایک ہزار کا لشکرِ جرار یلغار کرتا ہوا مدینہ کی طرف بڑھا۔ ادھر سے اللہ کے نام لیوا اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شیدائی خستہ و خراب حالات میں صرف تین سو تیرہ کی تعداد میں جن کے پاس پورے آلاتِ حرب بھی نہ تھے اپنے دفاع کے لیے مدینہ سے باہر مقام بدر پر خیمہ زن ہو گئے اور ۱۷ رمضان ۲ھ کو حق و باطل کا پہلا معرکہ ہوا۔ اللہ کی مدد، آنحضرتؐ کی قیادت اور بہت سے اسباب نے مل کر مسلمانوں کو قریش پر فتح عطا کی، ان کے بڑے سردار میدانِ جنگ میں کام آ گئے مکہ کے بہت سے گھر بے چراغ ہو گئے۔ بڑے بڑے نام آور سردار پیوندِ خاک ہو گئے قریش کا غرور خاک میں مل گیا، اُن کے حوصلے پست ہو چکے تھے اور سیاسی اعتبار سے قرب و جوار کے علاقوں میں مسلمانوں کی دھاک بیٹھ گئی اور بہت سے قبائل دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ جہاں سیاسی اعتبار سے جنگِ بدر نے مسلمانوں کو سربلند کیا وہاں یہ صورت بھی پیدا ہوئی کہ یہودی قبائل چوکنے ہو گئے اور وہ اس فکر میں لگ گئے کہ اس بڑھتی ہوئی قوت کو کسی نہ کسی طرح ختم کرنا چاہیے ورنہ پورا عربستان ان کا حلقہ بگوش ہو جائے گا۔ بنو قینقاع کے واقعہ میں سردارانِ قریش اگرچہ اس قابل نہ رہے تھے کہ پھر میدانِ جنگ میں آتے لیکن یہودیوں کی سازشوں کی وجہ سے وہ دوسری مرتبہ بدر کا انتقام لینے کے لیے مدینہ پر حملہ آور ہوئے اسطرح ۳ھ میں جنگِ احد رونما ہوئی، ابتدا میں مسلمانوں کو کامیابی حاصل ہوئی اور دشمنوں کے قدم اکھڑ گئے وہ مالِ غنیمت چھوڑ کر بھاگے۔ مسلمانوں کا ایک دستہ جو گھاٹی پر متعین تھا، احکام رسولؐ اور اپنے سردار کی حکم عدولی کرتے ہوئے مالِ غنیمت بٹورنے میں لگ گیا۔ قریش کا شکست خوردہ لشکر خالد ابن ولید کی سرکردگی میں پھر لوٹ آیا۔ اور اس نے مسلمانوں پر زبردست حملہ کر دیا۔ جس نے مسلمانوں کے پیر اکھاڑ دیئے۔ اس حملہ میں آنحضرتؐ زخمی ہوئے بلکہ

نعوذ باللہ خبر شہادت تک مشہور ہوگئی تھی۔ حضرت حمزہؑ اور دوسری کئی اہم ہستیاں درجہ شہادت پر فائز ہوئیں۔ حضرت علی علیہ السلام نے اس موقعہ پر ایک مرتبہ پھر سرفروشی کا فریضہ سرانجام دیتے ہوئے دشمنوں کو پسپائی پر مجبور کر دیا۔ اس طرح مسلمانوں کی یہ فتح حضرت علی علیہ السلام کی منفرد شخصیت کی مرہونِ منت ہوئی۔

اس جنگ سے مسلمانوں کی سیاسی حیثیت بری طرح مجروح ہوگئی بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ جنگ بدر کے بعد جو ساکھ قائم ہوگئی تھی وہ اب باقی نہ رہی۔ مدینہ کے دیا رو امصار میں بسنے والے چھوٹے چھوٹے قبیلے تک اتنے منہ زور ہوگئے تھے کہ یثرب پر حملہ آور ہونے کا خیال کرنے لگے تھے۔ تاریخ کی روشنی میں اگر آپ ملاحظہ فرمائیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جنگِ احد اور احزاب کے وقفہ میں مدینہ پر بے شمار حملے ہوئے اور بعض قبائل کی سرکوبی کے لیے حضورؐ کو خود مدینہ سے باہر آنا پڑا۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح سرکش قبائل کو سیدھا کیا گیا۔ ان چھوٹے چھوٹے حملوں کا اصل مقصد یہی تھا کہ مسلمانوں کی قوت کو منتشر کردو اور ان حالات میں ڈال دو کہ جب ان پر بھرپور حملہ کر دیا جائے تو وہ مقابلہ کے قابل نہ رہیں اور کچھ روز کے بعد تاریخ کی وہ مشہور جنگ ہوئی جس کو جنگِ احزاب کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

اس موقع پر یہود نے بھی بڑا گندا کردار انجام دیا۔ بنی قینقاع اور بنو نضیر نے معاہدہ شکنی کی اور مسلمانوں سے برسرِ پیکار ہوگئے۔ مسلمانوں نے لڑ کر اُن پر فتح حاصل کی، بنی قینقاع کو ملک شام کیطرف جلاوطن کیا گیا۔ اور بنی نضیر کو عبداللہ ابن ابی بن سلول کی سفارش پر خیبر میں آباد ہونے کی اجازت دے دی گئی صرف بنی قریظہ تجدید معاہدہ کے بعد اطراف مدینہ میں باقی رہ گئے لیکن اس کے باوجود وہ سازشوں سے باز نہ آئے۔

بنو نضیر نے خیبر میں آباد ہونے کے بعد خوفناک سازش کی جس کے نتیجہ میں ۵ھ میں جنگ احزاب رونما ہوئی۔

جنگ احزاب ہرگز نہ لڑی جاتی اگر مدینہ کے جلاوطن بنو نضیر مکہ جا کر قریش کو شہ نہ دیتے۔ بنی نضیر کی شہ پر قریش آمادۂ جنگ ہوئے۔ عرب کے ممتاز قبائل نے اس جنگ میں اسلام کے خلاف حصہ لیا۔ اسی لیے اس لڑائی کو جنگ احزاب کہتے ہیں مورخین نے احزابی ٹولی کی تعداد دس ہزار سے ۲۴ ہزار تک بتائی ہے۔ بہر حال جو کچھ بھی ہو اہل عرب نے اتنا بڑا لشکر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ہر طرف فوجوں کا دل بادل تھا اور عرب کا بچہ بچہ مسلمانوں کے خون کا پیاسا نظر آ رہا تھا۔ مدینہ شدید ترین محاصرہ میں تھا اور انتہائی سردی کا موسم تھا۔ لشکر اسلام صرف تین ہزار جانثاروں پر مشتمل تھا اور وہ بھی بھوکے اور پیاسے۔ ایک طرف دشمنوں کا یہ انبوہ کثیر دوسری طرف یہ عالم کہ مدینہ کی اندرونی فضا بھی مسلمانوں کے لیے کچھ زیادہ سازگار نہ تھی۔ منافقین لشکر اسلام میں بد دلی پھیلا رہے تھے۔ بنو قریظہ جن سے تجدید معاہدہ ہو چکا تھا وہ ایسے نازک موقع پر معاہدہ سے پھر گئے اور قریش کے شریک کار ہو گئے۔

اس نازک موقع پر آنحضرتؐ نے اعلیٰ قائدانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا اور زبردست حکمت عملی سے قریش اور بنی قریظہ میں ان بن کرا دی جس کا فائدہ لشکر اسلام کو ہوا۔ پھر حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے قریش کا زبردست بہادر عمرو ابن عبدود قتل ہوا۔ اس کے قتل ہوتے ہی احزاب والوں کی ہمتیں پست ہو گئیں۔ ایسے موقع پر نصرت الٰہی بھی شامل حال رہی، آسمان سے بارش اور اولے ٹوٹ کے برسے جس نے قریش کو اور بھی بدحواس کر دیا۔ آپس کی غلط فہمیوں اور باقاعدہ رسد نہ ملنے کی وجہ سے مکہ کے قریش راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ غرضیکہ ایک مہینے کے شدید محاصرہ کے بعد مسلمان مظفر و منصور گھروں کو واپس لوٹے لیکن ان کے ایک زبردست سردار سعد بن معاذ انصاری شدید زخمی ہو گئے اور باوجود انتہائی عمل جراحی کے جانبر نہ ہو سکے۔ آنحضرتؐ

کو ان کی شہادت کا انتہائی صدمہ ہوا۔

بنی قریظہ چونکہ بنی قریظہ بدعہدی کر چکے تھے اور اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے تو مسلمانوں کا وجودِ ملی خاک میں مل جاتا اس لیے حضورؐ نے ان کو سزا دینے کے لیے فوراً ایک لشکر ترتیب دیا اور ان کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا جب یہ لشکر بنی قریظہ کی آبادی میں پہنچا تو انہوں نے پتھر برسائے اور حضورؐ کی شان میں معاذ اللہ نازیبا الفاظ استعمال کیے۔ بہرحال ان کا محاصرہ کیا گیا اور بالآخر انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور یہ مطالبہ کیا کہ ان کی قسمت کا فیصلہ توراۃ کے حکم کے مطابق کیا جائے اس سلسلہ میں وہ سعد ابن معاذؓ کی ثالثانہ حیثیت کو کو تسلیم کریں گے۔ چنانچہ معاملہ سعد ابن معاذ انصاریؓ کے سپرد کیا گیا۔ جو کبھی ان کے حلیف بھی تھے انہوں نے توراۃ کے حکم مطابق یہ فیصلہ صادر کیا کہ سب کو تہ تیغ کیا جائے بنی قریظہ نے اس فیصلہ کو قبول کیا لہذا ۴۰۰ آدمی اور ایک عورت غداری اور عہد شکنی کے جرم میں قتل کیے گئے۔ یورپی مورخین نے اسلام دشمنی میں آنحضرتؐ کے اس طرزِ عمل پر بڑی نکتہ چینی کی ہے لیکن وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ کسی بھی مہذب قانون میں ان کے ممالک میں غداری کی کیا سزا ہوتی ہے اور پھر ایسی غداری جس کی وجہ سے کسی معاشرہ کے وجود ہی کو خطرہ لاحق ہو جائے۔ یورپی مورخین میں مسٹر منٹگمری واٹ نے آنحضرتؐ کے اس حکم کو کھلے الفاظ میں سراہا ہے۔ انہوں نے واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ بنی قریظہ کے ساتھ جو کچھ بھی کیا گیا وہ بالکل درست تھا۔ بنی قریظہ کے واقعات کا اگر تفصیلی جائزہ لیا جائے تو آپ خود فیصلہ کر لیں گے کہ رسولؐ کا یہ فیصلہ کس حد تک جائز تھا۔ ان کے ہتھیار ڈال دینے کے بعد ان کے قلعوں کا جائزہ لیا گیا تو کثرت سے آلاتِ حرب و ضرب برآمد ہوئے

وہ تو یہ کہیئے کہ ان کو موقع ہی نہ مل سکا ورنہ یہ ہی ہتھیار اسلام کے خلاف استعمال ہوتے اور جنگِ احزاب کا نقشہ ہی بدل جاتا۔ جو متعصب عیسائی مورخین حضورؐ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اس عمل کو بے رحمی سے تعبیر کرتے ہیں غالباً وہ بھول جاتے ہیں کہ حضورؐ کا دل انسانی جذبات اور رحم سے اس قدر مملو تھا کہ انسان تو درکنار وہ جانوروں تک کی زحمت کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اسی منٹگمری واٹ نے اپنی کتاب میں یہ واقعہ بھی لکھا ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر جب لشکرِ اسلام گذر رہا تھا تو آپ کی نظر ایک مادہ سگ پر پڑی جو اپنے بچوں کو دودھ پلا رہی تھی وہ فوج کی کثرت دیکھ کر ڈری، حضورؐ نے اس کے جذبات کا اندازہ کر کے کسی کو محض اس لیے متعین کر دیا کہ کوئی شخص اس کے معمول میں فرق نہ آنے دے آپ خود غور فرمائیں جس ہستی کے عفو و کرم کا یہ عالم تھا کیا وہ اس قدر سفاک ہو سکتا تھا کہ اسطرح ۷۰۰ آدمیوں کو قتل کروا دیتا تاوقتیکہ کوئی بہت اہم معاملہ پس منظر میں نہ ہو۔

صلح نامہ حدیبیہ اور بیعتِ رضوان

اسطرح شمالی عرب میں امن و سکون ہو گیا مگر خیبر کے یہودیوں کا معاملہ ابھی طے ہونے سے باقی رہ گیا تھا۔ شمالی عرب کے معاملات سے جب آپؐ کو قدرے اطمینان نصیب ہوا تو آپ نے مہاجرین اور انصار کی معیت میں مکہ معظمہ کا ارادہ کیا اور اس خیال سے کہ قریش کو کوئی اور خیال نہ ہو عمرہ کا احرام باندھا اور قربانی کے اونٹ ساتھ لیے، یہ بھی حکم دیا کہ کوئی شخص ہتھیار باندھ کر نہ آئے صرف تلوار جو سفر میں ضروری آلہ سمجھی جاتی تھی پاس رکھ لی جائے، اس میں یہ بھی شرط ہے کہ تلوار نیام میں بند ہو۔ یہ زمانہ اشہر حرام کا تھا۔ جس میں دوست دشمن سب مکہ آتے تھے مگر قریش کی شقاوت قلبی نے مسلمانوں پر مکہ آنے کے تمام راستے مسدود کر دیئے تھے۔ اس

کے برعکس مسلمانوں سے مقابلے کے لیے کافی فوج جمع کر لی تھی۔ حالانکہ یہ وہی قریش تھے جو ابتک تین لڑائیوں میں لشکرِ اسلام سے پٹ چکے تھے۔ اور اسوقت اسلام کو وہ بالادستی حاصل ہو چکی کہ آپ اگر چاہتے تو بزورِ مکہ میں داخل ہو سکتے تھے مگر آپ (ص) نے ہر قسم کی خونریزی سے گریز کیا اور حرمتِ کعبہ ملحوظ رکھتے ہوئے صلح کے نامہ و پیام بھیجے مگر مکہ والے تو یہ طے کر چکے تھے کہ حضورؐ کو مکہ نہ آنے دیں گے۔ آنحضرتؐ نے قریش سے گفتگو کیلئے حضرت عثمانؓ کو روانہ کیا، لیکن وہ مکہ میں نظربند کر دیئے گئے ادھر اسلام کے کیمپ میں یہ بات مشہور ہوگئی کہ وہ قتل کر دیئے گئے ہیں۔ یہ خبر آنحضرتؐ نے سُنی تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ عثمانؓ کے خون کا قصاص لینا فرض ہے یہ کہہ کر آپؐ نے ایک ببول کے درخت کے نیچے بیٹھ کر صحابہ سے جان نثاری کی بیعت لی۔ یہ تاریخ اسلام کا ایک مہتم بالشان واقعہ ہے۔ اسی بیعت کا نام بیعت الرضوان ہے۔ بعد میں تصدیق ہوگئی کہ یہ خبر غلط تھی۔

بہرحال قریش کے بعض ذی فہم افراد کے درمیان میں پڑ جانے سے معاملہ رفع دفع ہو گیا اور مسلمانوں اور قریش کے درمیان دس سالہ مدت کے لیے صلح ہو گئی۔ کیونکہ یہ صلح حدیبیہ کے مقام پر ہوئی تھی اس لیے اس کو صلح حدیبیہ کہتے ہیں۔ اس کی شرائط یہ تھیں۔

۱۔ مسلمان اس سال واپس چلے جائیں، اگلے سال آئیں اور صرف تین دن قیام کر کے چلے جائیں۔

۲۔ ہتھیار لگا کر نہ آئیں۔ صرف تلوار ساتھ لائیں اور وہ بھی نیام میں اور نیام بھی جلبان میں ہو۔

۳۔ مکہ میں جو مسلمان پہلے سے مقیم ہیں ان میں سے کسی کو اپنے ساتھ نہ لے جائیں اور مسلمانوں میں سے جو کوئی مکہ میں رہ

جانا چاہے اس کو نہ روکیں۔

۴۔ کافروں یا مسلمانوں میں سے کوئی شخص اگر مدینہ جائے تو واپس کردیا جائے لیکن کوئی مسلمان مکہ جائے تو وہ واپس نہ کیا جائے۔

۵۔ قبائل عرب کو اختیار ہے کہ فریقین میں سے جس کے ساتھ چاہیں معاہدہ میں شریک ہوجائیں۔

یہ شرطیں بظاہر مغلوبانہ تھیں اور اصحاب کو پسند بھی نہ تھیں لیکن زمانہ قریب نے اس صلح نامہ کی افادیت کو ظاہر کردیا۔

صلح کے تین دن بعد تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیبیہ میں قیام فرمایا پھر روانہ ہوئے تو راہ میں یہ سورۃ اُتری:

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ۙ

ہم نے تجھ کو کھلی ہوئی فتح عنایت کی (سورۃ فتح آیت ۱)

تمام مسلمان جس کو شکست سمجھتے تھے۔ خدا نے اس کو فتح کہا۔ نتائج مابعد نے اس راز سربستہ کی گرہ کشائی کی۔ اب تک مسلمان اور کفار ملتے جلتے نہیں تھے لیکن اس معاہدہ صلح کیوجہ سے ان کی آمدورفت شروع ہوگئی۔ خاندانی اور کاروباری تعلقات کیوجہ سے کفار مدینہ میں آتے اور مسلمان مکہ جاتے اور مہینوں ایک دوسرے کے مہمان رہتے۔ ان قریبی تعلقات نے کفار کو مسلمانوں کے مطمع نظر کو سمجھنے کا موقع عطا کیا۔ دوران گفتگو میں اسلامی مسائل کا تذکرہ چھڑ جاتا اور یہ چیزیں کفار کے دلوں میں گھر کرتی جارہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہر مسلمان اخلاص، حُسنِ عمل، نیکوکاری، پاکیزہ اخلاقی کی ایک زندہ تصویر تھا اور ہر شخص میں پرتوِ محمدی جلوہ فگن تھی۔ اس سے خودبخود کفار کے دل اسلام کی طرف مائل ہونا شروع ہوگئے۔ مورخین کا بیان ہے کہ اس معاہدہ صلح سے لیکر فتح مکہ تک اسقدر کثرت سے لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے

کہ اس سے قبل کبھی نہیں ہوئے تھے۔

اسی سال یعنی ۶ھ کو آنحضرتؐ نے تمام پڑوسی ممالک کے سربراہوں کو دعوتِ اسلام دی اور مراسلات روانہ کیے۔

صلح حدیبیہ کی وجہ سے قریش کسی حد تک خاموش ہوگئے اور وقت کے تقاضوں کے پیشِ نظر اب وہ مسلمانوں سے نبرد آزما نہیں ہونا چاہتے تھے۔ روز روز کی جنگوں نے ان کی حالت خستہ و خراب کر ڈالی تھی۔

چنانچہ ۷ھ میں جب خیبر کا معاملہ پیش ہوا تو قریش نے مسلمانوں کے خلاف یہود کا ساتھ نہ دیا یہودی تنہا لشکرِ اسلام سے نبرد آزما ہوئے اور شکست کھائی۔

خیبر کی فتح سے اسلام کی ملکی اور سیاسی حالت کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اسلام کے حقیقی دشمن صرف دو تھے، مشرکین مکہ اور یہود۔ نصاریٰ اگرچہ عرب میں موجود تھے لیکن زیادہ زور اور اثر نہیں رکھتے تھے۔ مشرکین و یہود اگرچہ مذہباً ایک دوسرے کی ضد تھے لیکن خدا برا کرے سیاست اور شقاوتِ قلبی کا کہ یہود پیامِ ربانی کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہوئے بھی بت پرستی کو قابلِ ترجیح قرار دیے ہے تھے۔ سیاسی اسباب کی بنا پر ان دونوں میں اتحاد ہوگیا لیکن فتح خیبر کے بعد یہود کی قوت پامال ہوگئی گویا اب شمالی اور جنوبی عربستان میں کوئی ایسی ذی اقتدار جماعت باقی نہ رہ گئی تھی جس سے اسلام کو مزاحمت کا اندیشہ ہوسکتا تھا۔

آنحضرتؐ نے اسی سال عمرہ ادا کیا اور حسبِ معاہدہ تین دن قیام کر کے مدینہ واپس تشریف لے آئے۔

جانشینِ ابراہیمؑ کا سب سے مقدم فرض، توحیدِ خالص کا احیاء حرم کعبہ کا آلائشوں سے پاک کرنا تھا لیکن قریش کے پے در پے حملوں اور عرب کی مخالفت عام نے پورے اکیس برس تک اس فرض کو روکے رکھا۔ صلح حدیبیہ کی بدولت اتنا ہوا کہ

چند روز کے لیے امن و امان قائم ہوگیا اور مسلمان صرف ایک نظر سے حرم محترم کو دیکھ کر واپس آگئے۔ معاہدہ حدیبیہ بھی قریش سے نہ نبھ سکا. حلم، عفو اور تحمل کی حد ہوگئی اب وقت آگیا کہ حقیقت کو آشکار کر دیا جائے. حرم محترم میں بنی قزاعہ پر جو اسلام کے حلیف تھے خون ریزی کر کے قریش نے اس معاہدہ کی دھجیاں اڑادیں اور مدینہ میں آنحضرتؐ کو کہلوا بھیجا کہ ہم معاہدہ کے پابند نہیں ہیں. چنانچہ آنحضرتؐ دس ہزار صحابہ کا لشکر جرار لے کر مکہ معظمہ میں فاتحانہ انداز سے داخل ہوگئے اور سوائے چند کے بقیہ لوگوں کو عام طور پر معاف کردیا ابوسفیان جس نے اسلام کے خلاف ہر جنگ میں نمایاں کردار انجام دیا تھا اس تک کو معاف کردیا. بلکہ یہ تک حکم دے دیا کہ جو ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے گا معاف کیا جائے گا.

خدا کی شان، حرم محترم جو خلیل بت شکن کی یادگار تھا اور اولین مرکز توحید تھا اس کے آغوش میں سینکڑوں بت آویزاں تھے، آنحضرتؐ نے ایک ایک کو لکڑی کی نوک سے ٹھوکے دیئے اور یہ پڑھتے جاتے تھے. حق آگیا اور باطل مٹ گیا اور باطل مٹنے ہی کی چیز ہے. اسطرح خانہ کعبہ کو بتوں سے پاک کردیا اور مندرجہ ذیل خطبہ ارشاد فرمایا:

"ایک خدا کے سوا اور کوئی خدا نہیں ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہے. اس نے اپنا وعدہ سچا کیا. اس نے اپنے بندہ کی مدد کی اور تمام جتھوں کو توڑ دیا ہاں تمام محاضر، تمام انتقامات خون بہا کے قدیم رسوم، تمام خون بہا، سب میرے قدموں کے نیچے ہیں، صرف حرم کعبہ کی تولیت اور حجاج کی آب رسانی اس سے مستثنیٰ ہیں. اے قوم قریش اب جاہلیت کا غرور اور نسب کا افتخار خدا نے مٹا دیا، تمام لوگ

آدمؑ کی نسل سے ہیں اور آدم مٹی سے بنے ہیں۔"

خداوند عالم نے قرآن حکیم میں بھی ارشاد فرمایا ہے،

" لوگو، ہم نے تم کو مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہارے قبیلے اور خاندان بنائے کہ آپس میں ایک دوسرے سے پہچان لیے جاؤ لیکن خدا کے نزدیک شریف وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہو۔ خدا دانا اور واقف کار ہے۔" (سورۂ حجرات آیت ۱۳)

فتح مکہ تاریخ عالم کا ایک شاندار واقعہ اور خلوص نیت اور عمل پیہم کا درخشاں باب ہے۔ وہ مقدس ترین اور شریف ہستی جس کو ہم بجا طور پر فخر انسانیت کہہ سکتے ہیں، جو فتح مکہ سے صرف آٹھ سال پہلے رات کی تاریکی میں وطن عزیز کو خیر باد کہہ کر نکلی تھی برہنہ تلواریں جس کا تعاقب کر رہی تھیں جس کے سر پر انعام رکھا گیا تھا آج اس شان سے وطن عزیز میں داخل ہو رہا ہے کہ دس ہزار کا آہن پوش لشکر جلو میں ہے اور اس کو ایذائیں پہنچانے والے شرم سے گردنیں جھکائے سامنے مجرم بنے کھڑے ہیں لیکن اللہ رے شانِ عفو و کرم کہ ایک قطرہ خون بہائے بغیر ان سب کو معاف کر دیتا ہے۔ انقلاب کی تاریخیں سب نے پڑھی ہوں گی۔ جب انقلابات آتے ہیں اور انقلاب لانے والے کامیاب ہو جاتے ہیں تو مخالفین سے قطع نظر ان کا خنجر تو اپنے ساتھیوں پر بھی چلتا ہے۔ اسلام کا یہ انقلاب ایسا شاندار انقلاب ہے جس کی مثال تاریخ عالم میں نہیں ملے گی۔

اسی سال روانگی مکہ سے قبل قبیلہ ہوازن و ثقیف زور آزما ہوئے اس لڑائی کو جنگ حنین کہتے ہیں۔ یہاں وہی احد والا معاملہ درپیش ہو گیا تھا، مسلمان مال غنیمت لوٹنے پر لگ گئے اور ہوازن کے تیر اندازوں نے مسلمانوں پر بھرپور حملہ کر کے ان کے قدم اکھاڑ دیئے مگر بہت جلد حالات پر قابو پا لیا گیا اور اس لڑائی میں ان دونوں قبیلوں کو شکست فاش ہوئی اور بہت کافی مال غنیمت

ہاتھ آیا۔ اسی لڑائی میں دایہ حلیمہ سعدیہ کی صاحبزادی شیما بھی قیدی ہو کر حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے سامنے آئیں ـــــ آپؐ ان کو دیکھ کر بہت غمگین ہوئے اور نہ صرف انہیں رہا کر دیا بلکہ بڑی عزت و توقیر کا برتاؤ کر کے تمام اولاد عبدالمطلب کا حصۂ غنیمت ان کو عطا فرمایا۔

سورۃ برآت زمانہ حج میں جناب علی ابن ابی طالب علیہ السلام سورۂ برآۃ کی جو آیتیں سناتے آئے تھے۔ حضرتؑ نے مقام منیٰ میں یہ آیات سنانے کے بعد اعلان فرمایا کہ نہ تو کافر کے لیے جنت میں جگہ ہے۔ نہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج ادا کرنے کے لیے بیت اللہ میں قدم رکھ سکتا ہے۔ نہ کوئی زائر برہنگی کی حالت میں کعبہ کا طواف کرنے کا مجاز ہوگا اور جس کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ایسا اجازت نامہ ہوگا وہ آئندہ کی پابندیوں سے پوری طرح آزاد متصور ہوگا۔

اس اعلان پر مشرکین کو یقین ہو گیا کہ آج سے بتوں کا طلسم ٹوٹ گیا اور ان کی خدائی تسلیم کرنے کے لیے کوئی سبیل نہیں اگر ان میں سے کسی نے ایسا کیا تو اس کے خلاف اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے اعلان جنگ سمجھا جائے گا۔

اس وقت کے جنوبی حصہ میں اور حضرموت میں ایسے لوگ باقی رہ گئے تھے، جو بت پرستی پر قائم تھے۔ ان کے سوا حجاز اور اس کے ملحقہ گرد و نواح خصوصاً عرب کے شمالی حصہ میں بسنے والے مشرکین اسلام قبول کر چکے تھے اور جبکہ یمن کے باشندوں میں بت پرستوں کے ساتھ نصاریٰ بھی ہنوز قدیم مذہب پر جمے ہوئے تھے۔

نصارائے نجران نجران کے عیسائیوں میں ایک ہی قبیلہ بنو حارث تھا جس کی اکثریت حلقہ بگوش اسلام ہو چکی تھی مگر ایک حصہ ابھی تک اپنے قدیم مسلک پر قائم

تھا۔ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خالد بن ولید کو ان کی تلقین کے لیے مقرر فرمایا اور انہوں نے بھی اسلام قبول کر لیا۔

یہ وہی قبائل تھے جو آج سے بیس سال پہلے ایک دوسرے سے متنفر اور ایک دوسرے کے مال اور آبرو کے دشمن تھے مگر پرچم اسلام کے زیرِ سایہ آتے ہی ان کے دلوں کی شقاوت وکثافت دور ہوگئی۔ خدائے دوجہاں کی پرستاری کے جذبہ کے ساتھ ان کے دلوں میں اپنے ابنائے جنس کے ساتھ مہر و وفا کے جذبات پیدا ہوئے، باہمی عناد اور زمانہ جاہلیت کے گلے شکوے دُور ہو گئے۔ ایک دوسرے سے جنگ و جدل کی راہیں مسدود ہوگئیں۔ جن کی تلوار کی کاٹ کا امتحان اہل وطن کے حلقوم پر ہوتا تھا۔ اب سے دشمنانِ اسلام اور اعدائے دین پر ہونے لگا۔ جزیرہ نمائے عرب میں شمال سے لے کر جنوب تک اور مغرب سے لے کر مشرق تک اسلام پھیل چکا تھا۔ ملک کے تمام باشندے اُمّتِ واحدہ بن گئے تھے جو ایک پرچم کے سایہ میں رہنے لگے اور یہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا علَم تھا۔ سب کا ایک ہی اسلام تھا، سب کے دل ایک ہی رخ کی طرف مائل تھے اور یہ رخ "خدائے وحدہٗ لاشریک" کا رخ تھا۔

حج آخر اور وداعی خطبہ ۱۰ھ اس سال آپ نے حج اکبر کا اہتمام کیا۔ اس عزم کے افشا ہوتے ہی یہ خبر تمام بلادِ اسلامیہ میں پھیل گئی۔ صحرا کے بادیہ نشین، پہاڑوں کی گھاٹیوں میں بسنے والے، دیہات اور شہروں کے باشندے، نزدیک و دور ہر طرف سے امنڈ کر مدینہ میں سمٹ آئے۔ مدینہ سے باہر خیموں کا نیا شہر آباد ہوگیا۔ ایک لاکھ بلکہ اور زیادہ تعداد میں لوگ جمع ہوگئے۔ یہ وہی لوگ تھے جو کبھی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے لیکن اب اسلام کی بدولت ایک دوسرے کے دینی بھائی تھے اور سب کے دل خوشی سے مسرور تھے

اسلیے کہ جلد مرکزِ توحید کی جانب مراجعت کرنے والے ہیں۔

حضور ختم المرسلین ؐ نے ۲۵ ماہ ذیقعدہ ۱۰ھ کو مدینہ منورہ سے حج بیت اللہ کے لیے مراجعت فرمائی۔ دنیا نے شاید ہی یہ منظر کبھی دیکھا ہو کہ مکہ سے خارج البلد آج اسی مکہ میں لاکھوں انسانوں کی سربراہی میں رواں دواں ہے اور اپنا مقصد یعنی اصنام پرستی کی لعنت سے چھٹکارا حاصل کر چکا ہے، ایک انسان کے کردار کی فضیلت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ اپنی زندگی ہی میں اپنا مقصد حاصل کر لے ان لاکھوں مسلمانوں نے اپنے پیغمبرؐ کی معلمی میں مناسکِ حج ادا کیے اور آپ ؐ نے اہم اصولی احکام بیان فرمائے:

"خدا نے ہر حقدار کو (از روئے وراثت اس کا حق دیدیا) اب کسی وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں، لڑکا اسی کا ہے جس کے بستر پر پیدا ہوا "زناکار" کے لیے پتھر ہیں، اور ان کا حساب خدا کے ذمہ ہے۔ جو لڑکا اپنے باپ کے علاوہ کسی اور کے نسب سے ہونے کا دعویٰ کرے اور جو غلام اپنے مولیٰ کے سوا کسی اور طرف اپنی نسبت کرے اس پر لعنت ہے۔ ہاں عورت کو اپنے شوہر کے مال میں سے اس کی اجازت کے بغیر لینا جائز نہیں۔ قرض ادا کیا جائے، دیت ادا کی جائے۔ عطیہ لوٹایا جائے۔ ضامن تاوان کا ذمہ دار ہے۔"

یہ فرما کر آپ ؐ نے مجمع کی طرف خطاب کیا۔

"تم سے خدا کے یہاں میری نسبت پوچھا جائے گا، تم کیا جواب دو گے؟"

صحابہ نے عرض کی "ہم کہیں گے کہ آپ نے خدا کا پیغام پہنچا دیا اور اپنا فرض ادا کر دیا۔" آپ ؐ نے آسمان کی طرف انگلی اُٹھائی اور تین مرتبہ فرمایا: "اے خدا گواہ رہنا۔" واپسی پر راستہ میں غدیر خم کے مقام پر قافلہ کو رُکا گیا اور پالان شتر کے منبر پر تشریف فرما

ہو کر آنحضرتؐ نے ایک اور خطبہ ارشاد فرمایا جو کتب حدیث و تاریخ میں خطبہ غدیر کے نام سے مشہور ہے اس خطبہ میں آنحضرتؐ نے "أَلَسْتُ أَوْلَىٰ بِكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ" "مسلمانو! کیا مجھے تمہارے نفوس پر تم سے زیادہ اقتدار حاصل نہیں ہے"؟ کے پس منظر میں ان الفاظ میں وصیت و ولایت و امامت و نیابتِ علوی کا اعلان فرمایا کہ:

مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا عَلِيٌّ مَوْلَاهُ

عین اس وقت جب آپ (ص) یہ فرضِ نبوت ادا فرما رہے تھے یہ آیت اُتری: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (سورۂ مائدہ آیت ۳)

"آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لیے مذہب اسلام کا انتخاب کیا"۔ نہایت حیرت انگیز اور عبرت خیز منظر یہ تھا کہ شہنشاہِ دوجہاں (ص) جسوقت لاکھوں آدمیوں کو مخاطب کر کے فرمانِ ربی کا اعلان کر رہے تھے۔ ان کے تختِ شہنشاہی کا مند و بالیں ایک روپیہ سے زیادہ قیمت کا نہ تھا۔ یعنی، مارکس اور ماؤ کے عاشق و شیدا ذرا اس کی جانب بھی تھوڑی سی توجہ فرمالیں تو بہتر ہوگا۔

ریگستان عرب کا ذرہ ذرہ اس وقت اسلام کے نور سے منور تھا اور خانہ کعبہ جو حقیقتاً اولیں مرکز توحید تھا ہمیشہ کے لیے ملتِ ابراہیمی کا مرکز بن چکا تھا اور آج ان کا ایک عظیم فرزند ان کی دعاؤں کا مصداق بنا ہوا پیشوائی امت کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اسوقت فتنہ پرداز قوتیں پامال ہوچکی تھیں، اسی بنا پر آپؐ نے فرمایا:

"ہاں، شیطان اس بات سے مایوس ہوچکا کہ اب تمہارے اس شہر میں اس کی پرستش قیامت تک نہ کی جائے گی"

لیکن البتہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں اس کی پیروی کرو گے
اور وہ اس پر خوش ہوگا۔"

خطبہ حجۃ الوداع میں سب سے آخر میں آپ ؐ نے اسلام کے فرائضِ اولین یاد دلائے:

"اپنے پروردگار کو پوجو، پانچوں وقت کی نماز پڑھو، مہینہ کا روزہ رکھو۔ اور میرے احکام کی اطاعت کرو۔ خدا کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔"

لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا:

" جو لوگ اس وقت موجود ہیں وہ میرے احکام اُن تک پہنچا دیں جو اس وقت موجود نہیں ہیں"۔ اس سے مراد آنے والی نسلیں بھی ہو سکتی ہیں۔ مدینہ کے قریب پہنچ کر ذو الحلیفہ میں شب بسر کی۔ صبح کے وقت ایک طرف سے آفتاب نکلا اور دوسری طرف کوکبِ نبوت مدینہ منورہ میں داخل ہوا۔ مدینہ کی عمارات پر نظر پڑی تو ارشاد فرمایا:

"خدا بزرگ و برتر ہے، اس کے سوا کوئی خدا نہیں، کوئی اس کا شریک نہیں، بس اسی کی سلطنت ہے، اسی کے لیے مدح و ستائش ہے، وہ ہر بات پر قادر ہے ہم لوٹے آ رہے ہیں توبہ کرتے ہوئے فرمانبردارانہ زمین پر پیشانی رکھ کر، اپنے پروردگار کی مدح و ستائش میں مصروف ہو کر، خدا نے اپنا وعدہ سچا کیا، اپنے بندے کی نصرت کی اور تمام قبائل کو شکست دی۔"

صفر ۱۱ھ میں آدھی رات کو آپ ؐ جنت البقیع میں (جو عام مسلمانوں کا قبرستان تھا) تشریف لے گئے۔ وہاں

سے واپس تشریف لائے تو مزاج ناساز تھا۔ آمد و رفت کی قوت جب تک رہی آپ مسجد میں نماز پڑھانے کی غرض سے تشریف لاتے رہے۔ سب سے آخری نماز جو آپ نے پڑھائی وہ ۲۸۔ صفر کی نمازِ مغرب تھی۔ سر میں درد کی شکایت تھی، مرض میں کمی اور زیادتی ہوتی رہی، ۲۸ صفر کو جس دن آپ نے رحلت فرمائی اس دن بظاہر طبیعت کو سکون تھا۔ اور آپ اس حجرہ میں تھے جو مسجد سے بالکل متصل تھا۔

اسلام اور دیگر مذاہب میں ایک دقیق فرق یہ ہے کہ اسلام شریعت کے تمام احکام کا واضع اور حاکم براہ راست خدائے پاک کو قرار دیتا ہے۔ پیغمبرؐ کا صرف اس قدر فرض ہے کہ احکامِ الٰہی کو اپنے قول و عمل کے ذریعہ بندوں تک پہنچا دے چونکہ دوسرے مذاہب میں یہ غلط فہمی شرک اور کفر تک پہنچ چکی تھی اور اس کے نتائج پیش نظر تھے اس لیے ارشاد ہوا:

۱۔ "حلال اور حرام کی نسبت میری طرف نہ کی جائے، میں نے وہی چیز حلال کی ہے جو خدا نے اپنی کتاب میں حلال کی ہے اور وہی چیزیں حرام کی ہیں جو خدا نے حرام کی ہیں۔"

۲۔ "انسان کی جزا اور سزا کی بنیاد خود اس کے ذاتی عمل پر ہے"۔ آپ نے فرمایا: "اے پیغمبرِ خدا کی بیٹی فاطمہ [illegible] خدا کے یہاں کے لیے کچھ کرلو۔ میں تمہیں خدا سے نہیں بچا سکتا۔"

اسلاف کے عظیم کارنامے اور جزیرہ نمائے عرب کا سیاسی مد و جزر اور پھر اس کے بعد اسلام کا عروج اور اسلامی مملکت کا قیام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رحلت کے بعد عرب سیاست میں اہم تبدیلیاں حضرت امام حسین علیہ السلام کے پیش نظر تھیں۔

تیسرا حِصّہ

کربلا ——!

امام حسن علیہ السلام کی شہادت
کے بعد بھی معاویہ کا رویہ اہل بیتؑ کے ساتھ مناسب نہ تھا. مختلف اوقات میں
اس کا اظہار ہوتا رہا ۔ جب معاویہ نے یزید کی خلافت پر بیعت
لینے کا ارادہ کیا تو یہ بات واضح طور پر سامنے آگئی. چنانچہ ابن اثیر
اپنی تاریخ کی جلد اول صفحہ ۹۲-۹۱ پر لکھتے ہیں کہ" جب معاویہ

مدینہ کے قریب پہنچے تو راستہ میں سب سے پہلے امام حسین (علیہ السلام) ابن علیؑ ملے۔ معاویہ نے انہیں دیکھتے ہی کہا کہ میں ایسے شتر قربانی کو مرحبا و خوش آمدید نہ کہوں گا جس کا خون بہنے والا ہو اور خدا ہی بہا دے گا۔ انہوں نے کہا کہ سنبھل کر بولو قسم بخدا ایسی باتیں میری شان کے خلاف ہیں۔ امیر معاویہ نے کہا کہ ہاں ضرور ہو بلکہ اس سے بھی بدتر کے لائق ہو۔" اس کے بعد معاویہ نے ان چاروں بزرگوں یعنی امام حسین علیہ السلام عبدالرحمٰن ابن ابوبکرؓ، عبداللہؓ ابن زبیرؓ اور عبداللہؓ ابن عمرؓ سے خلافت یزید کے سلسلے میں گفتگو کی لیکن جب ان حضرات میں سے کسی نے بھی بیعت کا اقرار نہ کیا تو ابن اثیر کے بقول" امیر معاویہ بولے کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ کو پہلے ہی سے بات جتا دوں کہ جو ڈرا وہ اپنا عذر پورا کر چکا، میں اب لوگوں سے گفتگو کرتا ہوں ایسا نہ ہو کہ آپ لوگوں میں، کوئی کھڑا ہو کر لوگوں کے سامنے میری تکذیب کرے تو میں اسے برداشت کر لوں اور اسے معاف کر دوں۔ میں ایک تقریر کرنے والا ہوں اور قسم بخدا کہ اگر آپ میں سے کسی نے میری بات کو رد کیا تو ابھی دوسری بات اس کے منہ تک نہ آنے پائے گی کہ تلوار اس کے سر تک پہنچ جائے گی۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ ہر شخص اپنے اوپر ہی رحم کرے گا۔" یہ کہہ کر ان کی موجودگی میں اپنے محافظ (صاحب حرس) کو بلایا اور کہا کہ ان میں سے ہر ایک کے سر پر دو دو آدمیوں کو تلوار لے کر کھڑا کر دو۔ اگر ان میں سے کوئی تصدیق یا تکذیب کے ساتھ میری بات کاٹے تو ان دونوں کو چاہیئے کہ تلوار سے اس کا کام تمام کر دے۔ اس کے بعد امیر معاویہ اور ان کے ساتھ وہ سب بھی باہر نکلے تا آں کہ امیر معاویہ نے منبر پر چڑھ کر تقریر کرنا شروع کی جس میں خدائے تعالیٰ کی حمد و ثناء کے بعد کہا کہ اس جماعت میں مسلمانوں کے سردار اور بہترین لوگ شامل ہیں۔ کوئی امر بغیر ان کے پورا نہیں ہوتا اور بغیر ان کے مشورہ کے نہیں کیا جاتا۔ یہ حضرات راضی ہیں اور یزید سے بیعت کرتے ہیں۔ اس لیے تم سب بھی خدا کا

نام لے کر بیعت کر لو۔ چنانچہ لوگوں نے بیعت کی کیونکہ سب لوگ ان حضرات کی بیعت کے ہی منتظر تھے۔ (ابن اثیر ج ۱ ص ۹۳-۹۴)

یزید کی تخت نشینی اور امام حسین علیہ السلام سے بیعت کا مطالبہ

۶۰ھ ہجری میں معاویہ کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد یزید (جس کی بیعت معاویہ اپنی زندگی ہی میں لے چکا تھا) اس کا جانشین ہوا، تخت حکومت پر قدم رکھنے کے بعد یزید کے لیے سب سے اہم معاملہ حضرت امام حسین علیہ السلام اور عبداللہ ابن زبیر کی بیعت کا تھا، کیونکہ یزید کی ولی عہدی کی بیعت کے وقت ان دونوں نے اس کو نہ دل سے تسلیم کیا تھا اور نہ زبان سے اقرار کیا تھا، اور ان کی بیعت نہ کرنے کی صورت میں خود ان کی جانب سے دعویٰ خلافت اور حجاز میں یزید کی مخالفت کا خطرہ تھا کیونکہ ان کے دعویٰ خلافت سے سارا حجاز یزید کے خلاف کھڑا ہو جاتا اور امام حسین علیہ السلام کیوجہ سے عراق میں بھی شورش بپا ہو جاتی، جیسا کہ آئندہ چل کر ابن زبیر کے دعویٰ خلافت کے زمانے میں ہوا۔ کہ شام کے بعض حصوں کے سوا قریب قریب پورا ملک ابن زبیر کے ساتھ ہو گیا۔ ان اسباب کی بنا پر اپنی حکومت کی بقاء اور تحفظ کے لیے یزید نے ان دونوں سے بیعت لینا ضروری سمجھا، گو یہ اس کی ناعاقبت اندیشی تھی اور اگر وہ سمجھداری سے کام لے کر ان بزرگوں کے ساتھ نرمی کرتا تو بہت ممکن تھا کہ وہ ناگوار واقعات پیش نہ آتے جنہوں نے نہ صرف یزید کو ساری دنیا میں بدنام بلکہ اموی حکومت کو لوگوں کی نگاہوں میں مطعون کر دیا، جس کا اثر اموی حکومت پر بہت بُرا پڑا۔

لیکن یزید نے ان تمام پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا اور ابن اثیر کے بقول "جس وقت عنان حکومت اس کے ہاتھ میں آئی، اسوقت مدینہ میں ولید ابن عتبہ ابن ابو سفیان، مکہ میں عمر ابن

سعید ابن العاص، بصرہ میں عبیداللہ ابن زیاد اور کوفہ میں نعمان ابن بشیر حاکم تھے۔
یزید کے سامنے یہ ہی ایک امر اہم تھا کہ جن لوگوں نے امیر معاویہ کے سامنے یزید کی بیعت کرنے سے انکار کردیا تھا۔ ان سے بیعت لی جائے، اس نے ولید کو ایک خط لکھا جس میں امیر معاویہ کی وفات کی خبر دی اور اس کے ساتھ ایک اور چھوٹا سا خط لکھا جس میں تھا کہ امابعد حسین (علیہ السلام) عبداللہ ابن عمرؓ ابن زبیرؓ کو بیعت کے لیے اسطرح پکڑو جب تک بیعت نہ کریں مطلق نہ چھوڑو، والسلام۔

(ابن اثیر ج ۱ ص ۱۰۹)

اس حکم کے بعد ولید نے امام حسین علیہ السلام کو دربار میں بُلایا چونکہ ولید اس سے پہلے عام ملاقات کے امتناع کا حکم جاری کرچکا تھا اس لیے اس پیغام سے امام حسین علیہ السلام کو آنے والے واقعات کا اندازہ ہوگیا اور وہ جناب عباسؑ اور حضرت علی اکبرؑ اور چند اور جوانانِ بنی ہاشم کو لے کر دربار میں تشریف لائے اور ان حضرات کو کمرہ ملاقات کے باہر ٹھیرنے کا حکم دیتے ہوئے ہدایت کی کہ جب میری آواز بلند ہو تو تم لوگ اندر آجانا۔ دربار میں ولید اور مروان آپس میں مشورہ کرچکے تھے اور مروان کا مشورہ یہ تھا کہ اگر بیعت سے انکار کیا جائے تو اسی وقت کام تمام کردینا چاہیے لیکن ولید اس پر راضی نہ تھا چنانچہ امام حسین علیہ السلام کو معاویہ کے انتقال کی خبر کے ساتھ یزید کا حکم بھی سنایا گیا۔ امام علیہ السلام نے انکار کیا، گفتگو میں کچھ تلخی پیدا ہوئی اور جوانانِ بنی ہاشم اندر آگئے۔ امام علیہ السلام نے انہیں روکا اور ولید سے کہا کہ یہ معاملہ چونکہ اہمیت کا حامل ہے لہذا بہتر یہ ہے کہ اسے مجمع عام میں طے کیا جائے اس کے بعد امام علیہ السلام واپس تشریف لے آئے اور مکہ کی طرف روانگی کے عزم کے اظہار کے ساتھ ساتھ اہل خاندان کو کوچ کی تیاری کا حکم بھی دے دیا۔ اس پر مدینہ میں ہل چل مچ گئی اور بزرگ اور با اثر حضرات امام علیہ السلام کو

روکنے کے لیے طرح طرح کے مشورے دینے لگے جن میں قابل ذکر حضرت محمد ابن حنفیہ۔ عبداللہ ابن مطیعؒ وغیرہ وغیرہ ہیں لیکن امام علیہ السلام نے اپنا فیصلہ بدلنے سے معذرت کر لی اور ۲۸ رجب ۶۰ھ کو یہ قافلہ تمام تر شان و شوکت کے ساتھ مکہ کے لیے روانہ ہو گیا۔

تحقیق حال کیلئے حضرت مسلمؑ بن عقیلؑ کی کوفہ روانگی اور راہ کے شدائد

مکہ پہنچنے کے بعد حضرت امام حسین علیہ نے شعب ابو طالب (یہ وہی گھاٹی ہے جس میں آغازِ اسلام میں قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور آپؐ کے ساتھ آپؐ کے ساتھیوں اور ہوا خواہوں کو تبلیغ اسلام کے جرم میں نظر بند کیا تھا) میں قیام کیا، آپؑ کی آمد کی خبر سُن کر لوگ جوق در جوق زیارت کے لیے آنے لگے۔ اور کوفیوں کے بلاوے کا تانتا بندھ گیا۔

کوفہ کے وفود نے آکر عرض کیا کہ آپؑ جلد سے جلد کوفہ تشریف لے چلئے وہاں کی مسند خلافت آپؑ کے لیے خالی ہے اور ہماری گردنیں آپ کے لیے حاضر ہیں، حضرت امام حسین علیہ السلام نے یہ اشتیاق دیکھ کر فرمایا میں تمہاری محبت اور ہمدردی کا شکر گذار ہوں لیکن فی الحال نہیں جا سکتا، پہلے اپنے بھائی مسلم ابن عقیلؑ کو بھیجتا ہوں، یہ وہاں کے حالات کا اندازہ لگا کر مجھے اطلاع دینگے۔ اسوقت میں کوفہ کا قصد کروں گا، چنانچہ مسلم کو ایک خط دے کر کوفہ روانہ کر دیا، کہ وہ براہ راست خود حالات کا صحیح اندازہ لگا کر اطلاع دیں اور اگر حالات کا رخ کچھ بدلا ہوا دیکھیں تو لوٹ آئیں۔ چنانچہ حضرت مسلم دو آدمیوں کو لے کر کوفہ روانہ ہو گئے، راستہ میں بڑی دشواریاں پیش آئیں۔ آئیں۔ پانی کی قلت کیوجہ سے دونوں آدمی ہلاک ہو گئے۔ مسلمؑ نے کوفہ کے قریب پہنچ کر حضرت امام حسین علیہ السلام کو خط

لکھا کہ میں ان دشواریوں کے ساتھ یہاں تک پہنچا ہوں لیکن امام علیہ السلام نے جواب میں لکھا، ہمت نہ ہارو۔ اسلیے مسلم کو چارو ناچار کوفہ میں داخل ہونا پڑا، کوفہ والے چشم براہ ہی تھے، مسلم کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کے پہنچتے ہی کوفہ میں یزید کی علانیہ مخالفت شروع ہوگئی۔

یزید کو حضرت مسلم کے پہنچنے کی اطلاع اور امام علیہ السلام کے بصری قاصد کا قتل

مسلم کے کوفہ پہنچنے کے بعد حکومت شام کے جاسوسوں نے پایہ تخت دمشق اطلاع بھیجی کہ حسین (علیہ السلام) کی طرف سے مسلم بیعت لینے کے لیے کوفہ آگئے ہیں اگر سلطنت کی بقا منظور ہے تو اس کا فوری تدارک ضروری ہے۔ اس اطلاع پر دربارِ دمشق سے عبیداللہ ابن زیاد کے نام تاکیدی حکم آیا کہ تم فوراً کوفہ جا کر مسلم کو خارج البلد کردو۔ اور وہ مزاحمت کریں تو قتل کردو۔ ابن زیاد کو بصرہ میں یہ فرمان ملا، اتفاق سے اسی دن حضرت امام حسین علیہ السلام کا ایک اور قاصد اہل بصرہ کے نام بھی آپ کا خط لے کر آیا تھا، بصرہ والوں کو یزید کے فرمان کا علم ہوچکا تھا، اسلیے انہوں نے اس قاصد کو چھپا دیا۔ مگر ابن زیاد کے مخبر کو اس کا علم ہوگیا تھا، اس نے ابن زیاد کو خبر کردی، ابن زیاد نے اسی وقت قاصد کو گرفتار کرکے قتل کرا دیا اور جامع بصرہ میں تقریر کی کہ" امیرالمومنین نے مجھے بصرہ کے ساتھ کوفہ کی حکومت بھی مرحمت فرمائی ہے۔ اس لیے میں وہاں جا رہا ہوں، میری عدم موجودگی میں میرا بھائی عثمان میری نیابت کرے گا۔ تم لوگوں کو اختلاف اور شورش سے بچنا چاہیئے۔ یاد رکھو جس کے متعلق مجھے ان میں حصہ لینے کی اطلاع ملے گی اس کو اور اس کے حامی دونوں کو قتل کرا دوں گا۔ اور قریب و بعید اور گنہگار و ناکردہ گناہ سب کو ایک گھاٹ اتار دوں گا۔ تاکہ تم لوگ راہِ راست پر آجاؤ، میرا

فرض سمجھانا تھا اسے میں نے پورا کر دیا۔ اب میں بری الذمہ ہوں۔"

کوفہ میں ابن زیاد کا ورود اور پہلی تقریر

اس تہدید آمیز تقریر کے بعد ابن زیادہ بصرہ سے کوفہ روانہ ہوگیا، اہل کوفہ حضرت امام حسین علیہ السلام کے لیے چشم براہ تھے اور آپؑ کے دھوکے میں ہر باہر سے آنے والے کو دیکھ کر مرحبا یا ابن رسولؐ اللہ کا نعرہ لگاتے تھے۔ اس لیے ابن زیاد کوفہ میں جن راستوں سے گذرا، یہی نعرہ سنائی دیا، ان کو سن کر وہ جوش غضب سے لبریز ہوگیا اور سیدھا جامع مسجد پہنچا اور لوگوں کو جمع کر کے تقریر کی کہ " باشندگان کوفہ! امیرالمومنین نے مجھے تمہارے شہر کا حاکم بنا کر بھیجا ہے اور مظلوم کے ساتھ انصاف مطیع و منقاد کے ساتھ احسان اور نافرمان اور باغی کے ساتھ سختی کا حکم دیا ہے۔ میں اس حکم کی بھی پابندی کروں گا، فرمانبرداروں کے ساتھ پدرانہ شفقت سے پیش آؤں گا لیکن مخالفوں کیلئے سم قاتل ہوں۔"

کوفہ میں مسلمؑ کا خفیہ سلسلۂ بیعت

اس اعلان کے بعد جناب مسلمؑ نے حالات کو بھانپنے کے بعد روپوش ہونے کا فیصلہ کیا اور رات کو اپنی قیام گاہ سے نکل کر اہل بیتؑ کے ایک ہواخواہ ہانی بن عروہ مذحجی کے یہاں پہنچے۔ ابن زیاد کے اعلان سے سب خوفزدہ ہو رہے تھے اس لیے ہانی کو پہلے مسلم کے ٹھیرانے میں تذبذب ہوا لیکن پھر زنانہ مکان کے ایک حصہ میں چھپا دیا۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کا ایک بڑا حامی شریک بن عود سلمی جو بصرہ کا ایک بڑا مقتدر اور معزز شخص تھا، عبیداللہ ابن زیاد کے ساتھ کوفہ آیا ہوا تھا، اس تعلق سے ہانی نے اسے بھی اپنا مہمان بنایا اور مسلم کے ساتھ ٹھیرایا۔ اس نے ہانی کو مسلم کی امداد پر آمادہ کیا، اور مسلم کے پاس حضرت امام حسین علیہ السلام کے حامیوں کی خفیہ آمد و رفت شروع ہوگئی، اور ان کی بیعت

کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ سوء اتفاق سے اسی دوران میں شریک بیمار پڑ گیا۔ ابن زیاد کو خبر ہوئی تو وہ عیادت کے لیے آیا، اس کے آنے کی خبر سن کر شریک نے پہلے سے اس کا قصہ چکانے کا بندوبست کر لیا اور مسلمؑ کو ایک خفیہ مقام پر چھپا کر ہدایت کر دی کہ وہ موقع پاتے ہی نکل کر ابن زیاد کا کام تمام کر دیں۔ اس کے بعد بصرہ کی مسند خلافت تمہارے لیے خالی ہو جائے گی۔ اور کوئی مزاحم باقی نہ رہے گا۔ ہانی نے اپنے گھر میں یہ صورت ناپسند کی لیکن شریک نے اس قتل کو مذہبی خدمت بتا کر ہانی کو آمادہ کر لیا، اس کے بعد ہی عبیداللہ ابن زیاد عیادت کے لیے آ گیا اور دیر تک بیٹھا رہا مگر مسلم نہ نکلے، شریک نے اشارہ بھی کیا مگر کسی وجہ سے مسلم نے حملہ مناسب نہ سمجھا، اور ابن زیاد بچ کر نکل گیا۔ اس کی واپسی کے بعد شریک نے کہا کہ تم نے بڑی بزدلی سے کام لیا، مسلم نے جواب دیا اول ہمارے میزبان ہانی کو یہ صورت پسند نہ تھی دوسرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا یہ فرمان ہے کہ ایمان اچانک حملے سے روکتا ہے اور اچانک حملہ، مسلمانوں کے شایانِ شایان نہیں اس فرمان رسولؐ کی واضح مثال جنگِ بدر میں ملتی ہے جبکہ آنحضرتؐ نے فرمایا تھا کہ لڑائی میں پہل کرنے والا ظالم ہے پھر بھلا خانوادۂ رسالتؐ کا ایک فرد ایسے جرم کا مرتکب کیسے ہو سکتا تھا۔ یہ اس کی بزدلی نہ تھی بلکہ عین ایمان تھا۔ بہرحال مسلمؑ نے اپنی دینداری کی بنا پر ابن زیاد کے قتل کا بہترین موقع کھو دیا، لیکن اس کے بعد بھی سلسلہ بیعت برابر جاری رہا اور اٹھارہ ہزار اہل کوفہ ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے حضرت امام حسین علیہ السلام کے دائرہ عقیدت میں شامل ہو گئے۔

ہانی مذحجی کا قتل ابن زیاد کو مسلم کی تلاش میں عرصہ گذر چکا تھا لیکن ابھی تک اُسے ان کا پتہ نہ چلتا تھا آخرکار اس نے اپنے غلام معقل کو سراغ رسانی پر مامور کیا، اس قسم کی

خفیہ تحریکوں کا پتہ چلانے کا بہترین مقام مسجد تھی کیونکہ مسجد میں ہر قسم کے لوگ آتے تھے اس لیے یہ غلام سیدھا جامع مسجد پہنچا یہاں دیکھا کہ ایک شخص مسلسل نمازیں پڑھ رہا ہے، معقل نے نمازوں کی کثرت سے قیاس کیا کہ یہ حضرت امام حسین علیہ السلام کے حامیوں میں سے ہے، اور اس کے پاس جا کر کہا کہ میں شامی غلام ہوں، خدا نے میرے دل میں اہل بیتِ نبوی ؑ کی محبت ڈال دی ہے میرے پاس تین ہزار درہم ہیں، میں نے سنا ہے کہ یہاں حضرت امام حسین علیہ السلام کا کوئی داعی آیا ہوا ہے، میں اس کی خدمت میں یہ حقیر رقم نذر کے طور پر پیش کرنا چاہتا ہوں، کہ وہ اس کو کسی کارِ خیر میں صرف کریں، یہ سن کر داعی نے سوال کیا، کہ مسجد میں اور مسلمان بھی ہیں تم نے خاص طور پر مجھ سے یہ سوال کیوں کیا؟ معقل نے جواب دیا، کہ آپ کے چہرے پر خیر کے آثار نظر آئے۔ معقل کی اس پُرفریب گفتگو سے وہ شخص دام میں آگیا اور اس کو معقل کی حمایت حسین علیہ السلام کا یقین ہوگیا، چنانچہ اس ملاقات کے دوسرے دن معقل اس داعی کے ہمراہ مسلم کے پاس پہنچا اور تین ہزار درہم نذر پیش کر کے بیعت کی اور حالات کا پتہ چلانے کے لیے اظہارِ عقیدت و خدمت کے بہانے ان ہی کے پاس رہنے لگا۔ رات بھر مسلم کے پاس رہتا اور دن کو ابن زیاد کے پاس جا کر مفصل رپورٹ پہنچاتا۔ ہانی چونکہ مقتدر آدمی تھے، اس لیے پہلے ابن زیاد کے پاس آیا جایا کرتے تھے مگر جب سے مسلم کے مشن کے کارکن ہوگئے تھے، اس وقت سے بیماری کا بہانہ کر کے آنا جانا ترک کر دیا تھا۔ ایک دن ابن زیاد کے پاس محمد ابن اشعث اور اسما بن خارجہ آگئے، ابن زیاد نے اُن سے پوچھا کہ ہانی کا کیا حال ہے، انہوں نے کہا بیمار ہیں، ابن زیاد نے کہا کیسے بیمار ہیں کہ دن بھر اپنے دروازہ پر بیٹھے رہتے ہیں؟ یہ دونوں یہاں سے واپس گئے تو ہانی سے ابن زیاد کا

سوءِ ظن بیان کیا اور کہا تم ابھی ہمارے ساتھ چلے چلو تاکہ اسی وقت معاملہ صاف ہو جائے۔ ان دونوں کے کہنے پر ہانی ان کے ساتھ ہو گئے مگر دل میں چور تھا اس لیے قصرِ امارت کے پاس پہنچ کر ان کو خوف پیدا ہوا اور انہوں نے کہا کہ مجھے اس شخص سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ محمد بن اشعث نے اطمینان دلایا کہ ڈر نے کی کوئی وجہ نہیں تم بالکل بری الذمہ ہو اور ہانی کو اندر لے گئے۔ ابن زیاد کو تمام خفیہ حالات کی اطلاع ہو چکی تھی، اس نے ہانی کو دیکھتے ہی ایک شعر پڑھا جس کا ترجمہ یہ ہے:

"میں اس کو انعام دینا چاہتا ہوں اور وہ مجھے قتل کرنا چاہتا ہے، قبیلہ مراد سے اپنے کسی دوست کو معذرت کے لیے لا"

ہانی نے یہ شعر سن کر پوچھا اس کا کیا مطلب ہے؟ ابن زیاد نے جواب دیا مطلب پوچھتے ہو، مسلم کو چھپانا، ان کی بیعت کے لیے لوگوں کو خفیہ جمع کرنا، اس سے بڑھ کر سنگین جرم اور کیا ہو سکتا ہے؟ ہانی نے اس الزام سے انکار کیا۔ ابن زیاد نے اسی وقت معقل کو طلب کیا اور ہانی سے کہا اس کو پہچانتے ہو؟ معقل کو دیکھ کر ہانی کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے اب وہ سمجھے کہ یہ تشیع کے بھیس میں جاسوسی کر رہا تھا۔ اس عینی شہادت کے سامنے انکار کی گنجائش نہ تھی۔ اس لیے صاف صاف اقرار کر لیا کہ آپ سچ کہتے ہیں لیکن خدا کی قسم میں نے مسلم کو بلایا نہیں تھا اور کل واقعہ صحیح صحیح بیان کر کے وعدہ کیا کہ ابھی جا کر انہیں اپنے گھر سے نکالے دیتا ہوں نکال کر واپس آتا ہوں لیکن ابن زیاد نے اس کی اجازت نہ دی اور کہا کہ خدا کی قسم تم اسوقت تک یہاں سے واپس نہیں جا سکتے جب تک مسلم یہاں نہ آجائیں، ہانی نے جواب دیا یہ نہیں ہو سکتا۔ خدا کی قسم میں اپنے مہمان اور پناہ گزین کو قتل کے لیے کبھی تمہارے حوالے نہیں کروں گا۔

یہ جواب سن کر ابن زیاد غصہ سے بے قابو ہوگیا اور اس زور سے ہانی کو بید مارا کہ ان کی ناک پھٹ گئی اور ابرو کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اور انہیں ایک گھر میں ڈلوا دیا

(اخبار الطوال ص ۴۸ - ۴۵۱)

ادھر شہر میں یہ افواہ پھیل گئی کہ ہانی قتل کر دیئے گئے یہ سن کر ہانی کے قبیلے والے ہزاروں کی تعداد میں قصر امارت پر ٹوٹ پڑے اور انتقام انتقام کا نعرہ لگانے لگے۔ یہ نازک صورت حال دیکھ کر ابن زیاد بہت گھبرایا اور قاضی شریح سے کہا کہ آپ ہانی کو اپنی آنکھ سے دیکھ کر ہانی کے قبیلے والوں کو اطمینان دلا دیجئے کہ وہ قتل نہیں کیے گئے۔ چنانچہ قاضی صاحب ہانی کے معائنہ کے لیے گئے، ہانی اپنے قبیلے والوں کا شور و ہنگامہ سن رہے تھے، قاضی صاحب کو دیکھ کر کہا کہ یہ آوازیں میرے قبیلے والوں کی معلوم ہوتی ہیں۔ انہیں آپ اتنا پیام پہنچا دیجئے کہ اگر اس وقت ان لوگوں میں سے دس آدمی بھی آجائیں تو میں چھوٹ سکتا ہوں لیکن قاضی شریح کے ساتھ جاسوس لگا ہوا تھا اس لیے وہ یہ پیام نہ پہنچا سکے اور بنی مذحج کو ہانی کی زندگی کا یقین دلا کر واپس کر دیا۔

اہل کوفہ کی غداری اور مسلمؑ کی روپوشی

مسلم بن عقیلؑ نے ہانی کے قتل کی افواہ سنی تو اپنے اٹھارہ ہزار آدمیوں کے ساتھ قصر امارۃ پر حملہ کر کے ابن زیاد کو گھیر لیا۔ اس وقت ابن زیاد کے پاس صرف پچاس آدمی تھے، ۳۰ پولیس کے آدمی اور ۲۰ رزعماء کوفہ ان کے علاوہ مدافعت کی کوئی قوت نہ تھی اس لیے اُس نے محل کا پھاٹک بند کرا لیا اور لوگوں سے کہا کہ تم لوگ نکل کر اپنے اپنے قبیلوں کو تہدید اور تخویف، طمع و لالچ کے ذریعہ سے جس طرح بھی ہو سکے مسلم کے ساتھ سے علیحدہ کر دو اور عمائدین

کوفہ کو حکم دیا کہ قصر کی چھت پر چڑھ کر یہ اعلان کریں کہ اسوقت جو شخص امیر کی امداد کرے گا اس کو انعام واکرام ملے گا۔ اور جو بغاوت کرے گا اس کو نہایت سنگین سزا دی جائے گی، عمائدین کوفہ کے اس اعلان پر مسلم کے بہت سے ساتھی منتشر ہو گئے۔ شہر کے لوگ آتے تھے اور اپنے اعزہ و اقربا کو لے جاتے تھے اسطرح چھنٹتے چھنٹتے مسلم کے ساتھ کل ۳۰ آدمی رہ گئے، جب انہوں نے کوفی حامیانِ حسینؑ کی غداری دیکھی تو کندہ کے محلے کی طرف چلے گئے، یہاں باقی ماندہ بیسوں آدمیوں نے بھی ایک ایک کر کے ساتھ چھوڑ دیا اور مسلم تن تنہا رہ گئے، اس کسمپرسی کی حالت میں کوفہ کی گلیوں کی خاک چھانتے اور ٹھوکریں کھاتے ہوئے ایک عورت طوعہ نامی کے دروازے پر پہنچے، اس عورت کا لڑکا بلال شورش پسندوں کے ساتھ نکل گیا تھا وہ اس کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔ جناب مسلم اسکی چوکھٹ پر بیٹھ گئے اس نے اس حالت زار کو دیکھا تو اسے بہت رحم آیا اور اس نے جناب مسلم سے کہا کہ اس پر آشوب ماحول میں آپ یہاں کیوں بیٹھے ہیں اپنے گھر کیوں نہیں جاتے۔ جناب مسلم نے اپنی غریب الوطنی کا قصہ سُنایا تو اس نے ان کا حسب نسب دریافت کیا، جب اسے معلوم ہوا کہ جناب مسلمؑ خاندان اہل بیتؑ سے تعلق رکھتے ہیں اور امام حسین علیہ السلام کے قاصد ہیں تو اس نے باوجودیکہ معلوم تھا کہ حکومت ان کے خلاف ہے اور ان کی تلاش میں سرگرداں ہے جناب مسلم کو اپنے گھر میں پناہ دے دی۔ رات گئے جب اس کا لڑکا واپس لوٹا تو اس نے خلاف معمول ماں کو ایک کمرہ میں آتے جاتے دیکھ کر استفسار کیا۔ ماں نے بات کو چھپانے کی کوشش کی لیکن جب اصرار بڑھا تو اس نے اس شرط پر اسے پورے واقعہ سے آگاہ کر دیا کہ وہ اس کی خبر کسی کو نہ دے گا۔ لیکن بلال نے انعام کی لالچ میں عبدالرحمٰن ابن محمد اشعث کو یہ خبر پہنچا دی جب ابن زیاد کو یہ خبر ملی تو اس نے چھ یا سات سو سواروں کا

لشکر عبدالرحمٰن ابن اشعث کو دے کر خانہ بلال روانہ کردیا کہ وہ جناب مسلم کو گرفتار کر کے لائیں۔ جب یہ سوار طوعہ کے گھر کے قریب پہنچے اور ٹاپوں کی آواز جناب مسلم نے سنی تو نفس المھموم صفحہ ۵۰ کے مطابق جناب مسلم نے زرہ پہنی اور طوعہ کا شکریہ ادا کیا اور باہر نکل گئے۔ اسوقت تک فوج وہاں پہنچ چکی تھی چنانچہ جناب مسلم نے انتہائی بے جگری کے ساتھ مقابلہ کیا اور ان لوگوں کو پسپائی پر مجبور کردیا۔ یہاں تک کہ ابن اشعث کو ابن زیاد سے مزید کمک کا مطالبہ کرنا پڑا۔ ابن زیاد نے بہت جلی کٹی سنائیں تو اس نے جواب دیا کہ اے امیر میرا مقابلہ کوفہ کے کسی بقال سے نہیں ہے نہ حیرہ کے کسی فرد سے بلکہ میرا مقابلہ ایک بپھرے ہوئے شیر اور برہنہ تلوار رکھنے والے ایک ایسے عظیم بہادر سے ہے جو بہترین خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ عبدالرحمٰن نے پیغام دیا کہ انہیں امان دے دو کیونکہ اس کے علاوہ کسی دوسری صورت سے مسلم پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔ کمک آئی جناب مسلم بے جگری کے ساتھ لڑتے رہے یہاں تک کہ دشمنوں کو امان دینا پڑی۔ جناب مسلم کو اگرچہ اس امان پر اعتماد نہ تھا لیکن چونکہ زخموں سے بری طرح نڈھال ہو چکے تھے اور دشمن ان کو دھوکہ کے ذریعے اپنی گرفت میں لے چکے تھے اسلیے جناب مسلم نے خود کو دشمن کے سپرد کردیا۔ ابن اشعث انتہائی بے حرمتی کے ساتھ جناب مسلم کو دربار تک لایا اور ابن زیاد سے کہا کہ میں مسلم کو امان دے چکا ہوں، لیکن ابن زیاد نے اسے تسلیم نہیں کیا اور کہا، تم کو امان دینے کا کیا اختیار تھا۔ میں نے تم کو صرف گرفتار کرنے کے لیے بھیجا تھا، اس کی ڈانٹ سُن کر محمد ابن اشعث خاموش ہو گیا، مسلم بہت پیاسے تھے، قصر امارت کے پھاٹک پر ٹھنڈا پانی نظر آیا، اسے مانگا، مسلم بن عمرو باہلی نے جواب دیا دیکھتے ہو کتنا ٹھنڈا پانی ہے لیکن اس میں سے تم کو ایک قطرہ بھی نہیں مل سکتا، تم کو اس کے عوض آتشِ دوزخ کا کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا۔ اس کے بعد مسلم نے پوچھا تم کون ہو؟

ابن عمرو نے جواب دیا، میں وہ ہوں' جس نے حق کو اسوقت پہنچانا جب تم نے اسے چھوڑ دیا اور امت مسلمہ اور امامِ وقت کا خیر خواہ رہا، جب تم نے ان کے ساتھ گھاٹ کی اور اس کا مطیع ومنقاد رہا۔ جب تم نے سرکشی کی، میں مسلم بن عمرو ہوں"۔
جناب مسلم بن عقیل نے یہ جواب سن کر کہا، تیری ماں تجھے روئے' تو بھی کسقدر سنگ دل' شقی القلب' ظالم اور درشت خو ہے' باہلہ کے بچے تو مجھ سے زیادہ کھولتے ہوئے پانی اور دائمی دوزخ کا حقدار ہے"۔
ایک روایت ہے کہ عمارہ نے اپنے غلام قیس کو بھیجا وہ اپنی مٹکی لے کر آیا۔ اس پر رومال پڑا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ایک کٹورا تھا۔ کٹورے میں پانی انڈیل کر اس نے مسلم کو دیا یہ جب پینا چاہتے تھے کٹورا خون سے بھر جاتا تھا اور جب تیسری مرتبہ غلام نے کٹورا بھر کر دیا اور مسلم نے پینے کا ارادہ کیا تو سامنے کے دونوں دانت کٹورے میں آرہے' مسلم نے کہا الحمدللہ میری قسمت میں یہ پانی ہوتا تو میں پیتا۔
اب جناب مسلم کو ابن زیاد کے سامنے لے گئے تو انہوں نے سلام نہیں کیا۔ ایک سپاہی بولا تم امیر کو سلام نہیں کرتے جناب مسلم نے کہا امام حسین علیہ السلام کے سوا میرا کوئی امیر نہیں ہے۔ یہ تو مجھے قتل کرنا چاہتا ہے تو میرا سلام کیا۔ ابن زیاد نے جواب دیا "بیشک میں تجھے قتل کروں گا"۔
مسلم نے کہا اگر قتل ہی کرنا ہے تو پھر اپنے کسی قبیلے والے سے کچھ وصیت کرنے کی مہلت دو۔ ابن زیاد نے یہ درخواست قبول کرلی۔ اسوقت مسلم کے قریبی اعزہ میں عمر بن سعد پاس تھا۔ مسلم نے اس سے کہا، میں تم سے ایک راز کی بات کہنا چاہتا ہوں' عمر بن سعد نے سننے سے انکار کیا، اس کے انکار پر ابن زیاد نے عزت دلائی کہ اپنے ابن عم کو مایوس نہ کرنا چاہیئے۔ اس کے عزت دلانے پر عمر بن سعد جناب مسلم کے پاس گیا۔ انہوں نے وصیت کی کہ میں نے کوفہ میں سات سو درہم قرض لیے ہیں۔ میرے

بعد انہیں ادا کرنا اور میری لاش لے کر دفن کر دینا، امام حسین علیہ السلام آ رہے ہوں گے ان کے پاس آدمی بھیج کر راستہ سے واپس کر دینا، ابن سعد نے ابن زیاد سے ان باتوں کے بارے میں پوچھا، اس نے کہا جو وصیت مال کے متعلق ہے اس کے بارے میں تم کو پورا اختیار ہے، جیسا چاہو کرو، حسین کے بارے میں میرا طرز عمل یہ ہے کہ اگر وہ یہاں نہ آئیں گے تو میں خواہ مخواہ ان کا تعاقب نہ کراؤں گا۔ اور اگر آئے تو چھوڑ بھی نہیں سکتا، البتہ لاش کے بارے میں تمہاری سفارش سنی نہیں جا سکتی۔ جس نے ہماری اتنی مخالفت کی ہو اس کی لاش ہرگز اس طرز عمل کی مستحق نہیں۔ اور ایک روایت یہ ہے کہ لاش کے متعلق بھی اس نے کہا کہ قتل کرنے کے بعد ہمیں اس سے بحث نہیں کہ اس کے ساتھ کیا کیا جائے۔ (تاریخ طبری ج ۷ ص ۲۶۵-۲۶۶)

مسلم اور ابن زیاد کا آخری مکالمہ اور شہادت

اس وصیت کے بعد جناب مسلم دوبارہ ابن زیاد کے سامنے لائے گئے اور ان دونوں میں یہ مکالمہ ہوا، جس سے المیہ کربلا کا پس منظر بھی ظاہر ہو رہا ہے۔ اور معرفت مسلم بن عقیلؑ بھی سامنے آ جاتی ہے:

ابن زیاد: لوگ آپس میں متحد و متفق تھے تم ان میں تفرقہ [illegible] اختلاف پیدا کرانے کے لیے آئے؟

مسلم بن عقیل: یہ خلاف واقعہ ہے میں ہرگز اس مقصد کے لیے نہیں آیا بلکہ کوفہ والوں کا خیال تھا کہ تمہارے باپ نے ان کے بزرگوں اور نیک لوگوں کو قتل کیا، ان کا خون بہایا اور اسلامی خلافت کو چھوڑ کر قیصر و کسریٰ کا سا طرز اختیار کیا، اس لیے ہم یہاں قیام عدل اور کتاب اللہ کی دعوت دینے کے لیے آئے۔

ابن زیاد: (جو یہ چوٹیں سنکر غضبناک ہو گیا تھا بولا) فاسق تیرے

منہ پر زیب نہیں دیتا۔ کیا تو جب مدینہ میں بادہ نوشی کرتا تھا اس وقت ہم
یہاں عدل و کتاب اللہ پر عمل کی دعوت نہیں دیتے تھے ؟

مسلم بن عقیل: میں شراب پیتا تھا! خدا کی قسم وہ خوب جانتا ہے کہ تو جھوٹ بول رہا ہے
اور بغیر علم کے اتہام لگاتا ہے، جیسا کہ تو نے بیان کیا، میں ویسا نہیں ہوں،
مجھ سے زیادہ شراب نوشی کا وہ مستحق ہے جس کے ہاتھ مسلمانوں کے خون
سے آلودہ ہیں، جو خدا کی حرام کی ہوئی جانوں کو لیتا ہے اور بغیر قصاص
کے لوگوں کو قتل کرتا ہے، حرام خون بہاتا ہے، محض ذاتی عداوت،
غصہ اور سوء ظن کی بناء پر لوگوں کی جان لیتا ہے اور پھر ان ستم
آرائیوں پر اس طرح لہو و لعب میں مشغول ہے گویا اس نے کچھ کیا ہی نہیں۔

ابن زیاد: فاسق تیرے نفس نے تجھے ایسی چیز کی تمنا دلائی جس کا خدا نے تجھے
اہل نہ سمجھا، اسی لیے تیری آرزو پوری نہ ہونے دی۔

مسلم بن عقیل: پھر اس کا کون اہل تھا ؟

ابن زیاد: امیر المومنین یزید !

مسلم بن عقیل: [illegible] خدا کا شکر ہے، وہ ہمارے اور تمہارے درمیان جو فیصلہ
[illegible] ہے۔

ابن زیاد: [illegible] ہوتا ہے تم خلافت کو اپنا حق سمجھتے ہو؟

مسلم بن عقیل: خیال ہی نہیں بلکہ اس کا یقین ہے۔

ابن زیاد: اگر میں تم کو اس بری طرح قتل نہ کروں کہ تاریخ میں اسکی کوئی
مثال نہ ملے تو خدا مجھے قتل کرے۔

مسلم بن عقیل: بے شک اسلام میں تم کو ایسی نئی مثالوں کے قائم کرنے
اور نئی بدعات کے جاری کرنے کا حق ہے جو اس
میں نہیں ہیں، تم کو خدا کی قسم تم برے طریقے سے

قتل کرنا، بُرے طریقے سے مثلہ کرنا اور خبیث سیرت کی ایک برائی کو بھی نہ چھوڑو، ان برائیوں کا تم سے زیادہ کوئی مستحق نہیں ہے۔"

یہ دندان شکن جواب سن کر ابن زیاد بالکل بے قابو ہوگیا اور اس نے مسلم، حسین، علی (علیہما السلام) اور عقیل پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی، گالیاں برسانے کے بعد جلادوں کو حکم دیا کہ انہیں محل کی بالائی منزل پر لے جاکر قتل کر دو اور قتل کرنے کے بعد ان کا دھڑ نیچے پھینک دو، مسلم نے اس قتل بے گناہی کے خلاف پھر ایک مرتبہ احتجاج کیا۔ لیکن کون سننے والا تھا! آخر میں ابن زیاد نے یہ خدمت اس شخص کے سپرد کی جس کو مسلم نے زخمی کیا تھا تاکہ وہ انتقامی جذبہ کے ساتھ انہیں قتل کرے۔ چنانچہ یہ شخص مسلم کو مقتل کیطرف لے چلا۔ اسوقت مسلم کی زبان پر تکبیر، استغفار اور ملائکہ و رسل پر درود سلام جاری تھا اور ساتھ ساتھ کہتے جاتے تھے کہ "خدایا میرے اور ان لوگوں کے درمیان تو ہی فیصلہ کر، جنہوں نے کو دھوکہ دیا، جھٹلایا اور ذلیل کیا" جلاد نے مقام قتل پر لے جا کر گردن ماردی اور سر کے ساتھ دھڑ بھی نیچے پھینک دیا۔ اس دردناک طریقہ پر حضرت امام حسین (علیہ السلام) کا ایک نہایت قوی بازو ٹوٹ گیا۔ (تاریخ طبری ج ۷، ص ۶۵-۶۷)

حضرت امام حسین علیہ السلام کی کوفہ کی تیاریاں اور خیر خواہوں کے مشورے

یاد ہوگا کہ مسلم کو حضرت امام حسین علیہ السلام نے کوفہ کے حالات معلوم کر کے اطلاع دینے کے لیے بھیجا تھا، یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ مسلم جب کوفہ کو آئے تھے تو یہاں کے باشندوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا تھا اور اٹھارہ ہزار کوفیوں نے حضرت امام حسین علیہ السلام کی خلافت اور ان کی حمایت میں جنگ کرنے پر بیعت کی تھی۔ مسلم نے اپنی

گرفتاری سے قبل ان ظاہری حالات کو دیکھ کر حضرت امام حسین علیہ السلام کو لکھ بھیجا تھا کہ سارا شہر آپؑ کا منتظر ہے، فوراً تشریف لائیے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے خط پاتے ہی سفر کی تیاریاں شروع کر دیں، اس وقت تک آپؑ کو کوفہ کے نئے حالات کی کوئی اطلاع نہ تھی، تمام اہل کوفہ و مدینہ کوفیوں کی غداری اور بے وفائی سے واقف تھے، حضرت علی اور امام حسن علیہما السلام کے ساتھ ان لوگوں نے جو کچھ کیا تھا وہ نگاہوں کے سامنے تھا، اس لیے کسی نے بھی حضرت امام حسین علیہ السلام کا کوفہ جانا پسند نہ کیا، جب آپؑ کی تیاریوں کی خبر مشہور ہوئی تو تمام ہوا خواہوں نے آپؑ کو روکنے کی کوشش کی اور غالباً سب سے پہلے عمرو بن عبدالرحمٰنؓ نے عرض کی: "میں نے سنا ہے آپؑ عراق جا رہے ہیں، اگر یہ صحیح ہے تو آپؑ ایسے شہر میں جا رہے ہیں جہاں دوسرے کی حکومت ہے اور وہاں اس کے امراء و عمال موجود ہیں، جن کے قبضے میں بیت المال ہے عوام دنیا اور دولت کے بندے ہیں، اس لیے مجھ کو خوف ہے کہ جن لوگوں نے آپؑ کی مدد کا وعدہ کیا ہے وہی آپؑ سے لڑیں گے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے عمرو بن عبدالرحمٰنؓ کے ہمدردانہ مشورہ کا شکریہ ادا کیا۔ ان کے بعد حضرت عبداللہ ابن عباسؓ آئے اور پوچھا ابن عم لوگوں میں یہ خبر گرم ہے کہ آپؑ عراق جا رہے ہیں۔ کیا یہ صحیح ہے؟ امام حسین علیہ السلام نے جواب دیا، ہاں انشاء اللہ دو ایک دن میں جاؤں گا۔ ابن عباسؓ نے کہا "میں تم کو خدا کا واسطہ دلاتا ہوں اس ارادے سے باز آؤ۔ ہاں اگر عراقیوں نے شامی حاکم کو قتل کر کے شہر پر قبضہ کر لیا ہو اور اپنے دشمنوں کو وہاں سے نکال دیا ہو تو بخوشی جاؤ لیکن اگر عراقیوں نے تم کو ایسے حالات میں بلایا ہے کہ ان کا حاکم موجود ہے اس کی حکومت قائم ہے اس کے عمال خراج وصول کرتے ہیں تو یقین مانو کہ انہوں نے تم کو محض جنگ کے لیے بلایا ہے،

مجھ کو یقین ہے کہ یہ سب تم کو دھوکہ دے جائیں گے، تم کو جھٹلائیں گے، تمہاری مخالفت کریں گے اور تمہیں بے یارو مددگار چھوڑ دیں گے اور جب تمہارے مقابلے کے لیے بلائے جائیں گے تو تمہارے سب سے بڑے دشمن ثابت ہوں گے۔" حضرت امام حسین علیہ السلام نے فرمایا "میں استخارہ کروں گا، دیکھوں گا کیا جواب ملتا ہے۔"

ابن عباسؓ کے بعد ابن زبیرؓ آئے، انہوں نے یہ معلوم کرکے کہ عراقی پورے طور پر آپؑ کی امداد کے لیے آمادہ ہیں، پہلے کوفہ جانے کا مشورہ دیا لیکن پھر اس خیال سے کہ اس سے امام حسین علیہ السلام کو کوئی بدگمانی نہ پیدا ہو (اسلیے کہ خلافت کے جو مدعی ہو سکتے تھے دمشق میں ابن زبیرؓ ہی تھے) یہ صورت پیش کی کہ اگر آپؑ حجاز ہی میں رہ کر حصول خلافت کی کوشش کیجئے تو ہم سب بیعت کرکے آپؑ کی مدد کریں گے اور آپؑ کے خیر خواہ رہیں گے۔" حضرت امام حسین علیہ السلام نے فرمایا میں نے اپنے والدِ بزرگوارؑ سے یہ حدیث سُنی ہے کہ "حرم میں ایک مینڈھا ہے جس کی وجہ سے اسکی حرمت اُٹھ جائے گی۔" میں چاہتا ہوں کہ میں وہ مینڈھا نہ بنوں۔" اس کے بعد ابن زبیرؓ نے حضرت امام حسین علیہ السلام سے بہت اصرار کیا کہ آپؑ حرم میں بیٹھے رہیے، باقی کام میں انجام دوں گا۔ لیکن حضرت امام حسین علیہ السلام نے جواب دیا کہ اگر میں حرم سے ایک بالشت بھی باہر قتل کیا جاؤں تو وہ مجھے حرم میں قتل ہونے سے زیادہ پسند ہے اور کسی طرح حرم میں قیام کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔

اس کے دوسرے دن پھر ابن عباسؓ آئے اور کہا ابن عم، میرا دل نہیں مانتا، صبر کی صورت بنانا چاہتا ہوں مگر حقیقتاً صبر نہیں کر سکتا، مجھے اس راستہ میں تمہاری ہلاکت کا خوف ہے۔ عراقیوں کی قوم فریبی ہے، تم ہرگز ان کے فریب میں نہ جاؤ، مکہ ہی میں رہو، تم اہل حجاز کے سردار ہو اگر ان کا یہ دعوٰی صحیح ہے کہ وہ واقعی

تمہیں بلانا چاہتے ہیں تو ان کو لکھو کہ پہلے وہ اپنے دشمنوں کو نکال دیں، پھر تم جاؤ لیکن اگر نہیں رکتے اور یہاں سے جانے ہی پر اصرار ہے تو یمن چلے جاؤ وہ ایک وسیع ملک ہے، وہاں قلعے اور گھاٹیاں ہیں۔ تمہارے باپ کے حامی ہیں اور بالکل الگ تھلگ مقام ہے۔ تم اسی گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر لوگوں کو دعوتی خط لکھو اور ہر طرف اپنے وفد بھیجو۔ مجھ کو امید ہے اسطرح امن و عافیت کے ساتھ تمہارا مقصد حاصل ہو جائے گا۔ یہ سن کر حضرت امام حسین علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھ کو یقین ہے کہ آپ میرے شفیق ناصح ہیں، لیکن اب تو میں ارادہ کر چکا ہوں، حضرت ابن عباسؓ جب بالکل مایوس ہو چکے تو فرمایا، اچھا اگر جاتے ہو تو عورتوں اور بچوں کو ساتھ نہ لے جاؤ۔ مجھ کو خطرہ ہے کہ تم کو بھی عثمانؓ کی طرح اپنے بچوں اور عورتوں کے سامنے نہ قتل کر دیں اور وہ غریب دیکھتے رہ جائیں، لیکن کارکنان قضاء و قدر کو کچھ اور ہی منظور تھا، اسلیے ابن عباسؓ کی ساری کوششیں ناکام ثابت ہوئیں اور حضرت امام حسین علیہ السلام کسی بات پر رضامند نہ ہوئے۔ (طبری جلد ۷ ص ۲۷۴-۲۷۵)

پھر ابوبکر بن حارثؓ نے آکر عرض کیا کہ "آپؑ کے والد ماجدؑ صاحب اقتدار تھے، ان کی طرف مسلمانوں کا عام رجحان تھا۔ لوگ ان کے احکام پر سر جھکاتے تھے۔ شام کے علاوہ تمام ممالک اسلامیہ ان کے ساتھ تھے۔ اس اثر و اقتدار کے باوجود جب وہ معاویہ کے مقابلے میں نکلے تو دنیا کی طمع میں لوگوں نے انکا ساتھ چھوڑ دیا اور خدا کی مرضی پوری ہو کے رہی، ان کے بعد عراقیوں نے آپؑ کے بھائیؑ کے ساتھ جو کچھ کیا وہ بھی آپؑ کی نگاہ کے سامنے ہے ان تجربات کے بعد بھی آپؑ اپنے والدؑ کے دشمنوں کے پاس امید پر جا رہے ہیں کہ وہ آپؑ کا ساتھ دیں گے۔ شامی آپؑ سے زیادہ مستعد اور مضبوط ہیں۔ لوگوں کے دلوں میں ان کا رعب ہے۔ یاد رکھیے کہ آپؑ کے پہنچتے ہی شامی کو فیوں

کو طمع دلا کر توڑ لیں گے۔ اور یہ سگ دنیا فوراً ان سے مل جائیں گے، اور جن لوگوں کو آپ ؑ کی محبت کا دعویٰ ہے اور جنہوں نے مدد کا وعدہ کیا ہے، وہی لوگ آپ ؑ کو چھوڑ کر آپ ؑ کے دشمن بن جائیں گے، ابوبکر بن حارث ؓ کا پر زور استدلال بھی حضرت امام حسین علیہ السلام کے عزم راسخ کو بدل نہ سکا۔ آپ ؑ نے جواب دیا، خدا کی مرضی پوری ہو کر رہے گی۔ (مسعودی ج ۳ ص ۵۰ ہم برحاشیہ نفح الطیب)

مکہ سے کاروان اہل بیت ؑ کی روانگی اور بدخواہوں کی آخری کوشش

غرض ترویہ کے دن ذی الحجہ ۶۰ھ کو کاروانِ اہل بیت (علیہم السلام) مکہ سے روانہ ہوا، عمر بن سعید بن عاص اموی حاکم مکہ کے سواروں نے روکنے کی کوشش کی لیکن حضرت امام حسین علیہ السلام آگے بڑھتے چلے گئے اور تنعیم پہنچ کر مزید اونٹ کرایہ پر لیے اور بڑھتے ہوئے صفاح پہنچے۔ یہاں فرزدق شاعر ملا، آپ ؑ نے اس سے عراق کے حالات پوچھے، اس نے کہا آپ ؑ نے ایک باخبر شخص سے حال پوچھا، لوگوں کے دل آپ ؑ کے ساتھ ہیں لیکن تلواریں بنی امیہ کے ساتھ ہیں، قضائے الٰہی آسمان سے اترتی ہے خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ آپ ؑ نے سن کر فرمایا، تم نے سچ کہا لِلّٰهِ الْأَمْرُ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ وَكُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ اگر خدا کا حکم ہمارے موافق ہوا تو اس کی نعمتوں پر اس کے شکر گذار ہوں گے، شکر گذاری میں وہی مددگار ہے، اور اگر خدا کا فیصلہ ہمارے خلاف ہوا تو بھی ہماری نیت حق اور تقویٰ ہے، فرزدق سے گفتگو کے بعد قافلہ آگے بڑھا۔ (ابن اثیر ج ۴ ص ۲۳)

راستہ میں عبداللہ بن جعفر (برادر نسبتی) کا خط ملا کہ میں خدا کا واسطہ دلاتا ہوں، میرا خط ملتے ہی فوراً لوٹ آیئے، مجھے ڈر ہے کہ جہاں آپ ؑ جا رہے ہیں، وہاں آپ ؑ کی ہلاکت اور
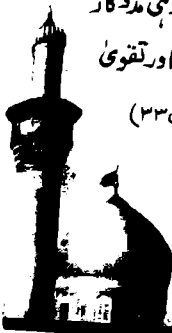
آپؑ کے اہل بیتؑ کی بربادی ہے اگر خدانخواستہ آپؑ ہلاک ہو گئے تو دنیا تاریک ہو جائے گی۔ آپؑ ہدایتوں کا علم اور مومنوں کا آسرا ہیں۔ آپ سفر میں جلدی نہ کیجئے، خط کے بعد ہی میں بھی پہنچتا ہوں، اس خط کے بعد عبداللہ نے عمرو بن سعید حاکم مکہ سے کہا کہ وہ اپنی جانب سے بھی ایک خط لکھ کر امام حسین علیہ السلام کو واپس بلالے، عمرو بن سعید نے کہا، تم مضمون لکھ دو میں اُس پر مُہر لگا دوں گا، چنانچہ عبداللہ نے عمرو کی جانب سے حسب ذیل خط لکھا:

"میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ تم کو اس راستہ سے پھیر دے، جدھر تم جا رہے ہو۔ میں نے سنا ہے تم عراق جاتے ہو، میں تم کو خدا کا واسطہ دلاتا ہوں کہ افتراق اور انشقاق سے باز آؤ۔ اس میں تمہاری ہلاکت ہے، میں تمہارے پاس عبداللہؓ ابن جعفر اور اپنے بھائی کو بھیجتا ہوں تم ان کے ساتھ لوٹ آؤ۔ میں تم کو امان دیتا ہوں، اور تمہارے ساتھ صلہ رحمی اور بھلائی سے پیش آؤں گا۔ تمہاری مدد کروں گا، تم میرے جوار میں نہایت اطمینان اور راحت کے ساتھ رہو گے۔ اس تحریر پر خدا وکیل اور شاہد ہے۔"

عمرو نے اس تحریر پر اپنی مہر ثبت کر دی اور عبداللہؓ ابن جعفر اور یحییٰ بن عمرو دونوں اس کو حضرت امام حسین علیہ السلام کے پاس لے گئے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے اس کو پڑھا اور پڑھ کر فرمایا کہ "میں نے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کی ہے۔ اس میں آپؐ نے مجھے ایک حکم دیا ہے میں اس حکم کو پورا کروں گا۔ خواہ اس کا نتیجہ میرے موافق نکلے یا مخالف، عبداللہ و یحییٰ نے پوچھا کیا خواب تھا؟ فرمایا، میں نے اسے نہ کسی سے بیان کیا ہے اور نہ مرتے دم تک بیان کروں گا۔ اس گفتگو کے بعد آپؑ نے عمرو بن سعید کے خط کا جواب لکھا کہ:

"جو شخص اللہ عزوجل کی طرف بلاتا ہے عمل صالح کرتا ہے اور اپنے اسلام کا معترف ہے، وہ خدا اور اس کے رسول ص سے اختلاف کیونکر کرسکتا ہے، تم نے مجھے امان، بھلائی اور صلہ رحمی کی دعوت دی ہے، بس بہترین امان اللہ تعالیٰ کی امان ہے، جو شخص دنیا میں خدا سے نہیں ڈرتا، خدا قیامت کے دن اس کو امان نہیں دے گا. میں دنیا میں خدا کا خوف چاہتا ہوں، تاکہ قیامت کے دن اس کی امان کا مستحق رہوں، اگر خط سے تمہاری نیت واقعی میرے ساتھ صلہ رحمی اور نیکی کی ہے تو خدا تم کو دنیا اور آخرت میں جزائے خیر دے۔ والسلام"

(تاریخ طبری ج ۷ ص ۳۶۹ - ۲۸۱)

ابن زیاد کے انتظامات اور حضرت امام حسین علیہ السلام کے قاصد متین کا قتل

ادھر کاروانِ اہل بیت (علیہم السلام) منزلیں طے کررہا تھا، دوسری طرف اموی حکام ان کے مقابلے کے لیے اپنے انتظامات کررہے تھے. چنانچہ آپؑ کی آمد کی خبر سن کر ابن زیاد نے قادسیہ سے لیکر خفان، قطقطانہ اور جبل لعلع تک سواریوں کا تانتا باندھ دیا تھا کہ اہل بیتؑ کے قافلہ کی نقل و حرکت کی خبریں دم بدم ملتی رہیں اور اہل کوفہ اور حضرت حسین علیہ السلام میں خط و کتابت اور نامہ و پیام کا سلسلہ قائم نہ رہ سکے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے مقام حاجز میں پہنچ کر متین بن مہر صیدادی کو اپنی آمد کا اطلاعی خط دیکر کوفہ روانہ کردیا لیکن اموی حکام نے پہلے سے راستوں کی ناکہ بندی کرلی تھی، اس لیے قیس قادسیہ میں گرفتار کر لیے گئے اور ابن زیاد کے پاس کوفہ بھجوا دیئے گئے۔

ابن زیاد نے انہیں یہ گستاخانہ حکم دیا کہ قصر کی چھت پر چڑھ کر کذاب ابن کذاب حسین ابن علی (علیہم السلام) کو گالیاں دو، قیس اس حکم پر اوپر چڑھ گئے، لیکن ایک فدائی حسینؑ کی زبان اسکی دشنام سے کسطرح آلودہ ہوسکتی تھی، چنانچہ اس موقع پر بھی انہوں نے وہی فرض ادا کیا جس کے لیے وہ بھیجے گئے تھے یعنی حضرت امام حسین علیہ السلام کی آمد کی ان الفاظ میں اطلاع دی کہ

" لوگو! میں حسین علیہ السلام، فاطمہؑ بنت رسول اللہؐ کے لخت جگر اور بہترین مخلوق کا ہرکارہ ہوں، وہ حاجز تک پہنچ چکے ہیں، ان کی مدد تمہارا فرض ہے"

یہ کہکر ابن زیاد اور اس کے باپ پر لعنت بھیجی اور حضرت علی علیہ السلام کے لیے استغفار کی، ابن زیاد نے اس عدول حکمی اور اس اہانت پر حکم دیا کہ اس کو بلند مقام سے نیچے گرا کر مار ڈالا جائے، اس حکم کی اسی وقت تعمیل ہوئی اور مسلم کے بعد حضرت امام حسین علیہ السلام کا یہ دوسرا فدائی ان کی راہ میں نثار ہو گیا
(ابن اثیر ج ۴ ص ۴۴)

امام حسین علیہ السلام اور عبداللہ بن مطیع کی ملاقات

بطن رحلہ سے آگے بڑھ کر عربوں کے ایک چشمہ پر حضرت امام حسین علیہ السلام کی ملاقات عبداللہؓ بن مطیع سے ہوئی، جو عراق سے لوٹ رہے تھے، عبداللہ بن مطیع نے پوچھا فدیت بابی و امی یا ابن رسول اللہؐ آپؑ اپنے جد امجدؐ کے حرم سے باہر کیوں نکلے؟ فرمایا کوفہ والوں نے بلایا ہے کہ معالمِ حق کو زندہ کیا جائے اور بدعتوں کو مٹایا جائے۔ عبداللہ نے عرض کی آپؑ کو خدا کا واسطہ دلاتا ہوں، ہرگز کوفہ کا قصد نہ کیجئے، آپؑ وہاں یقیناً شہید کر دیئے جائیں گے۔ فرمایا جو کچھ خدا نے لکھ دیا ہے اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے۔!
(اخبار الطوال ص ۲۵۸-۲۵۹)

ایک جانباز کا ایثار

عبداللہ بن مطیع سے ملاقات کے بعد

حضرت امام حسین علیہ السلام نے مقام زرود میں منزل کی، قریب ہی ایک خیمہ نظر آیا پوچھا کس کا خیمہ ہے، معلوم ہوا زہیر بن قین کا، وہ حج سے فارغ ہو کر کوفہ جا رہے تھے، حضرت امام حسین علیہ السلام نے ان کو بلا بھیجا، مگر انہوں نے انکار کیا، ان کے انکار پر اُن کی بیوی نے کہا، سبحان اللہ، ابن رسول اللہ بلاتے ہیں اور تم نہیں جاتے، بیوی کے اس کہنے پر وہ چلے گئے اور حضرت امام حسین علیہ السلام سے ملاقات کی، آپؑ سے ملتے ہی دفعتاً خیالات بدل گئے، اسی وقت اپنا خیمہ اکھڑوا کر حضرت امام حسین علیہ السلام کے خیمہ کے قریب نصب کرایا اور بیوی کو طلاق دے کر کہا تم اپنے بھائی کے ساتھ گھر لوٹ جاؤ میں نے جان دینے کی ٹھان لی ہے اور اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کے کہا کہ تم میں سے جو لوگ شہادت کے طلبگار ہوں وہ میرے ساتھ چلیں، اور جو لوگ نہ چاہتے ہوں وہ آگے بڑھ جائیں لیکن اس صدائے حق کا کسی نے جواب نہ دیا اور سبھوں نے کوفہ کا راستہ لیا اور حضرت امام حسین علیہ السلام کے ساتھ زرود سے آگے بڑھے۔ (اخبار الطوال ص ۲۵۹)

مسلم بن عقیل کی خبر ملنا

ابھی تک حضرت امام حسین علیہ السلام مسلم بن عقیل کے قتل سے بالکل بے خبر تھے، مقام ثعلبیہ میں ایک اسدی سے جو کوفہ سے آرہا تھا، مسلم اور ہانی کے قتل کا حال معلوم ہوا۔ یہ وحشتناک خبر سن کر آپؑ نے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن پڑھا، اس اطلاع کے بعد ہوا خواہوں نے ایک مرتبہ پھر سمجھایا اور قسمیں دلا دلا کر اصرار کیا کہ آپؑ یہیں سے لوٹ چلئے، کوفہ میں آپؑ کا کوئی حامی و مددگار نہیں ہے، یہ سب آپؑ کے دشمن ہو جائیں گے لیکن امام علیہ السلام نے اپنا فیصلہ بدلنے سے انکار فرما دیا

حضرت امام حسین علیہ السلام کے پاس عبداللہ بن یقطر کے قتل کی خبر اور مسلم کے پیغامات کا پہنچنا

حضرت امام حسین علیہ السلام جن جن چشموں سے گذرتے تھے، لوگ جوق در جوق ساتھ ہوتے جاتے تھے۔ زبار پہنچ کر عبداللہ بن یقطر کے قتل کی خبر ملی، عبداللہ کو آپ نے راستہ سے مسلم کے پاس خط دے کر روانہ کیا تھا لیکن راستہ ہی میں حصین بن نمیر کے سواروں نے ان کو گرفتار کر کے ابن زیاد کے پاس بھجوادیا اس نے زہیر بن قین کی طرح انہیں بھی حضرت امام حسین علیہ السلام پر لعنت بھیجنے کا حکم دیا لیکن اس فدائی نے بھی وہی نمونہ پیش کیا جو اس کے پیش رو پیش کر چکے تھے، انہوں نے کہا، لوگو! فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لڑکے امام حسین علیہ السلام آرہے ہیں، تم لوگ ابن مرجانہ (ابن زیاد) کے مقابلہ میں ان کی مدد کرو، ابن زیاد نے انہیں بھی قصر امارت کی بلندی سے گروا دیا۔ جسم کی ساری ہڈیاں چور چور ہوگئیں۔ اور اس دردناک طریقہ سے حضرت امام حسین علیہ السلام کے ایک اور فدائی کا خاتمہ ہوگیا۔ (ابن اثیر ج ۴ ص ۳۶)

حضرت امام حسین علیہ السلام کی پہلی تقریر اور ہجوم کا منتشر ہونا

حضرت امام حسین علیہ السلام کو جب مسلسل یہ دل شکن خبریں ملیں تو آپ نے اپنے ساتھیوں کو جمع کر کے تقریر کی کہ مسلم بن عقیل، ہانی بن عروہ اور عبداللہ بن یقطر کے قتل کی دردناک خبریں موصول ہو چکی ہیں، ہمارے ساتھیوں نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا ہے اسلیے تم میں سے جو شخص لوٹنا چاہے وہ خوشی سے لوٹ سکتا ہے۔ ہماری جانب سے کوئی الزام نہیں، یہ تقریر سن کر ہجوم کا ہجوم چھٹنے لگا اور صرف وہی جاں نثار باقی رہ گئے جو مکہ سے ساتھ آئے تھے

(ماخوذ از طبری جلد ۷)

زبالہ سے بڑھ کر بطن عقبہ میں قافلہ اترا یہاں ایک شخص ملا، اس نے نہایت لجاجت کے ساتھ استدعا کی کہ آپ ؑ کو

خدا کا واسطہ دلاتا ہوں، آپؑ لوٹ جائیے، خدا کی قسم آپؑ نیزوں کی انی اور تلواروں کی دھار کے مقابلے میں جارہے ہیں۔ جن لوگوں نے آپ کو بلایا ہے اگر انہوں نے آپؑ کے لیے راستہ صاف کردیا ہوتا اور ان کے جنگ میں کام آنے کی توقع ہوتی تو یقیناً آپؑ جاسکتے تھے لیکن موجودہ حالات میں کسی طرح جانا مناسب نہیں، فرمایا جو تم کہتے ہو میں بھی جانتا ہوں، لیکن خدا کے حکم کے خلاف نہیں کیا جاسکتا (ماخوذ از طبری)

محرم ۶۱ھ کے خونی سال کا آغاز اور حر کی آمد

بطن عقبہ کے بعد قافلہ شراف میں اُترا۔ یہاں سواریوں کو پانی وغیرہ پلا کر ذی حشم کی طرف مڑ کر پہاڑ کے دامن میں خیمہ زن ہوا۔ اب محرم ۶۱ھ کا خون آشام سال شروع ہوچکا تھا، ذی حشم میں حر بن یزید تمیمی جو حکومت شام کی جانب سے حضرت امام حسین علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو گھیر کر کوفہ لانے کے لیے ایک ہزار سواروں کے ساتھ بھیجا گیا تھا پہنچا، حضرت امام حسین علیہ السلام نے اذان کا حکم دیا اور اقامت کے وقت نکل کر حر کے دستہ کے سامنے حمد و ثنا کے بعد حسب ذیل تقریر کی:

"لوگو! میں خدا اور تم لوگوں سے عذر خواہ ہوں، میں تمہارے پاس خود سے نہیں آیا ہوں بلکہ میرے پاس اس مضمون کے تمہارے خطوط اور تمہارے قاصد آئے کہ ہمارا کوئی امام نہیں ہے۔ آپ آئیے، شاید خدا آپ کے ذریعہ ہمیں سیدھے راستہ پر لگادے، اب میں آگیا ہوں، اگر تم لوگ عہد و میثاق کرکے مجھے اطمینان دلادو تو میں تمہارے شہر چلوں اور اگر ایسا نہیں کرتے اور ہمارا آنا تمہیں ناگوار ہے تو میں جہاں سے آیا ہوں وہیں لوٹ جاؤں۔"

یہ تقریر سن کر سب خاموش رہے، کسی نے کوئی جواب

نہیں دیا۔ آپؑ نے اقامت کا حکم دیا اور حر سے پوچھا، میرے ساتھ نماز پڑھو گے یا علیحدہ؟ حر نے کہا میں آپؑ کے ساتھ ہی پڑھوں گا۔

حر کی یہ اقتدا فی الصلوٰۃ ان کے لیے پہلی نیک فال تھی۔ چنانچہ اس نے امام علیہ السلام کے پیچھے نماز پڑھی، نماز کے بعد امام حسین علیہ السلام خیمہ میں چلے گئے اور حر اپنے فرودگاہ پر لوٹ گئے۔ اس کے بعد عصر کے وقت حضرت امام حسین علیہ السلام نے قافلہ کو کوچ کا حکم دیا، اور کوچ سے پہلے نماز باجماعت ادا کی، نماز کے بعد حسب ذیل تقریر کی:-

"لوگو! اگر تم لوگ خدا سے ڈرو اور حقدار کا حق پہچانو تو یہ موجب رضا مندی خدا ہوگا ہم اہل بیتؑ خلافت کے ان دعوے داروں کے مقابلے میں، جنہیں اس کا کوئی استحقاق نہیں اور جو تم پر ظلم و زیادتی کے ساتھ حکومت کرتے ہیں، خلافت کے زیادہ مستحق ہیں، اگر اب تم کو ہمارا آنا ناگوار ہے اور تم ہمارا حق نہیں پہچانتے اور تمہاری رائے اس سے مختلف تھی جو تمہارے خطوط اور تمہارے قاصدوں سے معلوم ہوئی تھی تو میں لوٹ جاؤں۔"

(تاریخ طبری ج ۷ ص ۲۹۰-۲۹۸)

حضرت امام حسین علیہ السلام اور حُر میں گفتگو

اس تقریر پر حُر نے پوچھا، قاصد اور خطوط کیسے؟ حر کے اس استعجاب پر حضرت امام حسین علیہ السلام نے کوفیوں کے خطوط سے بھرے ہوئے دو تھیلے منگا کر ان کے سامنے اُنڈلوا دیئے (ان میں سے بعض خطوط اب بھی ریاست جے پور کی لائبریری اور جرمنی کے کتاب خانوں میں موجود ہیں اور میں نے خود ان کے عکس دیکھے ہیں — سید مجتبیٰ حسین)

ان خطوط کو دیکھ کر حُر نے کہا: "ہم لوگوں کا اس جماعت سے کوئی تعلق نہیں ہے، جنہوں نے

خط لکھے۔ ہمیں یہ حکم ملا ہے کہ آپ ؑ سے جس جگہ ملاقات ہو جائے، اس جگہ سے آپ (ع) کا ساتھ نہ چھوڑیں اور آپ ؑ کو ساتھ لے جا کر ابن زیاد کے سامنے کوفہ پہنچا دیں۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے فرمایا۔ تمہاری موت اس سے زیادہ قریب ہے اس کے بعد امام ؑ نے کاروانِ اہل بیت ؑ کو لوٹانا چاہا، لیکن حر نے مزاحمت کی۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے فرمایا، تیری ماں تجھے روئے، تو کیا چاہتا ہے، حر نے کہا آپ ؑ کے علاوہ اگر دوسرا عرب یہ کلمہ زبان سے نکالتا تو میں بھی برابر کا جواب دے لیتا، لیکن خدا کی قسم آپ ؑ کی ماں ؑ کا نام میں عزت ہی کے ساتھ لوں گا۔ امام علیہ السلام نے فرمایا آخر چاہتے کیا ہو؟ حر نے کہا صرف اس قدر کہ آپ ؑ میرے ساتھ ابن زیاد کے پاس چلے چلیں، فرمایا میں تمہارا کہنا نہیں مان سکتا۔ حُر نے کہا تو پھر میں آپ ؑ کو نہیں چھوڑ سکتا، اس ردو قدح میں دونوں میں تلخ و تند گفتگو ہوئی، حُر نے کہا، مجھے آپ ؑ سے لڑنے کا حکم نہیں ہے۔ صرف یہ حکم ملا ہے کہ آپ (ع) جہاں جلیں آپ ؑ کو لے جا کر کوفہ پہنچا دوں۔ اس لیے مناسب یہ ہے کہ ایسا راستہ اختیار کیجئے جو نہ کوفہ پہنچائے اور نہ مدینہ واپس کرے، اس درمیان، میں ابن زیاد کو لکھتا ہوں اور آپ ؑ یزید کو لکھیئے، شاید خدا عافیت کی کوئی صورت پیدا کر دے۔ اور میں آپ ؑ کے معاملہ میں آزمائش سے بچ جاؤں، حُر کے اس مشورہ پر حضرت امام حسین علیہ السلام عذیب اور قادسیہ کے بائیں جانب ہٹ کر چلنے لگے، حُر بھی ساتھ ساتھ چلا۔

(ابن اثیر ج ۴ ص ۴۰)

خطبہ

آگے بڑھ کر مقامِ بیضیہ میں آپ ؑ نے پھر ایک پرجوش خطبہ دیا:۔

لوگو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے ظالم، محرمات الٰہی کو حلال کرنے والے

خدا کا عہد توڑنے والے، سُنت رسول ص کے مخالف، خدا
کے بندوں پر گناہ اور زیادتی کے ساتھ حکومت کرنے والے بادشاہ
کو دیکھا اور اس کو قولاً اور عملاً غیرت نہ آئی، تو خدا کو حق ہے کہ
اس کو اس بادشاہ کی جگہ دوزخ میں داخل کر دے، لوگو! خبردار
ہو جاؤ، ان لوگوں نے شیطان کی اطاعت اختیار کی ہے اور
رحمٰن کی اطاعت چھوڑ دی ہے ملک میں فساد پھیلایا ہے،
حدودِ الٰہی کو بیکار کر دیا ہے، مال غنیمت میں اپنا حصہ زیادہ لیتے
ہیں، خدا کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال کر دیا ہے اور حلال کی
ہوئی چیزوں کو حرام کر دیا ہے، اس لیے مجھے غیرت آنے کا زیادہ
حق ہے، میرے پاس تمہارے خطوط آئے تمہارے قاصد آئے
کہ تم نے بیعت کر لی ہے اور تم مجھے بے یار و مددگار نہ چھوڑو گے
پس اگر تم بیعت پوری کرو گے تو راہِ راست پر پہنچو گے۔ میں
علیؑ اور فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا
بیٹا حسین (علیہ السلام) ہوں۔ میری جان تمہاری جانوں کے
برابر ہے اور میرے اہل تمہارے اہل کے برابر ہیں، میری ذات
تم لوگوں کے لیے نمونہ ہے، اور اگر تم ایسا نہ کرو گے اور اپنا
عہد توڑ کر میری بیعت کا حلقہ اپنی گردن سے نکال ڈالو گے
تو میری عمر کی قسم یہ بھی تمہاری ذات سے بعید اور تعجب
انگیز فعل نہ ہوگا۔ تم اس سے پہلے میرے باپ، میرے بھائی
نیز میرے ابن عم مسلمؑ کے ساتھ ایسا ہی کر چکے ہو، وہ فریب
خوردہ ہے جو تمہارے فریب میں آگیا، تم نے اپنے
فعل سے اپنا حصہ ضائع کر دیا، جو شخص عہد شکنی

کرتا ہے، وہ گویا اپنی ذات سے عہد توڑتا ہے۔ عنقریب خدا
مجھ کو تمہاری امداد سے بے نیاز کر دے گا والسلام علیکم ورحمۃ اللہ و
برکاتہ ۔ (ابن اثیر ج ۴ ص ۴۱-۴۲)

یہ تقریر سن کر حر نے کہا کہ میں آپ کو خدا یاد دلاتا ہوں اور شہادت دیتا ہوں کہ آپ نے جنگ کی تو قتل کر دیئے جائیں گے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے فرمایا تم مجھ کو موت سے ڈراتے ہو، کیا تمہاری شقاوت اس حد تک پہنچ جاتے گی کہ تم مجھے قتل کر دو گے۔ میں نہیں سمجھتا تمہارے اس کہنے پر تم کو اس کے سوا اور کیا جواب دوں جو اوسی کے چچازاد بھائی نے اوسی کو اسوقت دیا تھا جب اوسی نے انہیں قتل ہونے سے ڈرا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ساتھ دینے سے روکا تھا کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امداد کے لیے نکلو گے تو قتل کر دیئے جاؤ گے۔ اس پر انہوں نے یہ جواب دیا۔

سَاَمضِیْ بِھا وَلَا الْمَوْتُ عَارٌ عَلَی الْفَتیٰ   اِذَا مَا نَوٰی خَیْراً وَجَاھَدَ مُسْلِمًا

میں نے مرنے کا ارادہ کر لیا ہے اور موت جوانمرد کے لیے عار نہیں ہے جبکہ اس کی نیت نیک ہو اور مسلمانوں کی طرح جہاد کرے۔ حر نے یہ جواب سنا تو الگ ہٹ کے چلنے لگا۔

قیس بن مسہر کے قتل کی خبر ملنا عذیب الہجانات پہنچ کر حضرت امام حسین علیہ السلام کے چار انصار ملے، جو طرماح بن عدی کی رہنمائی میں کوفہ کی خبریں لیے ہوئے آرہے تھے، حر نے کہا یہ لوگ کوفہ کے باشندے ہیں اس لیے میں انہیں روک لوں گا یا لوٹا دوں گا۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے فرمایا یہ میرے انصار ہیں اور ان لوگوں کے برابر ہیں جو میرے ساتھ ہیں اس لیے میں اپنی ذات کی طرح ان لوگوں کی حفاظت بھی کروں گا۔ اور اگر تم اپنے عہد و پیمان پر قائم نہ رہے تو

جنگ کروں گا۔ یہ عزم سن کر حُر رک گیا اور حضرت امام حسین علیہ السلام نے کوفیوں سے پوچھا کہ اہل کوفہ کا کیا حال ہے؟ طرماح بن عدی نے کہا، اشراف کوفہ کو بڑی بڑی رشوتیں دی گئی ہیں، ان کی تھیلیاں روپیوں سے بھر دی گئی ہیں، اس لیے وہ سب آپؑ کے خلاف متحد اور مشتعل ہو رہے ہیں، البتہ عوام کے دل آپؑ کی طرف مائل ہیں۔ لیکن کل ان کی تلواریں آپؑ پر کھنچی ہوں گی، یہ حال سُن کر آپؑ نے اپنے قاصد قیس بن مہر کا حال پوچھا، معلوم ہوا کہ قتل کر دیئے گئے، قیس کے قتل کی خبر سن کر آپؑ کی آنکھوں سے بے ساختہ و بے اختیار آنسو رواں ہو گئے اور زبان پر یہ آیت جاری ہو گئی:-

فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا

(مسلمانوں میں سے) بعض وہ ہیں جنھوں نے اپنی منت پوری کی (یعنی شہید ہوئے) بعض ان میں سے (ایسے ہیں جو شہادت کے) منتظر ہیں اور انہوں نے کوئی ردوبدل نہیں کیا۔ (سورۂ احزاب آیت ۲۳)

پھر قیس کے لیے دعا فرمائی کہ خدا یا ہم کو اور ان لوگوں کو جنت عطا فرما اور اپنے رحمت کے مستقر میں ہمارے اور ان کے لیے اپنے ذخیرہ ثواب کا بہترین حصہ جمع فرما۔ (ابن اثیر ج ۴ ص ۴۱)

طرماح بن عدی کا اپنے وطن چلنے کی دعوت دینا

حضرت امام حسین علیہ السلام کا یہ تاثر دیکھ کر طرماح بن عدی نے کہا آپؑ کے ساتھ کوئی بڑی جماعت نہیں ہے۔ اتنے آدمیوں کے لیے یہی لوگ کافی ہیں جو آپؑ کے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ (حر کا دستہ) میں نے کوفہ سے روانگی سے پیشتر وہاں انسانوں کا اتنا بڑا ہجوم دیکھا ہے کہ اس سے پہلے ایک میدان میں کبھی نہ دیکھا تھا اور یہ انبوہ عظیم آپؑ کے مقابلے میں بھیجنے کے لیے جمع کیا گیا ہے۔ اسی لیے میں آپؑ کو

خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ اگر آپ کے امکان میں ہے تو اب آپ ایک بالشت بھی آگے نہ بڑھیئے اگر ایسے مقام پر جانا چاہتے ہیں، جہاں کے لوگ آپ کی پوری حفاظت کرتے رہیں، جب تک آپ کی کوئی صحیح رائے قائم نہ ہو جائے اور جو کچھ آپ کرنا چاہتے ہیں اس کے متعلق کوئی آخری فیصلہ نہ کریں، تو ہمارے ساتھ چل کر ہمارے پہاڑ کے دامن میں قیام کیجیئے۔ خدا کی قسم یہ پہاڑ ایسا ہے کہ اس کے ذریعے سے ہم نے سلاطین غسان و حمیر، نعمان بن منذر اور تمام ابیض و احمر کو روکا ہے۔ خدا کی قسم جو ہمارے یہاں آیا کبھی ذلیل نہیں ہوا۔ چلئے میں آپ کو ساتھ لے کر وہاں ٹھہراتا ہوں اور وہاں سے آپ باجہ وسلمی قبائل طے کو بلا لیجیئے، وہ دس دن کے اندر اندر سواروں اور پیادوں کے ہجوم کر دیں گے۔ پھر جب تک آپ کا دل چاہے قیام کیجیئے، اگر کوئی ہنگامی حادثہ پیش آ گیا تو ہم بیس ہزار طائی بہادروں سے آپ کی مدد کریں گے۔ آپ کے سامنے اپنی تلواروں کے جوہر دکھائیں گے۔ اور کوئی شخص آپ کے قریب نہ پہنچنے پائے گا، حضرت امام حسین علیہ السلام نے اس دعوت کے جواب میں ان کا شکریہ ادا کیا، کہ خدا تم کو اور تمہاری قوم کو جزائے خیر دے ہم میں اور ان لوگوں میں عہد ہو چکا ہے اس عہد کی رو سے ہم نہیں لوٹ سکتے، ہم کو یہ بھی نہیں معلوم کہ ہمارے اور ان کے معاملات کیا صورت اختیار کریں گے، یہ جواب سن کر طرماح دوبارہ امداد کے لیے آنے کا وعدہ کر کے بال بچوں سے ملنے کے لیے گھر چلے اور حسب وعدہ واپس بھی ہوئے مگر حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت اس قدر جلد ہو گئی کہ طرماح کو آتے ہوئے راستہ میں اسکی خبر ملی۔

(ابن اثیر ج ۴ ص ۴۱-۴۲)

قصر بنی مقاتل کی منزل اور خواب

عذیب الہجانات سے بڑھ کر قصر بنی مقاتل میں قافلہ

اُترا، یہاں ایک خیمہ نصب تھا ، حضرت امام حسین علیہ السلام نے پوچھا کس کا خیمہ ہے؟ معلوم ہوا عبید اللہ ابن حر جعفی کا ہے، فرمایا، انہیں بلا لاؤ، آدمی نے جا کر ان سے کہا، انہوں نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ کر جواب دیا، میں صرف اسلیے کوفہ چلا آیا تھا کہ اپنی موجودگی میں وہاں (امام) حسین (علیہ السلام) کا آنا پسند نہ کرتا تھا۔ اسلیے میں اب ان کا سامنا کرنا نہیں چاہتا ہوں، آدمی نے آکر حضرت امام حسین علیہ السلام کو یہ جواب سنا دیا، اسے سن کر حضرت امام حسین علیہ السلام خود ان کے پاس تشریف لے گئے اور اپنی مدد کے لیے کہا لیکن عبید اللہ نے آپ کو بھی وہی جواب دیا، جو پہلے آدمی کو دے چکے تھے، حضرت امام حسین علیہ السلام نے فرمایا اگر تم میری مدد نہیں کرتے تو کم سے کم خدا کا خوف کر کے مجھ سے لڑنے کے زمرہ میں تو شامل نہ ہو، عبید اللہ نے کہا۔ انشاء اللہ ایسا نہ ہوگا، اس کے بعد حضرت امام حسین علیہ السلام اپنی فرودگاہ پر لوٹ آئے۔ تھوڑی رات گئے آنکھ لگ گئی تھی کہ پھر آپؑ انا للہ وانا الیہ راجعون اور الحمد للہ رب العالمین پڑھتے ہوئے بیدار ہو گئے، آپؑ کے صاحبزادے جناب علی اکبرؑ نے پوچھا بابا آپؑ نے الحمد للہ وانا للہ کیوں پڑھا؟ فرمایا میری آنکھ لگ گئی تھی کہ میں نے خواب میں ایک سوار دیکھا وہ کہہ رہا تھا کہ "قوم جا رہی ہے اور موت اس کی طرف بڑھ رہی ہے۔" یہ خواب ہماری موت کی خبر ہے۔ شیر دل صاحبزادے نے جواب دیا بابا خدا آپؑ کو برے وقت سے بچائے کیا ہم حق پر ہیں؟ فرمایا خدا کی قسم ہم حق پر ہیں، عرض کی، جب حق کی راہ میں موت ہے تو کوئی پرواہ نہیں ہے، فرمایا، خدا میری جانب سے تم کو اس کی جزائے خیر دے، اس خواب کی صبح کو یہاں سے کوچ کیا

حر کے نام ابن زیاد کا پیغام

نینوی میں اہلبیت علیہم السلام

قصر بنی مقاتل

تھا، یہاں اسکو ابن زیاد کا حکم ملا کہ میرے خط کے دیکھتے ہی (امام حسین (علیہ السلام) کو گھیر کر ایسے چٹیل میدان میں لاکر اتارو، جہاں کوئی قلعہ اور پانی کا چشمہ نہ ہو۔ حر نے یہ فرمان حضرت امامؑ کو سنایا اور انہیں اسی قسم کے میدان کی طرف لے جانا چاہا۔ حسینی لشکر نے کہا ہم کو چھوڑ دو ہم اپنی مرضی سے نینوی، غاضریہ یا شقیقہ میں خیمہ زن ہوں گے۔ حُر نے کہا ہم ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ ہمارے ساتھ جاسوس لگا ہوا ہے۔ اس پر زہیر نے کہا یا ابن رسول اللہؐ آئندہ جو وقت آئے گا وہ اس سے بھی زیادہ سخت ہوگا۔ ابھی لڑنا آسان ہے۔ اس دستہ کے بعد جو فوجیں آئیں گی، ان کا مقابلہ ہم نہ کر سکیں گے۔ لیکن خیرخواہِ امتؑ نے کہا کہ "میں اپنی طرف سے لڑائی کی ابتداء نہ کروں گا۔" زہیر نے کہا، اچھا کم از کم اتنا کیجئے کہ سامنے والے قریہ میں قیام کیجئے، وہاں فرات کا ساحل ہے، گاؤں بھی مضبوط و مستحکم ہے اگر یہ لوگ وہاں جانے میں مزاحم ہوں گے تو ہم ان کا مقابلہ کرلیں گے۔ کیونکہ ان کا مقابلہ بعد کے آنے والوں کے مقابلہ میں آسان ہے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے گاؤں کا نام پوچھا، معلوم ہوا "عقر" ذبح کرنا، فرمایا خدایا میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں، غرض پنجشنبہ ۲ محرم ۶۱ھ کو قافلہ نینوی کے میدان کرب وبلا میں قافلہ خیمہ زن ہوا۔
(ابن اثیر ج ۴ ص ۴۳-۴۴)

عمر ابن سعد کے سامنے رے کی حکومت کا پیش کیا جانا اور حضرت امام حسین علیہ السلام کے شہید کرنے کی ذمہ داری سپرد کرنا اور نفس و ضمیر کی کشمکش

ادھر اہلِ بیت نبویؐ کا غریب الوطن قافلہ نینوی کے میدان میں پڑا تھا، دوسری طرف کوفہ کے چند نفوس کے لیے بڑی زبردست تیاریاں کی جارہی تھیں، اسی زمانہ میں دیلمیوں نے لبستی پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا تھا اس لیے عمر بن سعد کو رے کا حاکم بنا کر دیالمہ کی سرکوبی پر مامور کیا گیا تھا اور وہ فوجیں

لے کر حمام اعین تک پہنچ چکا تھا کہ اسی دوران حضرت امام حسین علیہ السلام کے مقابلے کے لیے ایک ایسے شخص کی ضرورت پیش آئی جو ان کا مقابلہ کر سکے، ابن زیاد نے اس کام کے لیے ابن سعد کو بلا بھیجا اور کہا کہ (امام) حسین (علیہ السلام) کا مقابلہ سب سے مقدم ہے پہلے ان سے نمٹ لو، اس کے بعد اپنے عہدہ پر واپس جانا، عمر سعد نے کہا، خدا میرے اوپر رحم کرے، مجھ کو اس خدمت سے معاف رکھا جائے۔ ابن زیاد نے کہا اگر تم کو اس میں عذر ہے تو رے کی حکومت نہ ملے گی۔ اس دھمکی پر ابن سعد نے اس مسئلہ پر غور کرنے کی مہلت مانگی، ابن زیاد نے مہلت دی اور ابن سعد نے اپنے ہواخواہوں سے اس بارہ میں مشورہ لینا شروع کیا، ظاہر ہے امام حسین علیہ السلام کے خون کا بار اٹھانے کی تائید کون کر سکتا تھا۔ چنانچہ سب نے اس کی مخالفت کی۔ اس کے بھانجے حمزہ بن مغیرہ کو معلوم ہوا تو انہوں نے آکر کہا: ماموں میں آپ کو قسم دلاتا ہوں کہ آپ (امام) حسین (علیہ السلام) کے مقابلہ میں جا کر خدا کا گناہ اپنے سر نہ لیجئے اور قطع رحم نہ کیجئے، خدا کی قسم اگر آپ کی دنیا، آپ کا مال، آپ کی حکومت سب ہاتھوں سے نکل جائے تو وہ اس سے کہیں بہتر ہے کہ خدا سے آپ اسطرح ملیے کہ آپ کے ہاتھ (امام) حسین (علیہ السلام) کے خون بے گناہی سے آلودہ ہوں۔ ابن سعد نے کہا انشاء اللہ تمہارے مشورہ پر عمل کروں گا۔

عمار بن عبداللہ بن یسار اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ ابن سعد کو (امام) حسین (علیہ السلام) کے مقابلے کے لیے جانے کا حکم ملنے کے بعد میں ان کے پاس گیا تو انہوں نے مجھ سے تذکرہ کیا کہ امیر نے مجھے (امام) حسین (علیہ السلام) کے مقابلے میں جانے کا حکم دیا مگر میں نے انکار کر دیا۔ عبداللہ نے کہا کہ خدا تم کو نیک ہدایت دے تم کبھی بھی ایسا نہ کرنا اور ہرگز نہ جانا، یہ کہہ کر عبداللہ چلے آئے، اس کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ ابن سعد جانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ تو یہ دوبارہ گئے مگر اس مرتبہ ان کو دیکھ کر

ابن سعد نے منہ پھیر لیا۔ عبداللہ اس کا عندیہ سمجھ کر واپس چلے آئے۔ اس فیصلے کے بعد ابن سعد، ابن زیاد کے پاس گیا اور کہا کہ آپ نے یہ خدمت میرے سپرد کی ہے اور حکومت کا فرمان بھی لکھ چکے ہیں۔ اس لیے اس کا انتظام کر دیجئے اور (حضرت امام) حسین (علیہ السلام) کے مقابلے میں میرے ساتھ فلاں فلاں اشرافِ کوفہ کو بھیجئے، ابن زیاد نے کہا تم کو مجھے اشرافِ کوفہ کے نام بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنے ارادہ میں تمہارے احکام کا پابند نہیں ہو سکتا، کہ تمہاری رائے سے فوج کا انتخاب کروں، اگر تم کو جانا ہے تو میری فوج کے ساتھ جاؤ۔ ورنہ حکومت کا فرمان واپس کردو۔ جب ابن سعد نے دیکھا کہ ابن زیاد اس کا کہنا ہی نہیں مانتا تو چار و ناچار اسی فوج کے ساتھ جانے پر آمادہ ہوگیا۔ (تاریخ طبری ج ۷ ص ۳۰۸ - ۳۰۹)

عمر بن سعد کی آمد

غرض تیسری محرم ۶۱ھ کو چار ہزار فوج کے ساتھ ابنِ سعد نینویٰ پہنچا اور عزرہ بن قیس احمسی کو حضرت امام حسین علیہ السلام کے پاس ان کے آنے کا سبب پوچھنے بھیجنا چاہا کہ وہ یہاں کیوں آئے ہیں؟ اور کیا چاہتے ہیں؟ لیکن عزرہ ان لوگوں میں تھا جنہوں نے حضرت امام حسین علیہ السلام کو بلاوے کے خط لکھے تھے، اس لیے اب اس کو یہ پوچھنے کے لیے غیرت معلوم ہوئی، اسلیے اس نے انکار کر دیا۔ اس کے انکار پر دوسرے لوگوں کے سامنے یہ خدمت پیش کی گئی۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ جس کا نام لیا جاتا تھا وہ حضرت امام حسین علیہ السلام کے بلانے والوں میں نکلتا تھا، اس لیے کوئی آمادہ نہ ہوتا تھا آخر میں ایک جری شخص کثیر بن عبداللہ شعبی نے کھڑے ہوکر کہا میں جاؤں گا اگر ان کے ساتھ کچھ اور مقصد ہو تو وہ بھی پورا کرنے کو تیار ہوں۔ ابن سعد نے کہا کہ میں اور کچھ نہیں جانتا، ان سے جاکر صرف اتنا پوچھو کہ وہ کس لیے آئے ہیں؟ چنانچہ کثیر یہ پیام لے کر گیا۔ ابو ثمامہ

صائدی نے حضرت امام حسین علیہ السلام کو اطلاع دی کہ ابو عبداللہ آپ کے پاس روئے زمین کا شریر اور خونریز ترین شخص آرہا ہے۔ پھر کثیر ابن عبداللہ سے کہا کہ تلوار علیحدہ رکھ کر امام حسین علیہ السلام سے ملاقات کرو، کثیر نے جواب دیا، خدا کی قسم یہ کسی طرح نہیں ہوسکتا۔ میں قاصد ہوں، پیام لایا ہوں، اگر تم سُننا چاہو گے تو پیام پہنچادوں گا۔ ورنہ واپس چلا جاؤں گا، ابو ثمامہ نے کہا اچھا اگر تلوار نہیں رکھتے تو میں تمہاری تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھے رہوں گا۔ تم امام حسین علیہ السلام سے گفتگو کر لینا، کثیر نے کہا یہ بھی نہیں ہوسکتا، تم قبضہ بھی نہیں چھو سکتے۔ اور ثمامہ نے کہا تو مجھے پیام بتادو، میں جاکر امام حسین علیہ السلام کو پہنچادوں گا۔ کثیر اس پر بھی آمادہ نہ ہوا اور بلا پیام پہنچائے ہوئے لوٹ گیا، اس کی واپسی کے بعد ابن سعد نے قرہ بن سعد حنظلی کو بھیجا، یہ سنجیدہ اور سُلجھے ہوئے آدمی تھے، انہوں نے جاکر سلام کے بعد ابن سعد کا پیام پہنچایا۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے جواب دیا کہ "تمہارے شہر والوں نے مجھے خط لکھ کر بلایا ہے، اب اگر تم لوگ میرا آنا ناپسند کرتے ہو تو میں لوٹ جاؤں"۔ قرہ نے جاکر ابن سعد کو یہ جواب سنادیا، جواب سُن کر اُس نے اطمینان کی سانس لی اور کہا امید ہے اب خدا مجھ کو (امام) حسین (علیہ السلام) کے ساتھ جنگ کرنے سے بچالے گا۔ اور اپنا سوال اور امام حسین علیہ السلام کا جواب ابن زیاد کو لکھ بھیجا لیکن کاتب ازل اس کا نامۂ اعمال سیاہ کر چکا تھا۔ اس لیے ابنِ سعد کی اس مصالحانہ تحریر کے بعد اس نے صلح اور مصالحت کی روش اختیار نہ کی اور ابن سعد کو جواب لکھا کہ "تمہارا خط ملا، تم نے جو کچھ لکھا میں سمجھا تم (امام) حسین (علیہ السلام) اور ان کے کل ساتھیوں سے یزید کی بیعت لے لو جب وہ بیعت کرلیں گے اس وقت دیکھا جائے گا"۔

ابن سعد کو یہ تحریر ملی تو بولا معلوم ہوتا ہے، ابن زیاد امن و عافیت نہیں چاہتا۔ (تاریخ طبری ج ۷ ص ۳۱۰ - ۳۱۱)

پانی کی بندش اور اس کے لیے کشمکش

اس کے بعد ہی دوسرا حکم پہنچا کہ (امام) حسین (علیہ السلام) اور ان کے ساتھیوں پر پانی بند کردو جس طرح تقی زکی اور مظلوم امیرالمومنین حضرت عثمان کے ساتھ کیا گیا تھا۔ اور ان سے یزید کی بیعت کا مطالبہ کرو، بیعت کے بعد پھر میں ان کے بارہ میں غور کروں گا۔ اس حکم پر ابن سعد نے پانچسو سواروں کا ایک دستہ فرات پر پانی روکنے کے لیے معین کر دیا۔ اس دستہ نے ساتویں محرم سے پانی روک دیا، عبداللہ بن ابی حصین شامی نے امام حسین علیہ السلام سے مخاطب ہو کر کہا، حسین (علیہ السلام) پانی دیکھتے ہو کیا آسمان کے جگر جیسا جھلک رہا ہے۔ لیکن خدا کی قسم تم کو ایک قطرہ بھی نہیں مل سکتا تم اسطرح پیاسے مرو گے۔ آپ ع نے فرمایا، خدایا اس کو پیاسا مار اور اسکی مغفرت کبھی نہ فرما۔
(تاریخ طبری ج ۷، ص ۳۱۲)

ابن زیاد کا تہدیدی فرمان

ابن سعد گو دنیاوی جاہ و حشم کی طمع میں حضرت امام حسین علیہ السلام سے لڑنے پر آمادہ ہو گیا تھا پھر بھی متعدد وجوہ سے اس کا دل اب تک برابر ملامت کر رہا تھا، امام حسین علیہ السلام کی ذات گرامی وہ تھی کہ قرابت نبوی کی وجہ سے غیر متعلق اور بیگانہ اشخاص بھی مشکل سے آپ ع کے ساتھ کسی بدسلوکی کی جرأت کرتے تھے اور ابن زیاد سے تو آپ کے دیرینہ تعلقات بھی تھے۔ اس لیے نینویٰ آنے کے بعد بھی وہ برابر جنگ کو ٹالتا رہا کہ شاید اسی طرح اس گناہِ عظیم سے بچنے کی کوئی صورت نکل آئے، ابن زیاد نے اس ڈھیل کو محسوس کیا تو آخر میں نہایت سخت پیغام بھیجا کہ:

"میں نے تمہیں اسلیے نہیں بھیجا ہے کہ تم ڈھیل دیتے رہو، دن بڑھاتے چلے جاؤ، اور (امام) حسین (علیہ السلام) کے سفارشی بن کر ان کی بقا اور ان کی سلامتی کی تمنا کرو، تم (امام) حسین

(علیہ السلام) اوران کے ساتھیوں سے میرا حکم ماننے کے لیے کہو، اگر مان جائیں تو سب کو ہمارے پاس بھیج دو، ورنہ فوراً حملہ کردو کہ وہ سرکش اور جھگڑنے والے ہیں، اور اگر اگر یہ کام تم سے نہ ہوسکے تو فوج ذی الجوشن کے حوالے کرکے تم الگ ہو جاؤ۔ ہم نے جو حکم دیا ہے اسے وہ پورا کریں گے۔ (تاریخ طبری ج ۷، ص ۳۱۹)

ابن زیاد نے فرمان شمر ذی الجوش اور عبداللہ بن ابی المحل کے ذریعہ سے ابن سعد کے پاس بھیج دیا تھا۔ عبداللہ کی پھوپھی اُم البنین حضرت علی علیہ السلام کو بیاہی تھیں اور عباس، عبداللہ، جعفر اور عثمان ان کے ہی بطن سے تھے۔ اس لیے عبداللہ نے شمر سے کہا کہ ہمارے ابن اخت حسین (علیہ السلام) کے ساتھ ہیں، اگر امیر کی رائے ہو تو ان کے پاس امان نامہ بھیج دیا جائے، شمر اس پر راضی ہوگیا، اور اسی وقت کاتب سے لکھوا دیا، عبداللہ نے اپنے غلام کرنان کے ہاتھ عباس وغیرہ کے پاس بھجوا دیا، غلام نے انہیں لے جا کر دیا کہ تمہارے ماموں نے یہ امان نامہ دیا ہے اس پر غور اور بات چیت کے بعد بھانجوں نے جواب دیا کہ ماموں سے جاکر سلام کہنا اور کہنا، امان نامہ پہنچا، لیکن ہمیں امان کی ضرورت نہیں، خدا کی امان ابنِ سمیہ (ابن زیاد) کی امان سے بہتر ہے۔ (تاریخ طبری ج ۹ ص ۳۰۶)

ابن سعد کا آخری فیصلہ

شمر نے ابن زیاد کا یہ فرمان لاکر ابن سعد کو دیا تو وہ پڑھ کر بہت برہم ہوا اور کہا، تمہارا برا ہو اور جو چیز تم میرے پاس لائے ہو، خدا اس کا برا کرے، خدا کی قسم معلوم ہوتا ہے کہ میں نے ابن زیاد کو جو کچھ لکھا تھا، اس کو قبول کرنے سے تم ہی نے روک کر ہمارا کام بگاڑ دیا ہے، ہم کو امید تھی کہ صلح کی کوئی صورت نکل آئے گی، حسین (علیہ السلام) کے پہلو میں ایک خوددار دل ہے وہ کبھی اس کے سامنے نہ جھکیں گے۔ شمر، عمر ابن سعد کی یہ باتیں سن کر بولا،

بتاؤ اب تم کیا کرتے ہو؟ امیر کے حکم کی تعمیل کر کے ان کے دشمنوں کو قتل کرو گے یا نہیں؟ اگر قتل نہیں کرتے تو فوج میرے حوالے کر دو، ابن سعد کے نفس اور ضمیر میں اب بھی کشمکش جاری تھی (میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ سعد اور بنی امیہ کے تعلقات بھی اچھے نہ تھے) لیکن رے کی حکومت نہیں چھوڑی جاتی تھی اس لیے نفس اور ضمیر کی کشمکش میں بالآخر نفس غالب آگیا اور وہ اس بارِ عظیم کو اُٹھانے کے لیے آمادہ ہو گیا اور شمر سے کہا کہ میں خود اس کام کو کروں گا. تم پیدل کی نگرانی کرو (تاریخ طبری ج ۹ ص ۳۱۷)

اور ۹ محرم ۶۱ھ کو جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں. آغاز جنگ سے پہلے شمر نے حسینی فوج کے پاس جا کر ایک مرتبہ پھر عباسؑ اور ان کے بھائیوں کو سمجھایا کہ بنی اخت میں تم کو امان دیتا ہوں لیکن اس مرتبہ غیرت مند نوجوانوں نے پہلے سے بھی سخت جواب دیا کہ "تجھ پر اور تیری امان پر خدا کی لعنت ہو، اگر تو ہمارا ماموں ہوتا ہم کو امان دیتا اور ابن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہ دیتا!" (ابن اثیر ج ۴ ص ۴۷)

ایک شب کی مُہلت

اس تاریخ کو عصر کے وقت ابن سعد کچھ لوگوں کو ساتھ لیے ہوئے حضرت امام حسین علیہ السلام کی فرودگاہ پر آپؑ سے ملنے آیا. آپ نے ملاقات کے لیے نکلنے کا عزم کیا، لیکن جناب عباس علیہ السلام نے روکا کہ آپؑ تکلیف نہ کیجئے، میں جاتا ہوں، حضرت امام حسین علیہ السلام نے فرمایا اچھا تم ہی جاؤ، مگر یہ پوچھ لینا کہ یہ لوگ کیوں آئے ہیں، چنانچہ جناب عباسؑ جا کر ان سے ملے اور آنے کا مقصد پوچھا، فوجیوں نے جواب دیا کہ امیر فلاں فلاں مقصد سے آئے ہیں، غالباً اس سے آغاز جنگ کی طرف اشارہ تھا. کیونکہ جناب عباس علیہ السلام نے انہیں جواب دیا کہ اچھا ابھی جلدی نہ کرو، میں امام علیہ السلام کو تمہارے آنے کا

[illegible] نے حضرت امام حسین علیہ السلام کو اس امر کی خبر
[illegible] آج رات بھر کی اور مہلت لے لو تاکہ اس آخری
[illegible] دعائیں مانگ لیں، توبہ و استغفار کر لیں، خدا خوب
[illegible] کتاب کی تلاوت اور دعا و استغفار سے کتنا دلی تعلق
[illegible] جا کر ابن سعد کے دستہ سے کہا کہ "آج تم لوٹ جاؤ۔ رات
[illegible] اور جو کچھ فیصلہ ہوگا، صبح جواب دیں گے۔ ابن سعد
نے شمر سے [illegible] ہے اس نے کہا آپ امیر ہیں آپ جانیں' شمر
کے بعد اور لوگوں [illegible] سب نے مہلت دینے کی رائے دی۔

خُطبہ

ابن سعد اس دن لوٹ گیا، ان لوگوں کی واپسی کے بعد
امام علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں کو جمع کر کے حسب ذیل خطبہ دیا:

"میں خدا کا بہترین ثناخوان ہوں اور مصیبت و راحت غرض
ہر حال میں اس کا شکرگذار ہوں، خدایا میں تیری حمد کرتا ہوں
کہ تُو نے ہم لوگوں کو نبوت سے سرفراز فرمایا اور ہمیں گوشِ
شنوا، دیدۂ بینا اور دلِ آشنا دیا۔ ہم کو قرآن سکھایا اور دین
میں فہم عطا کی ہے، اب ہمیں اپنے شکرگذار بندوں میں شامل
فرما۔ ما بعد مجھے کسی کے ساتھی اپنے ساتھیوں سے زیادہ
وفادار اور اپنے اہل بیتؑ سے زیادہ وفادار
نیکوکار اور صلہ رحمی کرنے والا دوسرا گھرانا نہیں معلوم
ہے۔ خدا تم لوگوں کو ہماری جانب سے جزائے خیر دے۔
میں دشمنوں کی وجہ سے آج کا دن کل ہی کا سمجھ رہا ہوں
اس لیے میں تم لوگوں کو بخوشی واپس جانے کی اجازت

دیتا ہوں، میری طرف سے کوئی ملامت نہ ہوگی۔ رات ہو چکی ہے، ایک ایک اونٹ لے لو اور ایک ایک آدمی ... ایک ایک اہل بیت (ع) کا ہاتھ پکڑ کے ساتھ لے لے، خدا تم سب کو جزائے خیر دے، تم لوگ اپنے اپنے شہروں اور دیہاتوں میں چلے جاؤ، یہاں تک کہ خدا یہ مصیبت آسان کر دے، یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ لوگ مجھی کو ڈھونڈیں گے، میرے بعد کسی کی تلاش نہ ہوگی۔"

جاں نثاروں کی تقریریں

اس تقریر پر بھائیوں ... بھتیجوں اور دونوں بھانجوں نے کہا کہ ہم یہ کام کیونکر کریں کیا اس لیے کہ ہم آپ ع کے بعد زندہ رہیں، خدا نہ کرے کہ کسی بھی صورت ایسا ہو۔ جناب عباس ع اس گروہ کی نمائندگی کر رہے تھے۔ اس کے بعد حضرت امام حسین علیہ السلام نے بنی عقیل سے فرمایا، تمہارے لیے مسلم کی شہادت کافی ہے اس لیے تم چلے جاؤ۔ ان لوگوں نے عرض کی سبحان اللہ لوگ کیا کہیں گے وہ کہیں گے کہ اپنے بزرگ اور سردار اپنے چچا زاد کو جو بہترین عزیز تھے تم نے تنہا چھوڑ دیا اور ان کے ساتھ جنگ نہیں کی۔ خدا کی قسم ہم ایسا ہرگز نہیں کریں گے۔ اور یقیناً ہم اپنی جان، مال اور اہل و عیال کو آپ کی راہ میں قربان کر دیں گے۔ آپ کی حفاظت میں لڑیں گے۔ اور جہاں بھی آپ جائیں گے ہم آپ کے ساتھ رہیں گے۔ تف ہو ایسی زندگی پر جو آپ کے بعد میسر آئے۔ مسلم ابن عوسجہ اٹھے اور انہوں نے عرض کی کہ کیا ہم آپ سے روگردانی کر لیں تو پھر خدا کے سامنے آپ ع کے حق کی ادائیگی کے سلسلہ میں ہمارے پاس کیا بہانہ ہوگا۔ خدا کی قسم میں اس نیزے کو سینے پر رکھ کر آگے

بڑھوں گا اور اس شمشیر کو اس وقت تک چلاتا رہوں گا. جب تک اس کا دستہ میرے ہاتھ میں ہے۔ اور اگر اسلحہ نہ بھی ہوگا تو میں پتھر لے کران پر ٹوٹ پڑوں گا. خدا کی قسم ہم آپ ؑ کو کسی صورت نہ چھوڑیں گے تاکہ خدا کو معلوم ہوجائے کہ ہم رسول ؐ کی غیبت میں بھی ان کی حرمت کا پاس رکھتے ہیں۔ بخدا اگر میں جان لوں کہ میں مارا جاؤں گا، پھر زندہ کیا جاؤں گا، پھر جلایا جاؤں گا، پھر زندہ کیا جاؤں گا، پھر مجھے کوٹا جائے گا. اور میرے ٹکڑوں کو پراگندہ کردیا جائے گا اور میرے ساتھ ستر بار ایسا ہی ہوگا. تب بھی میں آپ ؑ سے جدا نہ ہوں گا.

اگر میں آپ کے قدموں میں موت کو پالوں تو میں اس صورت میں یہ کیسے کر سکتا ہوں کہ موت ایک ہی دفعہ آنا ہے اور اس کے بعد ایسی بزرگی کے حصول کا موقع نہیں آئے گا۔ اصحاب میں سے زہیر ابن قین ؓ اٹھے اور عرض کی میرے لیے یہ بات پسندیدہ ہے کہ مجھے مارا جائے پھر مارا جائے اور یہ عمل میرے ساتھ ہزار مرتبہ دہرایا جائے اور خداوندِ عالم اس صورت میں آپ ؑ اور آپ کے اہل بیت ؑ کو قتل سے محفوظ فرمادے۔ اصحاب کے ہر گروہ نے ایک دوسرے سے ملتی جلتی گفتگو کی۔

ایک شب کی مہلت طلب کرنے اور اعزہؒ اصحابِ باوفا کے سامنے حقیقت پر مبنی خطبہ دے کر ان کو میدانِ جنگ سے واپس لوٹ جانے کا مشورہ دینا اور اس خطبہ کے جواب میں بنو عقیل اور اصحاب کی جوابی تقاریر سے المیہ کربلا پر واشگاف الفاظ میں روشنی پڑتی ہے اور واقعۂ کربلا کا پس منظر روزِ روشن کی طرح عیاں ہوجاتا ہے، اس موقع پر حضرت امام حسین علیہ السلام کی شخصیت ایک عظیم منارۂ نور کی مانند سامنے آجاتی ہے۔ ان واقعات کا جب روحانی اور تاریخی اعتبار سے جائزہ لیتے ہیں تو ہم کو یہ حقیقت معلوم ہوجاتی ہے کہ وہ جس حکومت سے برسرِ پیکار

تھے وہ نہ دینی حیثیت رکھتی تھی اور نہ خلافت راشدہ کے قائم کردہ اصولوں کے مطابق دنیاوی اعتبار سے درست تھی. حقیقتاً وہ ایک قبائلی حکومت تھی جس کا مقصد ہر حیلہ ناجائز سے ایک مخصوص قبیلے کے موروثی حق کو مستقل اور مستحکم کرنا تھا خواہ اس کے برقرار رکھنے میں احکامِ قرآن کی خلاف ورزی ہو یا سُنّتِ رسول ؐ کی تذلیل ، مگر ہر قیمت پر یہ حکومت لوگوں کے سروں پر مسلط رہے اگر بیت المال کا پیسہ جو عام مسلمانوں کی مِلک تھا لوگوں کے ضمیر خریدنے اور سروں کو اڑا دینے میں بھی کام آئے تو ان کے نزدیک یہ بات معیوب نہ تھی یہ چیز حضرت امام حسین علیہ السلام کے سامنے تھی اور انہوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ ایسی حکومت کا قیام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محنتِ شاقہ پر پانی پھیر دے گا. اور مسلمان بہت جلد اسی نظام کیطرف پلٹ جائیں گے کہ جس نظام کو ان کے نانا (ص) نے کالعدم قرار دے دیا تھا.

ایک شب کی مہلت اس لیے طلب کی گئی تھی کہ اس شب کو جو دنیا میں ان کی آخری شب تھی دل کھول کر طاعت الٰہی میں بسر فرمائیں تاکہ فریق مخالف کو یہ احساس پیدا ہو جائے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام جنگ کی ہولناکیوں میں بھی طاعتِ باری تعالیٰ سے غافل نہیں ہیں، یقیناً وہ ذات لائق عبادت ہے. ایسا کرنے سے حضرت امام حسین علیہ السلام کا مقصد ان کے قلوب کی شقاوت دور کر کے جذبہ صلہ رحمی پیدا کرنا تھا لہٰذا جن میں صلاحیت تھی وہ حضرت امام حسین علیہ السلام سے مل گئے یہ واضح ہے کہ ہادی یا امام کا فرض حق تبلیغ کو بہ احسن وجوہ انجام دینا ہے اور پیام ربانی خود کو ہلاکت میں ڈال کر بھی دنیا والوں تک پہنچانا ہے. اس کے بعد ہادی کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے اور پھر یہ ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے جن کو پیام پہنچایا جاتا ہے، اگر وہ اس پیام کو سننے کے بعد احکام

خداوندی پر عمل نہیں کرتے تو پھر میدان حشر میں محاسبہ ہادی کا نہیں ہوگا بلکہ جن کو پیام پہنچایا گیا تھا ان سے پوچھ گچھ ہوگی اور سزا و جزا کے وہ مستحق ہوں گے اس اعتبار سے اگر ہم دیکھیں تو کربلا میں حضرت امام حسین علیہ السلام نے اتمام حجت کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا نہ صرف انہوں نے اپنے مخالفین کو تلقین و ہدایت کی بلکہ اپنے ساتھیوں کا بھی امتحان لیا جو بحیثیت امام حاضران کا فرض اولین تھا اس سلسلہ میں آپ نے بنو عقیل، مسلم ابن عوسجہ، سعد بن عبداللہ حنفی اور زہیر ابن قین وغیرہ کی جرأت افروز اور معرفت کردگار میں ڈوبی ہوئی تقریریں بھی ملاحظہ کیں ان تقاریر سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی غلط فہمی میں امام حسین علیہ السلام کا ساتھ نہیں دے رہے تھے بلکہ وہ حقیقت ابدی کو پا چکے تھے اور مثل اپنے سردار و آقا کے احیائے دین خداوندی پر جان فدا کرنے پر آمادہ تھے، جس کا مظاہرہ انہوں نے اگلے دن کر دیا اور ظلم و بربریت کے تابوت میں اپنی شہادت سے آخری اور مضبوط کیل ٹھونک دی۔

قیامتِ صغریٰ

شب عاشورہ ختم ہو جانے کے بعد وہ صبح قیامت نمودار ہوئی جس میں تاریخ اسلام کا سب سے زیادہ دلدوز واقعہ پیش آنے والا تھا اور باختلاف روایت جمعہ یا سنیچر کے دن بعد نماز فجر حسینی فوج لڑنے کے لیے تیار ہو گئی یہ کوئی لشکر جرار نہ تھا بلکہ بہترین جانثاروں کی ایک مختصر جماعت تھی جس کی ترتیب یہ تھی:-

میمنہ پہ زہیر ابن قین

میسرہ پہ حبیب ابن مظاہر

عباس علمدار کے ہاتھوں میں حسینی علم تھا۔

ادھر یہ مٹھی بھر جاں نثار تھے، دوسری طرف چار ہزار شامی تھے

حضرت امام حسین علیہ السلام جب میدانِ جنگ میں جانے کے لیے رہوار پر سوار ہوئے تو قرآن سامنے رکھا اور دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر بارگاہِ ایزدی میں دعا کی۔

تعداد فوج کربلا میں حضرت امام حسین علیہ السلام سے نمٹنے کے لیے جتنی فوجیں گئی تھیں ان کی تعداد میں اختلاف ہے۔ لیکن یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ افواج کی تعداد بہر صورت چار ہزار سے کئی گنا زیادہ تھی اور حکومت کے پاس اس قدر زیادہ فوج روانہ کرنے کا سیاسی جواز بھی موجود تھا۔

کربلا میں حر کے ساتھ ایک ہزار فوج پہلے ہی سے موجود تھی، اب عمرو بن سعد کی فوج مل کر پانچ ہزار ہو گئی۔ حضرت امام حسین علیہ السلام اور ان کی مختصر جماعت کے لیے ظاہری حیثیت میں اتنا لشکر بہت تھا مگر امام حسین علیہ السلام کی خاندانی شجاعت اور ان کی سچائی کی طاقت، قبائل حجاز و عراق، بصرہ اور یمن بنی عدی اور بنی اسد وغیرہ میں ان کی مقبولیت، سیاسی اثر و نفوذ کی بنا پر ابن زیاد کے دل پر اتنا رعب تھا کہ وہ فوج کی زیادہ سے زیادہ مقدار کو بھی کم سمجھتا رہا، چنانچہ حصین بن نمیر کو توال شہر کوفہ کی سرداری میں قادسیہ کے ناکہ پر جو باقی تین ہزار فوج تھی وہ پوری کی پوری کربلا کیطرف منتقل کر دی گئی۔ اس کے بعد کوفہ میں عام بھرتی کا اعلان کر دیا گیا اور ابن زیاد خود کوفہ سے باہر نکل کر نخلیہ میں جو کربلا کے راستہ پر تھا آ کر خیمہ زن ہو گیا تاکہ اپنے سامنے افواج کا معائنہ کر کے پے در پے فوج کربلا کی جانب روانہ کرے اور بڑے بڑے سردارانِ کوفہ، حجاز ابن البحر، شیث بن ربعی، عمرو بن حجاج وغیرہ کو مامور کیا گیا کہ وہ اپنی جماعت کے ساتھ کربلا روانہ ہوں، ان میں سے ہر ایک کثیر فوج کے ساتھ روانہ ہوتا تھا ان میں سے کسی کا کوئی عذر بھی نہیں سنا جاتا تھا۔ چنانچہ شیث نے بیماری کا عذر کیا تھا۔

لیکن ابن زیاد نے کہا کہ تم بیمار بن رہے ہو اگر تم ہماری اطاعت میں ہو تو ہمارے دشمن سے جنگ کے لیے روانہ ہو جاؤ۔ مجبوراً شبث بھی روانہ ہوا۔ بعض اشخاص ایسے تھے کہ ابن زیاد کو اپنی صورت دکھا کر پھر کوفہ واپس چلے جاتے تھے، جب ابن زیاد کو اس کا علم ہوا تو اس نے سوید بن عبدالرحمٰن منقری کو کچھ سواروں کے ساتھ کوفہ روانہ کیا کہ جو شخص کوفہ میں نظر آئے اور وہ ابھی تک (امام) حسین (علیہ السلام) سے جنگ کرنے کو روانہ نہیں ہوا اسے گرفتار کر کے میرے پاس لاؤ، چنانچہ سوید نے کوفہ کے قبیلوں میں گردش کی، اتفاق سے ایک شخص شام کا رہنے والا اپنے کسی متروکہ جھگڑے میں کوفہ آیا تھا، سوید نے اسے پکڑ کر ابن زیاد کے پاس بھیج دیا۔ اس کی گردن ماردی گئی، اس واقعہ سے تمام لوگوں پر دہشت طاری ہو گئی اور سب امام حسین علیہ السلام سے جنگ کے لیے نکل کھڑے ہوئے اسکے بعد تاریخ کے لحاظ سے مردم شماری کی ضرورت نہیں اور نہ علماء کے اقوال دیکھنے کی حاجت ہے کہ بیس ہزار تھے جسے ابن طاؤس نے ترجیح دی ہے یا تیس ہزار جس کو علامہ مجلسی نے مانا ہے یا پینتیس ہزار جیسا کہ ابن شہر آشوب نے لکھا ہے یا ایک لاکھ تک مطابق بعض اہل حقائق کی تحریر کے۔ بلکہ گذشتہ جمعرات کا دن گذرنے کے بعد عاشورہ کی وہ تاریک رات نمودار ہوئی جس کی صبح کو میدانِ کربلا میں قیامت برپا ہونے والی تھی۔ درمیان میں صرف ایک ہی رات رہ گئی تھی، جس میں حضرت امام حسین علیہ السلام کو محرابِ عبادت میں جمالِ حقیقت کے ساتھ راز و نیاز کرنی اور اس کی راہ میں جان دینے کی تیاریاں کرنی تھیں۔ چنانچہ آپؑ نے منتشر خیموں کو ایک جگہ ترتیب سے نصب کرا دیا۔ ان کی پشت پر خندق کھدوا کر آگ جلوا دی کہ دشمن عقب سے حملہ آور نہ ہو سکیں اور ہتھیاروں کی صفائی کرائی۔ جس وقت آپؑ کی جاں نثار بہن حضرت زینبؑ کو ان انتظامات سے ہونے والے واقعات کا کچھ اندازہ ہو گیا تھا اور حضرت امام حسین علیہ السلام

کے پاس دوڑتی ہوئی آئیں اور چیخ چیخ کر رونے لگیں کہ "کاش کہ آج موت میری زندگی کا خاتمہ کر دیتی، ہائے میری ماں فاطمہ سلام اللہ علیہا، میرے باپ علی علیہ السلام اور میرے بھائی حسن علیہ السلام میں سے کوئی بھی باقی نہیں رہا ہے، بھیا ان گذرے ہوؤں کے جانشین اور ہم لوگوں کے محافظ، ہمارا سہارا تم ہی ہو۔" بہن کو اس طرح مضطرب اور بے قرار دیکھ کر فرمایا "زینب! حلم و وقار کو شیطان کے حوالہ مت کرو۔" لیکن یہ وقت وقار اور سکینہ کا نہیں تھا زینب بولیں "بھائی میں آپ ؑ پر سے قربان، آپ ؑ کے بدلہ میں اپنی جان دینا چاہتی ہوں۔" بہن کی یہ دلدوز اور محبت بھری باتیں سن کر بھائی کا دل بھر آیا۔ اور آپ ؑ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے، فرمایا زینب ذرا چین سے رہنے دو۔ یہ سن کر زینب نے منہ پیٹ لیا اور دھاڑیں مار کر رونے لگیں کہ "آپ ؑ کا اپنے کو مجھ سے الگ الگ کھنا میرے دل کے ٹکڑے اُڑا دیتا ہے۔" یہ کہا اور چیخ مار کر بیہوش ہو گئیں، جب ہوش آیا تو صبر کی تلقین کی کہ "زینب خدا سے ڈرو اور خدا سے تسکین حاصل کرو ایک نہ ایک دن سارے روئے زمین کے باشندے مرجائیں گے، آسمان والوں میں بھی کوئی باقی نہ رہے گا آسمان اور زمین کی سب چیزیں فانی ہیں، صرف ایک خدا کی ذات باقی رہے گی، میری ماں (ع)، میرے باپ ؑ میرے بھائی ؑ سب مجھ سے بہتر تھے اور ہر مسلمان کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات نمونہ ہے، تم اس نمونہ سے صبر و تسلی حاصل کرو، میں تم کو خدا کی قسم دلاتا ہوں کہ اگر میں مرجاؤں تو اسوۂ رسول ؐ کے خلاف نہ کرنا۔ میری موت پر گریبان نہ پھاڑنا، منہ نہ نوچنا اور بین نہ کرنا" بہن کو صبر و شکر اور ضبط و تحمل کی تلقین کر کے خیمہ سے باہر تشریف لائے اور حفاظت کے ضروری انتظامات کر کے صبح صادق تک سب لوگ نماز، دعا، استغفار اور تضرع و زاری میں مصروف رہے۔

(ابن اثیر ج ۴ ص ۵)

حیاتِ مستعار، حصول مقصد، نانا م کی تربیت کا اثر دکھانے، نیز شخصیت اور کردار کی بلندی کو ظاہر کر دینے کی یہ آخری شب تھی، اس شب میں آپ ؑ کو جملہ عبادات میں جمال حقیقت کے ساتھ راز و نیاز کرنا اور اس کی راہ میں جان دینے کی تیاریاں کرنا تھیں. پند و نصائح کے نئے باب کھولنا تھے. بہن کو جوان کے مقصد کو لے کر آگے بڑھنے والی تھیں صبر اور ہمت کی تلقین فرماتے. دنیا کی بے ثباتی کا نہایت مؤثر انداز میں نقشہ کھینچتے ہیں تاکہ اس کی رنگینیوں میں ملوث ہو کر انسان اپنے وجود کو نہ کھودے اور ذات باری سے بے نیاز ہو جائے. اسوۂ رسول ؐ اور قرآن ان کے پیش نظر تھا. کربلا کیا تھی، درحقیقت احیائے اسوۂ رسول ؐ تھی اور اپنے کردار سے اور اپنے زاہد و متقی ساتھیوں کی معیت میں آپ نے شبِ عاشورہ اسوہ رسول ؐ کو ابدالاباد تک کے لیے زندہ و تابندہ کر دیا. انتظامات کی فہرست ہی سے ظاہر ہے کہ کوفہ کی تمام قابل جنگ آبادی کربلا میں دھکیل دی گئی تھی جس کے بعد کربلا کی زمین فوجوں کی کثرت سے موجیں مارنے لگی تھی.

ایک طرف یہ فوجی انتظامات تھے. دوسری طرف سیاسی انتظامات اس طرح کیے گئے تھے. اس سلسلے میں یزید کا ایک فرمان ملاحظہ فرمائیں جو اس نے ابن زیاد کو تحریر کیا تھا.

”مجھے خبر ملی ہے کہ (امام) حسین بن علی (علیہما السلام) عراق کی طرف متوجہ ہو چکے ہیں لہٰذا تم کو لازم ہے کہ ہوشیاری کے ساتھ جاسوس مقرر کرو. مورچے مضبوط کرو، کسی شخص پر وہم و گمان بھی ہو تو اس کا تدارک کرو اور فوراً گرفتار کر لو۔“

اب کیا تھا جیلخانے قیدیوں سے چھلکنے لگے، جس کا اظہار خود ابن زیاد نے اس کے بعد ان الفاظ میں کیا کہ ”کوئی ایسا شخص نہیں جس پر گمان ہو سکتا ہو کہ وہ حکومت کی مخالفت کرے گا.

مگر یہ کہ وہ قید خانے کے اندر ہے؟

شہر کے اندرونی حالات پر قابو پانے کے بعد اس نے باہر کیطرف توجہ کی اس لیے کہ اسے اندیشہ تھا کہ کہیں بصرہ و مدائن اور دیگر اطراف کے لوگ امام حسین علیہ السلام کی مدد کو نہ آجائیں اسلیے حدود کی ناکہ بندی ہوئی اور قادسیہ میں جو حجاز و عراق و شام کے خطوط سیر کا محل اجتماع تھا، چار ہزار سواروں کے ساتھ حصین ابن نمیر کو جواب تک کوتوال شہر کی حیثیت رکھتا تھا، مقرر کیا گیا اور واقصہ سے لے کر قطقطانہ، لعلع اور خفان اور اطراف و جوانب میں جو شام و بصرہ کے راستے میں تھے، لشکر پھیلا دیا گیا۔ یہاں تک کہ نہ کوئی شخص آسکتا تھا اور نہ باہر جاسکتا تھا۔ گویا ڈیفنس رولز پر عملدرآمد ہو رہا تھا۔

اس کے علاوہ کوفہ کے وہ بااثر و ذی اقتدار رؤسا، جنہوں نے آپؑ کو کوفہ آنے کی دعوت دی تھی وہ سب زیر حراست اپنے اپنے گھروں میں نظربند تھے مثلاً سلیمان ابن صرد خزاعی جو اصحاب رسولؐ میں سے تھے، مسیب بن نجبہ فزاری جو اصحاب علیؑ میں سے تھے۔ عبداللہ ابن سعد بن نفیل ازدی، عبداللہ ابن دال تیمی، اور رفاعہ بن شداد بجلی، یہ سب حضرات بعد میں گروہ توابین کے نام سے موسوم ہوئے اور عظیم شخصیت امیر مختار کی تھی انہیں بھی قید خانہ بھجوا دیا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صرف بہتر نفوس سے مقابلے کے لیے جن کو زینت محراب و منبر بھی کہا جاتا ہے یزیدی حکومت اسقدر پریشان کیوں تھی کہ ایسے سخت انتظامات کئے گئے، ایران کی بغاوت کے مسئلے تک کو کربلا کے مقابلے میں مؤخر قرار دے دیا اور وہ فوجیں بھی کربلا بھیج دیں۔ تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے میرا خیال یہ ہی ہے کہ اگر یزیدی حکومت اتنے سخت

انتظامات نہ کرتی تو یقیناً حضرت امام حسین علیہ السلام بہ آسانی عراق کے دارالحکومت کوفہ میں داخل ہو جاتے اور ان کے کوفہ میں داخل ہونے کے بعد عربی سیاست ضرور مخالف رخ اختیار کر لیتی اس لیے کہ عام طور سے عراق و حجاز کے باشندے اموی حکومت کو پسند نہیں کرتے تھے اس کا ثبوت قتلِ عثمانؓ کے وقت مل گیا تھا اور کچھ بعید نہ تھا کہ اسطرح اموی حکومت ختم ہو کر صحیح ہاتھوں میں پہنچ جاتی مکہ میں عبد اللہ ابن زبیر نے یزید کے زمانہ حیات میں خروج کر دیا تھا اور ایک متوازی حکومت قائم کر لی تھی، جب عبداللہ ابن زبیر کو عوام سے یہ تائید حاصل ہو سکتی تھی تو امام حسین علیہ السلام تو عبداللہ ابن زبیر سے بدرجہا افضل و اشرف تھے، ان کو اس قسم کی تائید حاصل ہونا کچھ بعید نہ تھا مگر حالات نے ساتھ نہ دیا۔

بارگاہ ایزدی میں دُعا

خدایا ہر مصیبت میں تیرا بھروسہ اور ہر تکلیف میں تیرا آسرا ہے مجھ کو جو وقت آئے، ان میں تو ہی میرا پشت پناہ تھا، بہت غم و اندوہ ایسے ہیں جن میں دل کمزور پڑ جاتا ہے، کامیابی کی تدبیریں کم ہو جاتی ہیں اور رہائی کی صورتیں گھٹ جاتی ہیں، دوست اس میں ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور دشمن شماتت کرتے ہیں، لیکن میں نے اس قسم کے تمام نازک اوقات میں سب کو چھوڑ کر تیری طرف رجوع کیا، تجھی سے اس کی شکایت کی، تُو نے ان مصائب کے بادل چھانٹ دیئے، اور ان کے مقابلے میں میرا سہارا بنا، تو ہی ہر نعمت کا ولی اور ہر بھلائی کا مالک اور ہر آرزو اور خواہش کا منتہیٰ ہے۔

آپؑ دعا سے فارغ ہوئے تھے کہ شمر نے اس آگ کے شعلوں کو دیکھ کر جو خیموں کی پشت پر اس کی حفاظت کے لئے جلائی تھی، بآواز بلند کہا، حسین (علیہ السلام) قیامت سے

پہلے دنیا میں ہی آگ مل گئی، آپؑ نے جواب دیا " تو اس میں جلنے کا زیادہ مستحق ہے " مسلم بن عوسجہ نے عرض کی " یا ابنِ رسول اللہؐ شمر زد میں ہے۔ ارشاد ہو تو تیر چلا کر اس کا خاتمہ کردوں "۔ فرمایا: " میں اپنی جانب سے ابتدا کرنا نہیں چاہتا " اور شامی فوج کے قریب جا کر بطور اتمام حجت کے فرمایا:

اتمامِ حجت

" لوگو! جلدی نہ کرو، پہلے میرا کہنا سن لو، اور مجھ پر سمجھانے کا جو حق ہے، اسے پورا کر لینے دو، اور میرے آنے کا عذر بھی سن لو، پھر تم کو اختیار ہے، اگر میرا عذر قبول کر لو گے، میرا کہنا سچ مانو گے اور انصاف سے کام لو گے، تو خوش قسمت ہو گے اور تمہارے لیے میری مخالفت کی کوئی سبیل باقی نہ رہے گی۔ اور اگر تم نے میرا عذر قبول نہ کیا اور انصاف سے کام نہ لیا تو فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ ۝ (سورۂ یونس آیت ۷۱)
اِنَّ وَلِیِّۦَ اللّٰهُ الَّذِیْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ ۖ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ ۝ (سورۂ اعراف آیت ۱۹۶)

پس تم اور تمہارے شریک سب مل کر اپنی ایک بات ٹھہرا لو تاکہ تمہاری وہ بات تم میں سے کسی کے اوپر مخفی نہ رہے، پھر تم میرے ساتھ جو کرنا چاہتے ہو کر ڈالو اور مجھے مہلت نہ دو۔
بے شک میرا ولی اللہ ہے، جس نے کتاب نازل کی اور وہی صالحین کا ولی ہے۔"

آپؑ کی بہنوں اور صاحبزادیوں نے یہ تقریر سنی تو خیمۂ امامت میں ماتم بپا ہو گیا، ان کے رونے کی آوازیں سن کر آپؑ نے جناب عباسؑ اور علیؑ کو بھیجا کہ جا کر انہیں خاموش کر دو، میری عمر کی قسم، ابھی ان کو بہت رونا ہے۔" بہنوں

اور لڑکیوں کو خاموش کرنے کے بعد ایک مرتبہ پھر آخری مرتبہ اتمام حجت کے لیے کوفیوں کے سامنے تقریر فرمائی کہ :-

"لوگو! میرے نسب پر غور کرو، میں کون ہوں؟ پھر اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر اپنے کو ملامت کرو، خیال کرو کہ میرا قتل اور میری آبروریزی تمہارے لیے زیبا ہے!؟ کیا میں تمہارے نبی (ص) کی بیٹی کا لڑکا اور اس کے وصی ابن عم خدا پر سب سے پہلے ایمان لانے والے، اس کے رسول اور اس کی کتاب کی تصدیق کرنے والے کا فرزند نہیں ہوں؟ کیا سید الشہداء حمزہ میرے باپ کے اور جعفر طیار ذوالجناحین میرے چچا نہ تھے؟ کیا تم کو نہیں معلوم کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرے اور میرے بھائی کے متعلق فرمایا تھا کہ "یہ دونوں نوجوانان جنت کے سردار ہیں"۔ اگر میں سچ کہتا ہوں اور یقیناً سچ کہتا ہوں، کیونکہ جب سے مجھے معلوم ہے کہ جھوٹے پر خدا کا غضب نازل ہوتا ہے، اسوقت سے میں عمداً جھوٹ نہیں بولا اور اگر مجھے جھوٹا سمجھتے ہو تو تم میں اس کے جاننے والے موجود ہیں، ان سے اس کی تصدیق کرلو۔ جابر ابن عبد اللہ انصاری، ابو سعید خدری، سہیل بن سعد ان عدی، زید بن ارقم، یونس بن مالک ابھی زندہ ہیں۔ ان سے پوچھو یہ تمہیں بتائیں گے کہ انہوں نے میرے اور میرے بھائی کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیا سُنا ہے۔ مجھے بتاؤ کیا اس فرمان میں میری خوں ریزی کے لیے کوئی روک نہیں؟"

اس تقریر کے دوران شمر ذی الجوشن نے حضرت امام حسین علیہ السلام کے ایمان پر چوٹ کی۔ حبیب ابن مظاہر نے اس کا دندان شکن جواب دے کر کہا امام حسین علیہ السلام جو کچھ فرماتے ہیں، اس کو تو نہیں سمجھ سکتا کیونکہ خدا نے تیرے قلب پر مہر لگا دی ہے۔ ذی الجوشن اور حبیب کے اعتراض و جواب کے بعد امام علیہ السلام نے پھر تقریر کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے فرمایا:

"خیر اگر تم کو اس میں کچھ شک ہے، تو اسے جانے دو، لیکن کیا اس میں بھی شبہ ہے کہ میں تمہارے نبی (ص) کا بیٹا ہوں۔ خدا کی قسم آج مشرق سے لیکر مغرب تک روئے زمین پر تم میں اور کسی غیر قوم میں بھی میرے سوا کسی نبی کا کوئی نواسہ موجود نہیں ہے۔ میں خاص تمہارے نبی (ص) کی لڑکی کا بیٹا ہوں، مجھے بتاؤ، تم لوگ میرے خون کے کیوں خواستگار ہو، کیا میں نے کسی کو قتل کیا ہے؟ کسی کا مال ضائع کیا ہے؟ کسی کو زخمی کیا ہے؟"

ان نصائح اور سوالات کو سن کر سب خاموش رہے کسی نے کوئی جواب نہیں دیا، اس کے بعد آپ ؑ نے نام لے کر سوالات شروع کیے

"اے شیث ابن ربعی، اے حجاز ابن ابجر، اے قیس ابن اشعث اے یزید ابن حارث، کیا تم نے مجھ کو نہیں لکھا تھا، پھل پک چکے ہیں، کھجوریں سرسبز ہیں، دریا جوش میں ہیں فوجیں تیار ہیں، تم فوراً آ جاؤ، ان لوگوں نے جواب دیا، ہم نے نہیں لکھا تھا، فرمایا: "سبحان اللہ خدا کی قسم تم نے لکھا تھا، لوگو اگر تم کو میرا آنا ناگوار ہے تو مجھے چھوڑ دو تاکہ میں کسی پُرامن خطہ کیطرف چلا جاؤں۔"

اس پر قیس بن اشعث بولا، تم اپنے ابن عم کا کہنا

کیوں نہیں مان لیتے، ان کی رائے تمہاری مخالف نہ ہو گی اور ان کی جانب سے کوئی نامناسب سلوک نہ ہوگا۔" حضرت امام حسین علیہ السلام نے فرمایا کیوں نہیں آخر تم بھی تو اپنے بھائی ہو، تم کیا یہ چاہتے ہو کہ بنو ہاشم مسلم بن عقیل کے خون کے علاوہ تم سے دوسرے خون کے بدلہ کا مطالبہ کریں۔ خدا کی قسم میں ذلیل کی طرح اس کے ہاتھ میں ہاتھ نہ دوں گا. اور غلام کی طرح اس کا اقرار نہیں کروں گا اور یہ آیت تلاوت فرمائی: (طبری جلد ۷ ص ۳۲۹ - ۳۳۰)

وَاِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ ۝ (سورۂ دخان آیت ۲۰)

اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا یُؤْمِنُ بِیَوْمِ الْحِسَابِ ۝ (سورۂ مومن آیت ۲۷)

اور میں اپنے اور تمہارے رب سے پناہ مانگتا ہوں کہ تم مجھ کو سنگسار کرو، میں اپنے اور تمہارے رب سے ہر مغرور و متکبر سے جو قیامت پر ایمان نہیں رکھتا پناہ مانگتا ہوں۔"

اس تقریر کے بعد آپؑ سواری بٹھا کر اُتر پڑے اور شامی آپؑ کی طرف بڑھے ان کے ہجوم کو دیکھ کر زہیر بن قین نے شامیوں کے سامنے بڑی پرجوش تقریر کی۔

زہیر بن قین کی تقریر

"اے اہلِ کوفہ! خدا کے عذاب سے ڈرو، ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اپنے دوسرے مسلمان بھائی کو نصیحت کرے، ابھی تک ہم آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ ایک مذہب اور ایک ملت کے ماننے والے ہیں۔ جب تک ہمارے درمیان تلوار نہ اُٹھ جائے اس وقت تک ہم کو تمہیں نصیحت کرنے کا حق ہے، جب آپس میں تلواریں اُٹھ جائیں گی تو ہمارا تمہارا رشتہ ٹوٹ جائے گا۔ اور ہماری تمہاری جماعت الگ الگ ہو جائے گی. خدا نے ہم کو اور تم کو نبی صلی اللہ علیہ و آلہ

وسلم کی ذریت کے بارے میں آزمائش میں مبتلا کیا ہے کہ ہم ان کے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں؟ میں تم کو ان کی امداد اور عبیداللہ ابن زیاد کا ساتھ چھوڑنے کی دعوت دیتا ہوں، اسلیے کہ تم کو ان سے سوائے برائی کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ وہ تمہاری آنکھوں میں گرم سلائیاں پھیریں گے، تمہارے ہاتھ پاؤں کاٹیں گے، تمہارا مثلہ کریں گے، تم کو کھجور کی شاخوں پر لٹکائیں گے۔ حجر بن عدی اور ہانی بن عمروہ وغیرہ کیطرح تمہارے ممتاز لوگوں کو قتل کردیں گے۔" زہیر بن قین کی یہ تقریر سُن کر کوفیوں نے اُنہیں گالیاں دیں اور ابن زیاد کی تعریف کر کے بولے، خدا کی قسم ہم حُسین (علیہ السلام) اور ان کے ساتھیوں کو قتل یا انہیں گرفتار کر کے امیر ابن زیاد کے پاس پہنچائے بغیر نہیں ٹل سکتے، زہیر ابن قین نے پھر انہیں سمجھایا کہ "خدا کے بندو فاطمہؑ کا فرزند ابن سمیہ کے مقابلے میں امداد و اعانت کا زیادہ مستحق ہے اگر ان کی مدد نہیں کرتے تو خدارا انہیں قتل تو نہ کرو، ان کا معاملہ ان کے اور ان کے ابن عم یزید پر چھوڑ دو، خدا کی قسم وہ (امام) حسین علیہ السلام کو قتل نہ کرنے کی صورت میں تم سے زیادہ رضامند ہوگا۔" اس پر شمر ذی الجوشن نے زہیر ابن قین کو ایک تیر مارا اور کہا "خاموش رہو۔ خدا تمہارا مُنہ بند کردے۔ اپنی بک بک سے پریشان کر ڈالا"، اس پر زہیر نے کہا "ابن بوال تجھ سے کون خطاب کرتا ہے کہ تُو تو جانور ہے۔ خدا کی قسم میرا خیال ہے کہ تُو کتاب اللہ کی آیتوں کو بھی نہیں جانتا۔"

شمر بولا "خدا تجھ کو اور تیرے ساتھی کو ایک ساتھ قتل کرے"، زہیر نے جواب دیا کہ "موت سے ڈراتا ہے، خدا کی قسم امام حسین علیہ السلام کے ساتھ جان دینا مجھ کو تیرے ساتھ دائمی زندگی سے پسند ہے" پھر بآواز بلند کوفیوں کو خطاب کیا کہ "لوگو! تم اس سنگدل ظالم کے فریب میں نہ آؤ، خدا کی قسم جو لوگ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کی اولاد اوران کے اہل بیت ؑ کا خون بہائیں گے ۔ وہ قیامت کے دن آپ ؑ کی شفاعت سے محروم رہیں گے ۔"

بارگاہ ایزدی میں حضرت امام حسین علیہ السلام کی دعا آپ کو معرفتِ الٰہی کی اس منزل پر فائز کردیتی ہے جس کے بعد کوئی منزل ہی باقی نہیں رہ جاتی ہے ایک شخص جو ہر طرح کے مصائب میں مبتلا ہے اور لحظہ بہ لحظہ موت اس سے قریب تر ہوتی چلی جارہی ہے اس موقع پر ایمان محکم شاید ہی کبھی دیکھنے میں آیا ہو، دشمنوں میں محصور ہوجانے کے بعد بھی یہ ہی فرمارہے ہیں کہ ان کے مقابلہ میں تو ہی میرا سہارا بنا۔ خدایا تو ہر مصیبت میں میرا بھروسہ اور ہر تکلیف میں میرا سہارا ہے۔ یہ ہے وہ کردار جس کی تعمیر ان کے مقدس نانا ؐ اور پدر گرامی ؑ نے فرمائی تھی۔ لہٰذا ملّتِ مُسلمہ کی سربراہی کا ایسے ہی باکردار انسان کو حق تھا پھر آپ ؑ کی تقاریر جو اتمام حجت کے لیے تھیں، اس پیدا شدہ شک کو بھی ختم کردیتی ہیں جب وہ اپنا تعارف کراتے ہیں کہ میرا کس خاندان سے تعلق ہے اور مجھ ہی کو کتاب و حکمت کی رو سے تمہاری رہنمائی کا حق ہے اور پھر میں تمہارے ملک میں از خود نہیں آیا بلکہ تم نے بلایا تھا اس لیے کہ تم بے امام تھے۔

آپ ؑ کی تقاریر کا بنیادی پہلو یہ ہے کہ جو لوگ تمہارے سروں پر مسلط ہو چکے ہیں وہ تو نام نہاد مسلمان ہیں اور تم کو مخالف سمت چلا رہے ہیں جس میں تمہاری تباہی ہی تباہی ہے، اگر وہ باایمان ہوتے تو مجھ جیسی شخصیت سے برسرِ پیکار نہ ہوتے لہٰذا ان سے میری لڑائی اسلام و کفر کا معاملہ ہے۔ لہٰذا تم ایسی جماعت کا ساتھ دو جو تم کو دنیاوی اور ابدی نعمتوں سے بہرہ ور کرسکے۔ زہیر ابن قین کا کم و بیش یہ ہی متن ہے اور ان کی تقاریر میں بھی اپنے امام علیہ السلام کی تقریروں کی روح پائی جاتی ہے۔

جن کے دلوں میں معرفت کردار کی تھوڑی سی بھی روشنی

تھی وہ حسینی کردار سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور انہوں نے لشکر یزید کو خیر باد کہہ کر حسینی جماعت میں شرکت کر کے اپنا مقام بنالیا، ان میں حضرت حر کی خدمات کو کبھی فراموش کیا جا سکتا۔

حضرت حر کی آمد

کوفیوں کی آنکھوں پر پردے پڑ چکے تھے اور دل پر مہر لگ چکی تھی، اسلیے حضرت امام حسین علیہ السلام اور آپؑ کے ساتھیوں کی ساری افہام و تفہیم رائیگاں گئی، کسی پر کوئی اثر نہ ہوا اور امام علیہ السلام نے زہیر ابن قین کو واپس بلالیا، ان کی واپسی کے بعد کوئی حجت باقی نہ رہی اور عمر بن سعد حضرت امام حسین علیہ السلام کی طرف بڑھا، اور اس کی پیشقدمی کے ساتھ ہی اس گروہ اشقیا میں سے دفعتًا ایک پرستار حق نکل آیا، یہ حر تھے۔ عین اسوقت جب طبلِ جنگ پر چوٹ پڑنے کو تھی، حر کی آنکھوں کے سامنے سے تاریکی کا پردہ ہٹ گیا اور حق کی روشنی نظر آنے لگی۔ چنانچہ وہ کوفی فوج کا ساتھ چھوڑ کر حضرت امام حسین علیہ السلام کی فوج میں چلے آئے اور عرض کی، میری جانب سے جو کچھ گستاخیاں اور بے عنوانیاں ہو چکیں وہ ہو چکیں اب اپنی جان غمگساری کے لیے حاضر کرتا ہوں، امید ہے در توبہ باز ہوگا۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے فرمایا، تمہاری توبہ قبول ہوگئی تم کو بشارت ہو کہ تم دنیا و آخرت دونوں میں حر ہو۔

حضرت حر کی تقریر

حسینی فوج میں شامل ہونے کے بعد حضرت حر نے کوفیوں سے کہا، لوگو! امام حسین علیہ السلام نے تین صورتیں جو تمہارے سامنے پیش کی ہیں ان میں سے کوئی صورت کیوں نہیں منظور کر لیتے۔ تاکہ خدا تم کو ان کے ساتھ لڑنے سے بچالے۔

ابن سعد بولا، میں دل سے یہ چاہتا ہوں لیکن افسوس اسکی

کوئی سبیل نہیں نکلتی، حر نے پھر کہا "اے اہلِ کوفہ پہلے تم نے امام حسین علیہ السلام کو بلایا، جب وہ آگئے تو تم نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور یہ خیال کرتے رہے کہ ان کی حمایت کریں گے، جب وہ آگئے تو پھر ان کے مخالف ہو گئے اور اب ان کے قتل کے درپے ہو، انہیں ہر طرف سے گھیر لیا ہے اور خدا کی وسیع زمین میں کسی طرف ان کو جانے نہیں دیتے کہ وہ اور ان کے اہل بیتؑ کسی پُرامن مقام پر چلے جائیں۔ اسوقت ان کی حالت بالکل قیدی کی سی ہو رہی ہے کہ وہ اپنی ذات کو نہ کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان سے بچا سکتا ہے۔ تم نے ان پر فرات کا پانی بند کر دیا ہے، جس پانی کو یہودی، نصرانی اور مجوسی سب پیتے ہیں اور دیہات کے سوار اور کتے تک اس میں لوٹتے ہیں، اس کے لیے حضرت امام حسین علیہ السلام اور ان کے اہل و عیالؑ تشنہ لب تڑپتے ہیں۔ تم نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ان کی اولاد کا کیا خوب لحاظ کیا؟ اگر تم توبہ کر کے اپنی روش نہیں چھوڑو گے تو خدا تمہیں قیامت کے دن پیاسا تڑپائے گا۔"

جنگ کا آغاز

حر کی اس تقریر کے بعد ابن سعد علم لے کر آگے بڑھا اور پہلا تیر چلا کر اعلانِ جنگ کر دیا۔ اور دونوں طرف سے آدمی نکل نکل کر دادِ شجاعت دینے لگے۔ شامیوں کی فوج سے یسار و سالم دو شخص نکلے، ادھر سے تنہا عبداللہ بن عمیران کے جواب میں آئے اور ایک ہی وار میں یسار کو ڈھیر کر دیا۔ پاس ہی سالم تھا اس نے جھپٹ کر عبداللہ پر وار کیا، عبداللہ نے اس وار کو ہاتھوں پر روکا۔ انگلیاں اڑ گئیں لیکن انہی کٹی ہوئی انگلیوں سے سالم کو مار کر گرایا۔ عبداللہ کی بیوی بھی ساتھ تھیں، انہوں نے شوہر کو لڑتے دیکھا تو خود بھی ہاتھ میں خیمہ کی ایک چوب لے کر یہ کہتے ہوئے آگے بڑھیں کہ میرے ماں باپ تم پر فدا ہوں۔ آلِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کی طرف سے لڑتے رہو. عبداللہ نے انہیں عورتوں کے خیمہ میں لوٹانا چاہا لیکن انہوں نے انکار کردیا اور کہا کہ میں تمہارا ساتھ نہ چھوڑوں گی، تمہارے ساتھ جان دیدوں گی. حضرت امام حسین علیہ السلام نے ان کی ضد کو دیکھ کر آواز دی کہ خدا تم کو اہلبیتؑ کی جانب سے جزائے خیر دے، تم لوٹ جاؤ" عورتوں پر جہاد فرض نہیں ہے"۔ آپ (ع) کے ارشاد پر وہ لوٹ گئیں۔

اس کے بعد عمر بن حجاج شامی لشکر کے میمنہ کو لے کر حضرت امام حسین علیہ السلام کی طرف بڑھا، جب آپ (ع) کے قریب پہنچا تو فدائیانِ حسینؑ پاؤں ٹیک کر سینہ سپر ہوگئے اور نیزوں کے وار سے شامی سواروں کے گھوڑوں کے منہ پھیر دیئے، پھر شامی جماعت سے ابن جوزہ نامی ایک شخص نکل کر بآواز بلند پکارا" حسین (علیہ السلام) ہیں؟" کسی نے جواب نہ دیا، دوسری مرتبہ پھر اُس نے یہی سوال کیا. تیسری مرتبہ سوال کرنے پر لوگوں نے کہا" ہیں، تمہارا کیا مقصد ہے ؟" اس نے کہا" حُسین (علیہ السلام) تم کو دوزخ کی بشارت ہو" حضرت امام حسین علیہ السلام نے جواب میں فرمایا" تو جھوٹا ہے، میں دوزخ میں نہیں بلکہ رب رحیم شفیع اور مطاع کے حضور میں جاؤں گا. تیرا نام کیا ہے ؟" جواب دیا" ابن جوزہ" فرمایا: "خدایا اس کو آگ میں داخل فرما" اتفاق سے اسی دوران میں ابن جوزہ کا گھوڑا بدک کر ایک نہر میں پھاند پڑا اور ابن جوزہ کا پاؤں رکاب میں اٹک گیا. اسی حالت میں پھر دوسری مرتبہ بدک کر بھاگا اور ابن جوزہ بیٹھ سے گر کر لٹک گیا گھوڑا سرپٹ بھاگا. اور ابن جوزہ پتھروں کی رگڑ سے چور چور ہو کر مر گیا. اس کے بعد شامی فوج سے یزید بن معقل نکلا اور حسینی لشکر سے بریر بن مضیر ان کے مقابل ہوئے. زبانی مباحثہ کے بعد دونوں نے تلواریں نکال لیں. یزید بن معقل نے بریر پر وار کیا. بریر نے وار خالی دیا اور جواب میں ایسی کاری تلوار ماری کہ یزید کے خود

سے ہوتی ہوئی دماغ تک پہنچ گئی اور وہ زمین پر ڈھیر ہوگیا۔ یزید کو تڑپتا دیکھ کر شامی فوج کے ایک سپاہی رضی بن منقذ نے بریر پر حملہ کیا۔ دونوں میں کشتی ہونے لگی۔ بریر اس کو چت کر کے سینہ پر بیٹھ گئے۔ رضی کو چت دیکھ کر کعب بن جابر ازدی شامی نے بریر پر حملہ کیا۔ نیزہ ان کی پیٹھ میں پیوست ہوگیا۔ بریر زخمی ہو کر رضی کے سینے سے اتر آئے۔ ان کے اترتے ہی کعب نے تلوار سے زخمی کر کے گرا دیا۔ اسطرح رضی کی جان بچ گئی۔ بریر کے بعد عمرو بن قرظہ انصاری آگے بڑھے اور حضرت امام حسین علیہ السلام کے سامنے دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہید ہوگئے۔

عمرو بن قرظہ کا بھائی ابن سعد کے ساتھ تھا۔ عمرو کو خاک و خون میں غلطاں دیکھ کر پکارا "کذاب ابن کذاب حسین (علیہ السلام) تو نے میرے بھائی کو گمراہ کیا اور دھوکہ دے کر قتل کرا دیا"۔ آپؑ نے جواب دیا "خدا نے تیرے بھائی کو نہیں بلکہ تجھ کو گمراہ کیا۔ تیرے بھائی کو اس نے ہدایت دی"۔ یہ جواب سن کر وہ بولا "اگر میں تم کو قتل نہ کروں تو خدا مجھے قتل کرے"۔ یہ کہتے ہوئے وہ حضرت امام حسین علیہ السلام کیطرف جھپٹا مگر نافع بن ہلال نے ایسا نیزہ مارا کہ وہ چاروں شانے چت گرا مگر اس کے ساتھیوں نے بڑھ کر بچا لیا۔ ان کے بعد حر بن ہلال نکلے اور حضرت امام حسین علیہ السلام کے سامنے بڑی شجاعت و بہادری سے لڑے۔ یزید بن سفیان ان کے مقابلے کو آیا، حر نے ایک ہی وار میں اس کا کام تمام کر دیا۔

حر کے بعد نافع بن ہلال بڑھے، شامیوں میں سے مزاحم بن حریث ان کے مقابل آیا۔ نافع نے اسے بھی اس کے ساتھیوں کے پاس پہنچا دیا۔

عام جنگ اور مسلم بن عوسجہ کی شہادت

ابھی تک لڑائی کا انداز یہ تھا کہ ایک ایک شخص ایک ایک کے مقابل نکلتا تھا، مگر شامی لشکر سے جو نکلا وہ بچ کر نہ گیا اس لیے عمرو بن حجاج

نے پکارا" لوگو! جن لوگوں سے تم لڑ رہے ہو یہ سب اپنی جان پر کھیلے ہوئے ہیں۔ اس لیے آئندہ کوئی شخص تنہا ان کے مقابلہ میں نہ جائے۔ ان کی تعداد اتنی کم ہے کہ اگر تم لوگ ان کو صرف پتھروں سے مارو تو بھی ان کا کام تمام ہو جائے گا۔ کوفہ والو! اطاعت اور جماعت کی پوری پابندی کرو، اس شخص (حسین علیہ السلام) کے قتل میں کسی شک وشبہ اور تذبذب کو راہ نہ دو، جو دین سے بھاگا ہے اور جس نے امام کی مخالفت کی ہے" عمرو بن سعد کو بھی عمرو بن حجاج کی یہ رائے پسند آئی چنانچہ فرداً فرداً مبازرت سے روک دیا اور عام جنگ کا آغاز ہو گیا اور تھوڑی دیر تک آپس میں کشمکش جاری رہی، اس معرکہ میں مشہور جاں نثار مسلم بن عوسجہ اسدی شہید ہوئے، غبار چھٹا تو لاشہ نظر پڑا، حضرت امام حسین علیہ السلام قریب تشریف لے گئے، کچھ کچھ جان باقی تھی، فرمایا "مسلم تم خدا رحم کرے" فَمِنْهُمْ مَنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا" حضرت امام حسین علیہ السلام کے بعد حبیب ابن مظاہر نے جنت کی بشارت دی اور کہا اگر مجھ کو یہ یقین نہ ہوتا کہ میں عنقریب تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا تو تم سے وصیت کرنے کی درخواست کرتا اور اسے پوری کرتا۔ مسلم میں بقدر رمق جان باقی تھی، حضرت امام حسین علیہ السلام کی طرف اشارہ کرکے کہا صرف ان کے بارے میں وصیت کرتا ہوں کہ ان کے لیے جان دے دینا، یہ وصیت کرکے محبوب آقا (ع) کے سامنے جان دے دی۔ (ابن اثیر ج ۴ ص ۵۸)

بجہ ناز رفتہ باشد ز جہاں نیاز مندے
کہ بوقت جان سپردن بسرش رسیدہ باشی

دوسرا حملہ اور تیروں کی بارش

اس کے بعد کے ریلے میں شمر شامی میسرہ کو حسینی میسرہ پر حملہ آور ہوا۔ اس حملے کے بعد شامی چاروں طرف سے حسینی فوج پر ٹوٹ پڑے،

بڑا زبردست مقابلہ ہوا حسینی فوج کے بہادر عبداللہ الکلبی کئی آدمیوں کو قتل کر کے خود شہید ہوئے، اس معرکہ میں حسینی فوج میں کل ۳۲ آدمی تھے لیکن اس پامردی سے لڑے کہ جدھر رخ کرتے تھے، شامیوں کی صفیں الٹ دیتے تھے اور ان کی سواروں کی صفیں درہم برہم ہو جاتی تھیں، شامی سوار دستہ کے کمانڈر عزرہ بن قیس نے اپنے سواروں کی یہ بے ترتیبی دیکھی تو ابن سعد سے کہلا بھیجا کہ مٹھی بھر آدمیوں نے ہمارے دستہ کا یہ حال کر دیا ہے، اسلیے فوراً کچھ پیدل اور کچھ تیر انداز بھیجو" ابن سعد نے اس کی درخواست پر پانچسو سواروں کا دستہ بھیج دیا۔ اس دستہ نے جاتے ہی حسینی لشکر پر تیروں کی بارش شروع کر دی، اور تھوڑی دیر میں ان کے تمام گھوڑے زخمی ہو کر بیکار ہو گئے۔ پھر بھی ان کے استقلال میں کمی نہ آئی، سب سوار گھوڑوں سے اتر پڑے اور دوپہر تک اس بہادری اور بے جگری سے لڑتے رہے کہ شامیوں کے دانت کھٹے کر دیئے۔

اہل بیت علیہم السلام کے خیموں کا جلایا جانا

شامی جنگ کو جلد ختم کر دینے کے لیے آگے بڑھنا چاہتے تھے لیکن حضرت امام حسین علیہ السلام نے اپنے خیموں کی ترتیب کچھ اسطرح رکھی تھی کہ شامی ایک ہی رخ سے حملہ کر سکتے تھے، اسلیے عمرو بن سعد نے حکم دیا کہ خیمے اکھاڑ دیئے جائیں تاکہ ہر طرف سے حسینی فوج پر حملہ کیا جا سکے، چنانچہ شامی خیمے اکھاڑنے کے لیے آگے بڑھے لیکن اس میں بھی یہ دشواری پیش آئی کہ جب وہ حسینی لشکر خیموں میں گھسنے کا قصد کرتے تھے تو آڑ میں پڑ جاتے تھے اس لیے حسینی سپاہی انہیں مار لیتے تھے، ابن سعد نے اس صورت میں بھی ناکامی دیکھی تو خیموں میں آگ لگوا دی، حضرت امام حسین علیہ السلام نے دیکھا تو فرمایا یہ بھی اچھا ہوا میدان صاف ہو جائے گا، تو یہ لوگ پشت

سے حملہ آور نہ ہوسکیں گے حضرت امام حسین علیہ السلام کا یہ خیال بالکل صحیح نکلا خیموں کے جل جانے سے پشت سے حملہ کا خطرہ جاتا رہا ، شمر اہلبیت علیہم السلام کے خیمہ میں نیزہ مار کر بولا کہ اس کو مع آدمیوں کے جلا دوں گا۔ عورتوں نے سنا تو چلاتی ہوئی خیموں سے باہر نکل آئیں، حضرت امام حسین علیہ السلام نے دیکھا تو شمر کو ڈانٹا کہ "تو میرے اہل بیتؑ کو آگ میں جلانا چاہتا ہے، خدا تجھ کو آتش دوزخ میں جلائے" کچھ اس ڈانٹ کے اثر اور کچھ لوگوں کے عبرت دلانے سے شمر لوٹ آیا، اس کے جاتے ہی زہیر ابن قین نے کوفیوں کو اہل بیتؑ کے خیموں سے ہٹا دیا۔

(تاریخ طبری ج ۷، ص ۳۴۷ - ۳۵۰)

جاں بازوں کی شہادت

پچھلے معرکوں میں شمع امامت کے بہت سے پروانے فدا ہو چکے تھے، اب امام علیہ السلام کے ساتھ صرف چند جاں نثار باقی رہ گئے تھے، ان کے مقابلے میں کوفیوں کا ٹڈی دل تھا، اسلیے ان کے قتل ہونے سے ان میں نمایاں کمی محسوس ہوتی چلی گئی۔ یہ صورت حال دیکھ کر عمرو ابن عبداللہ صاعدی نے امام علیہ السلام سے عرض کیا کہ "میری جان آپؑ پر فدا ہو، اب شامی بہت قریب ہوتے جاتے ہیں اور کوئی دم میں پہنچا چاہتے ہیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ پہلے میں جان دے لوں۔ اس کے بعد آپؑ کو کوئی گزند پہنچے۔ ابھی میں نے نماز نہیں پڑھی ہے۔ نماز پڑھ کر خدا سے ملنا چاہتا ہوں" ان کی درخواست پر حضرت امام حسین علیہ السلام نے فرمایا، ان لوگوں سے کہو کہ تھوڑی دیر کے لیے جنگ ملتوی کر دیں، تاکہ ہم لوگ ظہر کی نماز ادا کرلیں، آپؑ کی زبان سے یہ فرمائش سنکر حصین ابن نمیر شامی بولا تمہاری نماز قبول نہ ہوگی، حبیب ابن مظاہر نے جواب دیا کہ "گدھے آلِ رسولؐ کی نماز قبول نہ ہوگی اور تیری قبول ہوگی"؟ یہ جواب سن کر حصین کو طیش آ گیا اور حبیب پر حملہ کر دیا،

حبیب نے اس کے گھوڑے کے منہ پر ایسا ہاتھ مارا کہ وہ دونوں پاؤں اٹھا کر کھڑا ہو گیا اور حصین اس کی پیٹھ سے نیچے آ گیا لیکن اس کے ساتھیوں نے بڑھ کر بچا لیا۔ اس کے بعد حبیب اور کوفیوں میں مقابلہ ہونے لگا۔ کچھ دیر تک حبیب نہایت کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے لیکن تن تنہا کب تک انبوہ کثیر کے مقابل ٹھہر سکتے تھے، بالآخر لڑتے لڑتے شہید ہو گئے مگر کلمہ صبر کے علاوہ زبان مبارک سے کچھ نہ نکلا۔ حر نے آقاء کو غمگین دیکھا تو رجز پڑھتے ہوئے بڑھے اور مشہور جاں نثار زہیر ابن قین کے ساتھ مل کر بڑی بہادری اور شجاعت کے ساتھ لڑے لیکن یہ بھی کب تک لڑتے۔ آخر میں کوفی پیادوں نے ہر طرف سے حر پر حملہ کر دیا اور یہ پروانہ بھی شمع امامت پر سے فدا ہو گیا۔

(طبری جلد ۷ ص ۳۴۷-۳۵۰)

جاں نثاروں کی آخری جماعت کی فداکاری

اب ظہر کا وقت آخر ہو رہا تھا، لیکن کوفی نماز پڑھنے کے لیے بھی دم نہ لینے دیتے تھے، اسلیے امام علیہ السلام نے صلوٰۃ خوف پڑھی اور نماز کے بعد بھرپور زور کے ساتھ جنگ شروع ہو گئی اور اس گھمسان کا رن پڑا کہ کربلا کی زمین تھرا اٹھی، کوفیوں کا ہجوم بڑھتے بڑھتے حضرت امام حسین علیہ السلام کے پاس پہنچ گیا۔ نیزوں کی بارش پر ٹڈی دل کا گمان ہوتا تھا۔ مشہور جان باز حنفی امام علیہ السلام کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے اور جتنے تیر آئے سب مردانہ وار اپنے سینے پر روکے لیکن ایک انسان کب تک مسلسل تیر باری کا ہدف بن سکتا تھا۔ بالآخر یہ بھی امام علیہ السلام کے سامنے سینہ چھلنی کر کے فدا ہو گئے۔ ان کے بعد زہیر بن قین کی باری آئی یہ داد شجاعت دیتے ہوئے اپنے پیش رووں سے جا ملے۔ ان کے بعد نافع بن ہلال بجلی جنہوں نے تیرہ کوفیوں کو قتل کیا تھا، گرفتار کر کے شہید کیے گئے۔ اب حسینی لشکر کا بڑا حصہ اپنے آقائے نامدار

پر سے فدا ہو چکا تھا، صرف چند جاں نثار باقی رہ گئے تھے جب انہوں نے دیکھا کہ شامی فوجوں کے مقابلے میں زیادہ دیر تک ٹھہرنے کی طاقت باقی نہیں ہے تو طے کر لیا کہ قبل اس کے کہ امام عالیمقام علیہ السلام پر کوئی نازک وقت آئے سب کے سب آپ (ع) پر سے فدا ہو جائیں۔ چنانچہ سب فدائیانِ اہل بیت ایک ایک کر کے پروانہ وار بڑھنے لگے۔ اس جماعت میں سب سے اول عبداللہ اور عبدالرحمٰن بڑھے ان کے بعد دو نوجوان سیف بن حارث اور مالک بن عبد نکلے اسوقت دونوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں جاری تھیں۔ امام علیہ السلام نے پوچھا روتے کیوں ہو؟ عرض کی اپنی جان کے لیے نہیں روتے، رونا اس پر ہے کہ آپ کو چاروں طرف سے اعدا کے نرغے میں محصور دیکھتے ہیں۔ اور کچھ نہیں کر سکتے۔ آپ نے فرمایا: خدا تم دونوں کو متقیوں کی جیسی جزا دے۔ ان دونوں کے بعد حنظلہ بن اسد شبامی نکلے اور کوفیوں کو سمجھایا کہ وہ امام حسین علیہ السلام کے خونِ بے گناہی کا وبال اپنے سر نہ لیں لیکن اب اس قسم کی افہام و تفہیم کا وقت ختم ہو چکا تھا، حضرت امام حسین علیہ السلام نے فرمایا، اب انہیں سمجھانا بیکار ہے، آپ (ع) کے اس ارشاد پر حنظلہ آپ اور آپ کے اہل بیت پر صلوٰۃ وسلام بھیج کر رخصت ہوئے اور لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ ان کے بعد سیف اور مالک دونوں نوجوانوں نے جانیں فدا کیں ان کے بعد عابس بن ابی شبیب اور شوذب بڑھے، شوذب شہید ہوئے، لیکن عابس بہت مشہور بہادر تھے، ان کے مقابلے میں کسی شامی کو آنے کی ہمت نہ پڑتی تھی، اسلیے ہر طرف سے ان پر سنگباری شروع کر دی، عابس نے ان کی یہ بزدلی دیکھی تو اپنی زرہ اور خود اتار کر پھینک دی اور حملہ کر کے بے محابہ دشمن کی صفوں میں گھستے چلے گئے اور انہیں درہم برہم کر دیا لیکن تن تنہا ایک انبوہ کثیر کا مقابلہ آسان نہ تھا، اسلیے شامیوں

نے انہیں بھی گھیر کر شہید کر دیا، اسی طریقہ سے عمرو بن خالد، جبار بن حارث، سعید، مجمع بن عبداللہ سب جاں نثار ایک ایک کر کے فدا ہو گئے اور تنہا سوید بن عمر بن ابی المطاع باقی رہ گئے۔

شہزادہ علی اکبرؑ کی شہادت

جب سارے فدائیانِ اہل بیت (ع) ایک ایک کر کے جام شہادت پی چکے اور خاندان اہل بیت (ع) کے علاوہ اور کوئی جاں نثار باقی نہ رہا تو اہل بیت کرام (ع) کی باری آئی اور سب سے پہلے ریاض امامت کے گل تر خاندان نبوت کے تابندہ اختر حضرت علی اکبر میدانِ کارزار میں آئے اور تلوار چمکاتے ہوئے یہ رجز پڑھتے ہوئے بڑھے،

أَنَا عَلِيُّ بْنُ حُسَيْنِ بْنِ عَلِيٍّ — وَرَبِّ الْبَيْتِ نَحْنُ أَوْلَى بِالنَّبِيِّ

میں حسین ابن علی کا بیٹا علی ہوں — ربِّ کعبہ کی قسم ہم نبی کے قرب کے زیادہ حقدار ہیں

تَاللّٰهِ لَا يَحْكُمُ فِينَا ابْنُ الدَّعِيِّ

خدا کی قسم نامعلوم باپ کا بیٹا ہم پر حکومت نہیں کر سکے گا

آپ رجز پڑھ پڑھ کر حملہ کرتے تھے اور بجلی کی طرح کوند کر نکل جاتے تھے، مرہ بن منقذ تیمی آپ کی یہ برق رفتاری دیکھ کر بولا، اگر علی اکبر میری طرف سے گذریں تو (امام) حسین (علیہ السلام) کو بے لڑکے کا بنا دوں، علی اکبر ابھی کمسن تھے، جنگ و جدل کا تجربہ نہ تھا، مرہ کا طنز سن کر سیدھے اس کی طرف بڑھے، مرہ ایک جہاندیدہ اور آزمودہ کار تھا، جیسے ہی علی اکبر اس کے پاس پہنچے، اس نے تاک کر ایسا نیزہ مارا کہ جسم اطہر میں پیوست ہو گیا۔ نیزہ لگتے ہی شامی ہر طرف سے ٹوٹ پڑے اور اس گلبدن کے ٹکڑے اڑا دیئے، جس نے پھولوں کی سیج پر پرورش پائی تھی۔ (ابن اثیر ج ۴ ص ۳۵۷)

یہ بھی عجب بے کسی کا عالم تھا، تمام اعزہ و اقربا شہید

ہو چکے تھے، ایک طرف جاں نثاروں کی تڑپتی ہوئی لاشیں ہیں، دوسری طرف جواں مرگ بیٹے علی اکبر کا پاش پاش بدن ہے، تیسری طرف زینب خستہ حال پر غش طاری ہے اس بے کسی کے عالم میں کبھی علی اکبر کی لاش کو دیکھتے ہیں اور آسمان کیطرف نگاہیں اٹھاتے ہیں کہ آج تیرے ایک وفادار بندہ نے تیری راہ میں سب سے بڑی نذر پیش کر کے سنت ابراہیمی پوری کی ہے، تو اسے قبول فرما۔ لیکن اسوقت بھی زبان پر صبر و شکر کے علاوہ حرف شکایت نہیں آتا کہ ؎

من ازیں درد گراں مایہ چہ لذت یابم
کہ بہ اندازہ آں صبر ثباتم دادند

خاندان بنو ہاشم کے نونہالوں کی شہادت

حضرت علی اکبر کی شہادت کے بعد مسلم بن عقیل کے صاحبزادے عبداللہ میدانِ جہاد میں آئے ان کے نکلتے ہی عمرو بن صبیح صیداوی نے تاک کر ایسا تیر مارا کہ یہ تیر تیرِ قضا بن گیا، ان کے بعد جعفر طیار کے پوتے عدی نکلے انہوں نے عمرو بن نہشل کے ہاتھوں جام شہادت پیا۔ پھر عقیل کے صاحبزادے عبدالرحمٰن میدان میں آئے ان کو عبداللہ ابن عروہ نے تیر کا نشانہ بنایا، بھائی کو نیم بسمل دیکھ کر محمد بن عقیل بے تحاشہ نکل پڑے لیکن لقیط بن ناشر نے ایک ہی تیر میں ان کا بھی کام تمام کر دیا۔ ان کے بعد حضرت امام حسین علیہ السلام کے صاحبزادے حضرت قاسم میدانِ جنگ میں آئے، یہ بھی عمرو بن مقبل کے ہاتھوں شہید ہوئے، قاسم کے بعد ان کے دوسرے بھائی ابوبکر نے عبداللہ بن عقبہ کے ہاتھوں جام شہادت پیا۔

امام علیہ السلام کے جاں نثار بھائی حضرت عباسؑ نے جب دیکھا کہ جو نکلتا ہے وہ سیدھا حوضِ کوثر پر پہنچتا

ہے اور عنقریب برادرِ بزرگ تنہا ہونے والے ہیں، تو بھائیوں سے کہا کہ آقا کے سامنے سینہ سپر ہو جاؤ ان پر اپنی جانیں فدا کر دو۔ اس آواز پر تینوں بھائی، عبداللہ بن علیؑ، جعفر بن علیؑ، عثمان بن علیؑ، حضرت امام حسین علیہ السلام کے سامنے دیوارِ آہن بن کر جم گئے اور تیروں کی بارش کو اپنے سینوں پر روکنے لگے۔ اور زخموں سے خون کا فوارہ چھوٹنے لگا تھا، لیکن ان کی جبینِ شجاعت پر شکن تک نہ آئی تھی آخر میں ہانی بن ثوب نے عبداللہ و جعفر کو شہید کر کے اس آہنی دیوار کو بھی توڑ دیا، تیسرے بھائی عثمان بن علیؑ کو یزید اصبحی نے تیر کا نشانہ بنایا، تینوں بھائیوں کے بعد اب صرف تنہا عباس ابن علیؑ باقی رہ گئے تھے۔ اب حضرت عباس علیہ السلام نے نہر پر اپنے شانے کٹا کے اپنی قربانی بھی پیش کر دی۔ حضرت عباس علیہ السلام کے بعد اہل بیتؑ میں امام ہمام علیہ السلام اور عابد بیمار کے علاوہ کوئی باقی نہ رہ گیا تھا۔

اللہ اللہ یہ بھی نیرنگئ دہر اور انقلاب زمانہ کا کیا منظر ہے کہ جس کے نانا کے گھر کی پاسبانی ملائکہ کرتے تھے، آج اسی کا نواسہ بے برگ و نوا، بے یار و مددگار کربلا کے دشتِ غربت میں کھڑا ہے اور روئے زمین پر خدا کے علاوہ اس کا کوئی حامی و مددگار نہیں، غزوہ بدر میں جس کے نانا کی حفاظت کے لیے آسمان سے فرشتے اُترے تھے، آج اس کے نواسہ کو ایک انسان بھی محافظ نہیں ملتا۔

ایک وقت تھا کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دس ہزار قدسیوں کے ساتھ مکہ میں فاتحانہ داخل ہو گئے، دشمنان اسلام کی ساری قوتیں پاش پاش ہو چکی تھیں، رحمت دو عالمؐ کے دامن عفو و کرم کے علاوہ ان کے لیے کوئی جائے پناہ باقی نہ رہی تھی، اسلام اور مسلمانوں کا سب سے بڑے دشمن ابوسفیان کو

جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں کے ساتھ بغض و عداوت اور دشمنی وکینہ توزی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا، بے بس و لاچار دربار رسالت میں حاضر کیا گیا تھا، ایک طرف ان کے جرائم کی طویل فہرست تھی، دوسری طرف رحمۃ للعالمین (ص) کی شان رحمت وکرم تاریخ کو معلوم ہے کہ سرکار رسالتؐ نے اس سنگین اور اشتہاری مجرم کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا، قتل کی دفعہ عائد نہیں کی گئی، جلاوطنی کی سزا تجویز نہیں ہوئی، قیدخانہ کی چار دیواری میں بند نہیں کیا گیا بلکہ "من دخل دار ابی سفیان فھو آمن" جو شخص ابوسفیان کے گھر میں چلا جائے، اس کا جان و مال محفوظ ہے" کے اعلان کرم سے نہ صرف تنہا ابوسفیان کی جان بخشی فرمائی گئی بلکہ اس کے گھر کو جس میں بارہا مسلمانوں کے خلاف سازشیں ہوچکی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کے مشورے ہوچکے تھے دارالامان بناکر وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ کی عملی تفسیر فرمائی گئی۔

ایک طرف یہ رحمت، یہ عفو وکرم اور یہ درگذر، دوسری طرف ٹھیک باون برس کے بعد زمانہ کا رخ بدلتا ہے اور ایک دوسرا منظر پیش کرتا ہے، ایک طرف اس ہی ابوسفیان کے پوتے (یزید بن معاویہ) کی طاغوتی طاقتیں ہیں اور دوسری طرف رحمۃ اللعالمین (ص) کی ستم رسیدہ اولاد[ع] ہے، نبوت کا سارا کنبہ ابوسفیان کی ذریت کے ہاتھوں تہ تیغ ہوچکا ہے۔ کربلا کا میدان اہل بیت (علیہم السلام) کے خون سے لالہ زار بنا ہوا ہے۔ جگر گوشۂ رسولؐ کی آنکھوں کے سامنے گھر بھر کی لاشیں تڑپ رہی ہیں، اعزہ کے قتل پر آنکھیں خوں بار ہیں، بھائیوں کی شہادت پر سینہ وقف ماتم ہے، جواں مرگ لڑکوں اور بھتیجوں کی موت پر دل فگار ہے، لیکن اس حالت میں بھی وحوش وطیور تک

کے لیے امان ہے لیکن جگر گوشۂ رسولؐ کے لیے امان نہیں، آج وہ تلواریں جو فتح مکہ میں مفتوحانہ ٹوٹ چکی تھیں، دشت کربلا میں نوجوانانِ اہل بیتؑ کا خون پی کر بھی سیر نہیں ہوئیں۔ اور امام حسین علیہ السلام کے خون کی پیاس میں زبانیں چاٹتی ہیں۔ لیکن پیکرِ صبر و قرار امام حسین علیہ السلام اس حالت میں بھی راضی برضا ہیں اور اس بے بسی میں بھی جادہ مستقیم سے پاؤں نہیں ڈگمگاتے۔

آپ نے سنا ہوگا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شروع شروع میں اسلام کی دعوت شروع کی تو کفار مکہ آپؐ کے چچا ابو طالب کے پاس آئے جو آپ (ص) کے کفیل تھے اور کہا، تمہارا بھتیجا ہمارے معبودوں کی توہین کرتا ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد کو گمراہ کہتا ہے، ہم کو احمق ٹھہراتا ہے۔ اس لیے یا تم بیچ سے ہٹ جاؤ یا تم ہی میدان میں آؤ کہ ہم دونوں میں سے ایک کا فیصلہ ہو جائے۔

جب ابو طالب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس واقعہ کی خبر دی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظاہری پشت پناہ جو کچھ تھے، ابو طالب تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آبدیدہ ہو کر فرمایا: خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں آفتاب اور دوسرے ہاتھ میں ماہتاب لاکر رکھ دیں تب بھی میں اپنے فرض سے باز نہ آؤں گا۔ یا خدا اس کام کو پورا کرے گا، یا میں خود اس پر نثار ہو جاؤں گا۔ (ابن ہشام ج ۱ ص ۱۳۹)

اس جواب کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پھر بدستور دعوت اسلام میں مصروف ہو گئے اور قریش نے اس کے جواب میں آپؐ کو سخت سے سخت اذیتیں پہنچانا شروع کیں۔ لیکن اس راہ کے کانٹے آپ کے لیے پھول تھے، اس لیے یہ تکلیفیں بھی آپؐ کو دعوتِ اسلام سے نہ روک سکیں، قریش نے اپنی محدود نظر کے مطابق قیاس کیا تھا کہ محمدؐ (مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

کو نام و نمود اور جاہ و حشم کی خواہش ہے، چنانچہ ان کا ایک نمائندہ عتبہ بن ربیعہ ان کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور کہا محمد (مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کیا چاہتے ہو، کیا مکہ کی ریاست؟ کیا کسی بڑے گھرانے میں شادی؟ کیا دولت کا ذخیرہ؟ ہم یہ سب کچھ تمہارے لیے مہیا کر سکتے ہیں اور اس پر بھی راضی ہیں کہ مکہ تمہارے زیر فرمان ہو جائے لیکن تم ان باتوں سے باز آجاؤ لیکن ان سب ترغیبات کے جواب میں آپ (ص) نے یہ آیت تلاوت فرمائی :

قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ؕ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۚ (سورۂ حٰم السجدہ آیت ۹)

اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لوگوں سے کہہ دو کہ تم لوگ خدا کا انکار کرتے ہو جس نے دو دن میں زمین پیدا کی، اور اسکا مقابل ٹھہراتے ہو، یہ خدا سارے جہان کا پروردگار ہے

(بعض روایتوں میں اوپر کی آیات ہیں اور بعض میں حٰم کی ابتدائی آیات ہیں)

آج باون برس بعد حضرت امام حسین علیہ السلام پھر اسی اسوۂ نبی ص کو زندہ کرتے ہیں اور امت مسلمہ کو حق و صداقت عزم و استقلال اور ایثار و قربانی کا سبق دیتے ہیں اور نا انصاف، حدود اللہ اور سنت رسول ص کو پامال کرنے والی خلق خدا کو ظالمانہ حکومت کا نشانہ بنانے والی اور محرمات الٰہی کو رسوا کرنے والی حکومت کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔ اور اعلان فرماتے ہیں کہ:

"لوگو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس نے ظالم، محرماتِ الٰہی کو حلال کرنے والے، خدا کے عہد کو توڑنے والے، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کرنے والے خدا کے بندوں پر گناہ و زیادتی کے ساتھ حکومت کرنے والے بادشاہ کو دیکھا، اور قولاً و عملاً اس کو بدلنے کی کوشش نہ کی تو خدا کو حق ہے کہ اس شخص کو اس ظالم

بادشاہ کی جگہ دوزخ میں داخل کردے، آگاہ ہوجاؤ ان لوگوں نے شیطان کی حکومت قبول کی ہے اور رحمٰن کی اطاعت چھوڑدی ہے۔ ملک میں فساد پھیلایا ہے، حدود اللہ کو بیکار کردیا ہے، مالِ غنیمت میں اپنا حصہ زیادہ لیتے ہیں۔ خدا کی حلال کی ہوئی چیزوں کو حرام کردیا ہے، اسلیے مجھے اس کے بدلنے کا حق ہے۔" (ابن اثیر ج ۴ ص ۴۰)

آج بھی حق و صداقت کی اس آواز کو خاموش کرنے کے لیے یہ ترغیب دلائی جاتی ہے کہ حسین (علیہ السلام) تم اپنے ابن عم (یزید) کی اطاعت قبول کرلو، جو کچھ تم چاہتے ہو اس کو وہ پورا کریں گے اور ان کی جانب سے تمہارے ساتھ کوئی ناروا سلوک نہ ہوگا، لیکن حضرت امام حسین علیہ السلام جواب دیتے ہیں کہ خدا کی قسم میں ذلیل آدمی کیطرح ان کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر غلام کیطرح اقرار نہ کروں گا، یہ جواب دیکر یہ آیت تلاوت فرماتے ہیں "انی عزت بربی و ربکم ان ترجمون اعوذ بربی و ربکم من کل متکبر لا یومن بیوم الحساب" میں نے اپنے اور تمہارے رب سے پناہ مانگی ہے کہ تم مجھے سنگسار کرو، میں اپنے اور تمہارے رب سے ہر مغرور و متکبر سے جو یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتا، پناہ مانگتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد: إِنِّي تَارِكٌ فِيكُمُ الثَّقَلَيْنِ كِتَابَ اللهِ وَعِتْرَتِي أَهْلَ بَيْتِي" کا یہ ہی مقصد تھا۔

آفتاب امامت کی شہادت

اوپر معلوم ہوچکا ہے کہ تمام نوجوانانِ اہلبیت (ع) شہید ہوچکے ہیں اور اس خانوادہ نبوت (ع) میں سوائے عابد بیمار علیہ السلام اور امام خستہ تن علیہ السلام کے کوئی باقی نہیں رہا ہے، لیکن سنگدل شامی اس نوبت کے بعد بھی امام ہمام علیہ السلام کی طرف بڑھے، ابن زیاد کے حکم کے

مطابق ساتویں تاریخ سے حسینی لشکر پر پانی بند کردیا گیا تھا، اہلِ بیتؑ کے خیموں میں جو پانی تھا وہ ختم ہوچکا تھا اور امام علیہ السلام کے لب خشک تھے. حلق سوکھ چکا تھا، اعزہ کے قتل سے دل فگار تھا، جی چھوٹ چکا تھا. اسلیے کوفیوں کے لیے آپؑ کا کام تمام کردینا آسان تھا، لیکن وہ لاکھ سنگدل اور جفاکش سہی، پھر بھی مسلمان تھے، اسلیے جگر گوشۂ رسولؐ کے خون کا بارِ عظیم اپنے سر نہ لینا چاہتے تھے. ہمت کر کے بڑھتے تھے (تاریخ طبری ج ۷ ص ۳۶۴۔ ۳۶۵) لیکن جرأت نہ پڑتی تھی، ضمیر ملامت کرتا تھا اور پلٹ جاتے تھے (مستدرک حاکم)

حضرت امام حسین علیہ السلام کی پیاس لحہ بہ لحہ زیادہ بڑھتی جاتی تھی آخر میں آپؑ نے راہوار کو فرات کی طرف موڑا کہ ذرا حلق کو نم کر کے کانٹے دور کریں لیکن کوفیوں نے نہ جانے دیا، یہ وہی تشنہ لب ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چند آدمیوں کے ساتھ کہیں تشریف لے جارہے تھے کہ امام حسین علیہ السلام کے رونے کی آواز کانوں میں آئی، جلدی سے گھر میں گئے اور پوچھا میرے بیٹے کیوں رو رہے ہیں؟ حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا نے کہا پیاسے ہیں، اتفاق سے اسوقت پانی نہ تھا، لوگوں سے پوچھا لیکن کسی کے پاس پانی نہ نکلا تو آپؐ نے یکے بعد دیگرے دونوں کو اپنی زبان مبارک چُسا کر اُن کی تشنگی دور کی۔ (مستدرک حاکم د فضائل الحسین علیہ السلام)

یہ اسی رحمتِ عالمؐ کا تشنہ لب نواسہؑ ہے کہ جب مکہ میں خشک سالی ہوئی تھی، فصلیں تباہ ہونے لگتی تھیں، سبزہ سوکھ جاتا تھا اور خلق اللہ بھوکوں مرنے لگتی تھی تو رسول اللہؐ اور اسلام کا سب سے بڑا دشمن ابو سفیان آتا تھا اور کہتا تھا "محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تم صلہ رحمی کی تعلیم دیتے ہو، تمہاری قوم خشک سالی سے ہلاک ہوئی جارہی ہے. خدا سے پانی کی دعا کرو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے سب سے بڑے دشمن کی درخواست پر پانی

کے لیے دعا کرتے، دفعتًا ابر اُٹھتا تھا اور سات دن تک اس شدت سے بارش ہوتی تھی کہ جل تھل ہو جاتا تھا۔ (بخاری ج ۱ ص ۱۳۶۔ ابواب الاستقصار)

ٹھیک باون برس کے بعد اس رحمت عالم (ص) اور دوست و دشمن کے سیراب کرنے والے (ص) کا نواسہ (ع) ایک قطرہ پانی کے لیے ترستا ہے اور اسی ابوسفیان کی ذریت کے حکم سے پانی کی ایک بوند اس خشک حلق تک نہیں پہنچنے پاتی ہے آہ! صاحبِ انا اعطینٰک الکوثر کا نواسہ یوں تشنہ کام ہے ہ

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

امام علیہ السلام نے شامیوں سے زبردست جنگ کی اور انہیں کئی مرتبہ ایسی پسپائی پر مجبور کیا کہ ان کی آخری صفیں دیوارِ کوفہ سے ٹکرا گئیں۔ آخر کار ابنِ سعد کے حکم پر شامیوں نے تلواریں پھینک دیں اور ہر طرف سے تیر اور پتھر برسانا شروع کر دیئے۔ جس قدر امام علیہ السلام نڈھال ہوتے جاتے تھے، شامیوں کی جسارت زیادہ بڑھتی جاتی تھی۔ چنانچہ جب انہوں نے دیکھا کہ امام علیہ السلام میں تابِ مقاومت باقی نہیں ہے تو اہل بیت ؑ کے خیموں کی طرف بڑھے اور حضرت امام حسین علیہ السلام کو اس طرف جانے سے روک دیا، آپ نے فرمایا کہ تمہارا کوئی دین و ایمان ہے، تمہارے دلوں سے قیامت کا خوف بالکل ہی جاتا رہا؟ ان سرکشوں اور جاہلوں کو میرے اہل بیت ؑ کی جانب سے روکو، لیکن امام مظلوم علیہ السلام کی فریاد کوئی نہ سنتا تھا بلکہ آپ کی فریاد پر ان کی شقاوت اور بڑھتی جاتی تھی، اور شمر لوگوں کو برابر اُبھار رہا تھا، اس کے ابھارنے پر یہ شوریدہ بخت ہر طرف سے ٹوٹنے لگے، لیکن شمشیر حسینی ان بادلوں کو ہوا کی طرح اڑا دیتی تھی مگر ایک خستہ دل وخستہ جگر اور زخموں سے چور ہستی میں سکت ہی کیا باقی تھی، یہ بھی امام حسین علیہ السلام ہی کا دل تھا کہ اب تک دشمنوں کے ایسے بے پناہ ریلے کو روکے ہوئے تھے، لیکن بالآخر وہ

وقت آگیا کہ ماہ امامت کو شامیوں نے نرغہ کے تاریک بادلوں میں گھیر لیا۔

میدان کربلا میں قیامت بپا تھی، ہر طرف تلواروں کی چمک سے بجلی تڑپ رہی تھی کہ دفعتاً مالک بن بشر کندی نے دوشِ نبوی کے شہسوار پر ایسا وار کیا کہ تلوار کلاہ مبارک کو کاٹتی ہوئی کاسہ سر تک پہنچ گئی، خون کا فوارہ پھوٹ نکلا سارا بدن خون کے چھینٹوں سے لالہ احمر ہو گیا، پیراہن مبارک کی رنگینی پکار اٹھی ؛

حلہ ہا سوختہ اند اہل بہشت از غیرت
تا شہیداں تو گلگوں کفنے ساختہ اند

لیکن اسوقت بھی امام علیہ السلام کے صبر و سکون میں فرق نہ آیا۔ اس جنگ کے دوران امام علیہ السلام نے ایک مرتبہ اپنے جاں نثاروں کو یاد فرماتے ہوئے مدد طلب کی۔ اس استغاثہ کی آواز کے ساتھ ہی خیموں سے مخدرات عصمت و طہارت کے نالہ و شیون کی آواز شروع ہو گئی۔ امام علیہ السلام خیموں کی طرف پلٹے اور واقعہ پوچھا جس کے نتیجہ میں آپؑ شیر خوار فرزند حضرت علی اصغر علیہ السلام کو قربانی کے لیے میدان میں لائے۔ اس جواں ہمت شیر خوار نے مسکرا کر حرملہ کے تیر کو اپنی ننھی منی گردن پر سنبھال لیا اور امام حسین علیہ السلام نے اپنی اس عظیم الشان قربانی پر خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے ان کا خون اپنے چہرہ پر مل لیا اور انتہائی غم و اندوہ کے عالم میں اپنی تلوار سے قبر کھود کر اس امانت کو سپرد خاک فرما دیا۔

پھر امام حسین علیہ السلام نے دوبارہ جنگ شروع کی۔ آپؑ حملہ کرتے جاتے تھے، اور فرماتے جاتے تھے ؛

"آج تم لوگ میرے قتل کے لیے جمع ہوئے ہو، خدا کی قسم میرے بعد کسی ایسے شخص کو قتل نہ کرو گے، جس کا قتل میرے قتل سے زیادہ خدا کی ناراضی کا موجب ہو گا۔ خدا تم کو ذلیل کر کے مجھے اعزاز بخشے گا۔ اور تم سے اسطرح

بدلہ لے گا کہ تمہیں خبر تک نہ ہوگی، خدا کی قسم اگر تم نے مجھے قتل کر دیا تو
خدا تم پر سخت عذاب نازل فرمائے گا۔ اور تم میں باہم خونریزی کرائے گا اور
جب تک تم پر دونا عذاب نازل نہ کرلے گا اسوقت تک راضی نہ ہوگا۔"

(تاریخ طبری ج ۷ ص ۶۷)

حضرت امام حسین علیہ السلام کی حالت لحظہ لحظہ غیر ہوتی جاتی تھی، زخموں
سے سارا بدن چور ہو چکا تھا لیکن کسی کو شہید کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی اور سب
اس جبلِ مصیبت کو ایک دوسرے پر ٹال رہے تھے، شمر یہ تذبذب دیکھ کر پکارا،
تمہارا برا ہو، تمہاری مائیں لڑکوں کو روئیں، دیکھتے کیا ہو؟ بڑھ کر حسین (علیہ السلام)
کو قتل کر دو، اس للکار پر شامی چاروں طرف سے امام ہمام علیہ السلام پر ٹوٹ پڑے
ایک شخص نے تیر مارا، تیر گردن میں آکر بیٹھ گیا، امام علیہ السلام نے اسے
ہاتھوں سے نکال کر الگ کیا۔ (اخبار الطوال ص ۲۶۹)

ابھی آپ (ع) نے تیر نکالا ہی تھا کہ زرعہ بن شریک تمیمی نے بائیں ہاتھ پر
تلوار ماری پھر گردن پر وار کیا، ان پیہم زخموں نے امام علیہ السلام کو بالکل نڈھال
کر دیا، اعضا جواب دے گئے اور کھڑے ہونے کی طاقت باقی نہ رہی، آپ (ع)
اُٹھتے تھے اور سکت نہ پاکر گر پڑتے تھے عین اسی حالت میں سنان بن انس
نے کھینچ کر ایسا کاری نیزہ مارا کہ فلکِ امامت زمیں بوس ہوگیا۔ سنگدل اور شقی
ازلی خولی بن یزید سر کاٹنے کے لیے بڑھا۔ لیکن ہاتھ کانپ گئے، تھرا کر
پیچھے ہٹ گیا اور سنان بن انس نے اس سر کو جو بوسہ گاہ سرورِ کائنات (ص)
تھا، جسمِ اطہر سے جدا کر دیا۔ (تاریخ طبری و اخبار الطوال)

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ (البقرۃ آیت ۱۵۶)

وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ (الشعراء (۲۶) آیت ۲۲۷)

یوں ۱۰ محرم ۶۱ھ مطابق ۶۸۱ء میں خانوادۂ

جنوی کا آفتابِ ہدایت ہمیشہ کے لیے روپوش ہوگیا، اس شقاوت اور سنگدلی پر زمین کانپ اُٹھی، عرشِ الٰہی تھرّا گیا، ہوا خاموش ہوگئی، پانی کی روانی رُک گئی، آسمان خون رویا، زمین سے خون کے چشمے پھوٹے، شجر و حجر سے نالہ و شیون کی صدائیں بلند ہوئیں، جن و انس نے سینہ کوبی کی، ملائکہ آسمانی میں صفِ ماتم بچھی کہ آج ریاضِ نبوی کا گلِ سرسبز مرجھا گیا، علی علیہ السلام کا چمن اُجڑ گیا، حضرت فاطمہ علیہا السلام کا گھر بے چراغ ہوگیا۔

چوں خوں زحلق تشنۂ او بر زمین رسید — جوش از زمیں بہ ذرۂ عرشِ بریں رسید
نخل بلند او چو حناں بر زمیں زدند — طوفاں بآسماں زغبار زمین رسید
باد آن غبار چوں بمزار نبی رساند — گرد از مدینہ بر فلک ہفتمیں رسید
کرد ایں خیال وہم غلط کار کاں غبار — تا دامن جلال جہاں آفریں رسید

ہست از ملال گرچہ بری ذات ذو الجلال
او در دل است و ہیچ دلی نیست بی ملال

ستم بالائے ستم

امام ہمام علیہ السلام کو شہید کرنے کے بعد بھی سنگدل اور خونی شامیوں کا جذبۂ عناد فرو نہ ہوا، اور شہادت کے بعد وحشی شامیوں نے اس جسدِ اطہر کو جسے رسولؐ نے اپنے جسدِ مبارک کا ٹکڑا فرمایا تھا، گھوڑوں کی ٹاپوں سے پامال کیا، اس بہیمانہ شقاوت کے بعد لٹیرے پردہ نشینانِ عصمت کے خیموں کیطرف بڑھے اور اہل بیتؑ کا کل سامان لوٹ لیا۔

شہدائے کربلا کی تعداد اور ان کی تجہیز و تکفین

حضرت امام حسین علیہ السلام کے ساتھ بہتر آدمی شہید ہوئے ان میں بیس آدمی بنی ہاشم کے چشم و چراغ تھے

بقیہ کا تعلق دوسرے قبائل سے تھا ان کے اسمائے گرامی مندرجہ ذیل ہیں:

حسینؑ[1] بن علیؑ، عباسؑ[2] بن علیؑ، جعفرؑ[3] بن علیؑ، عبداللہؑ[4] بن علیؑ عثمانؑ[5] بن علیؑ، محمدؑ[6] بن علیؑ، ابوبکرؑ[7] بن علیؑ، علیؑ[8] بن حسین بن علیؑ (علی اکبر)، عبداللہؑ[9] بن حسینؑ، ابوبکرؑ[10] بن حسنؑ، عبداللہؑ[11] بن حسنؑ، قاسمؑ[12] بن حسنؑ، عونؑ[13] بن عبداللہ بن جعفر طیار، محمدؑ[14] بن عبداللہ بن جعفر طیار (صاحبزادگان بی بی زینب علیا) جعفرؑ[15] بن عقیل بن ابی طالب، عبدالرحمنؑ[16] بن عقیل، مسلمؑ[17] بن عقیل عبداللہؑ[18] بن مسلم بن عقیل، عبداللہؑ[19] بن عقیل، محمدؑ[20] بن ابوسعید بن عقیل۔

دوسرے شہداء کے نام

۱۔ عبداللہ ابن عمیر کلبی، قبیلہ ہمدان سے تعلق تھا، کتاب الرجال میں ان کا اصحاب حضرت علی علیہ السلام میں تذکرہ کیا گیا ہے وہ نہایت بہادر تھے۔

۲۔ حر بن یزید ریاحی، ان کی ذات محتاجِ تعارف نہیں، شجاع ہونے کے ساتھ صاحب بصیرت تھے۔ یہ کوفہ کے رؤساء میں سے تھے۔

۳۔ مسلم بن عوسجہ۔ ممتاز معزز اشراف عرب میں سے تھے، سردار قوم، عابد اور تہجد گذار تھے، میدانِ کربلا میں وہ سن رسیدہ اور ضعیف العمر ہو چکے تھے ان کا تعلق بنی اسد سے تھا۔

۴۔ بریر بن خضیر ہمدانی۔ سن رسیدہ تابعی، عبادت گذار اور حافظ قرآن، حضرت علی علیہ السلام کے اصحاب میں سے، کوفہ کے باشندے تھے، قبیلہ ہمدان کے اشراف سے تعلق رکھتے تھے۔

۵۔ منجح بن سہم، جماعت حسینی میں آزاد افراد کے ساتھ ساتھ غلاموں کی نمائندگی کا حق بھی تھا۔ سب سے پہلے سلسلۂ شہداء میں جن کا نام آتا ہے وہ یہی بزرگ ہیں۔

۶- عمر بن خالد : کوفہ کے اشراف میں سے اور اہل بیت علیہم السلام کے سچے محب تھے

۷- سعد مولی عمر بن خالد:- شریف النفس اور بلند ہمت غلام تھے اور جنگ میں بھی وہ اپنے ہمراہیوں کے جتھے میں شہید ہوئے۔

۸- مجمع بن عبداللہ، وہ تابعین میں سے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں متولد ہوئے تھے، بڑا مرتبہ حاصل کیا، حضرت علی علیہ السلام کے اصحاب میں داخل تھے، انہوں نے حضرت علی علیہ السلام کے ہمراہ جنگِ حنین میں بھی شرکت کی۔

۹- عائذ بن مجمع :- مجمع بن عبداللہ عائذی کے فرزند تھے۔ جنگ میں شرکت کی اور شہید ہوئے۔

۱۰- جنادہ بن حارث سلمانی۔ قبیلہ مذحج سے تعلق تھا، شیخ طوسیؒ نے کتاب الرجال میں ان کا نام اصحابِ امام حسین علیہ السلام میں درج کیا ہے اور بعض روایات کے مطابق انہوں نے حضرت علی علیہ السلام کے دورِ خلافت میں جنگِ صفین میں بھی شرکت کی۔

۱۱- جندب بن حجر کندی خولانی، کوفہ کے نہایت معزز افراد میں سے تھے، حضرت علی علیہ السلام کی صحبت سے شرفیاب ہوئے اور جنگِ صفین میں کندہ اور ازد کے رسالوں کے افسر تھے۔

۱۲- یزید بن زیاد بن مہاصر ابو الشعثا، کندی، بہدلی : ان کا تعلق قبیلہ کندہ سے تھا اور امرائے کوفہ میں شمار ہوتے تھے، شریف، بہادر اور جنگ آزما تھے۔

۱۳- ادہم بن امیہ عبدی بصری : قبیلہ عبد قیس سے بصرہ کے باشندے تھے، بڑی مشکل سے کوفہ کی ناکہ بندی کے

باوجود کربلا پہنچے اور حضرت امام حسین علیہ السلام کی معیت میں شہادت کا رتبہ پایا۔

۱۴۔ امیہ بن زید طائی۔ قبیلہ طے کے بہادر جنگ آزما اور شہسوار تھے، حضرت علی علیہ السلام کے اصحاب میں شمار ہوتا تھا، آپ ؑ کے ساتھ جنگ صفین میں شرکت بھی کی تھی۔

۱۵۔ جابر بن حجاج تیمی، قبیلہ تیم اللہ بن ثعلبہ میں سے، عامر بن نہشل کے آزاد کردہ غلام تھے، کوفہ کے باشندہ اور شہسوار تھے۔

۱۶۔ جبلتہ بن علی شیبانی۔ کوفہ کے باشندہ، بہادر اور شجاع تھے، جنگ صفین میں حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ جہاد میں شریک ہوئے۔

۱۷۔ جنادہ بن کعب بن حارث انصاری خزرجی۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کے ساتھ آئے تھے اور حملہ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

۱۸۔ جوین بن مالک قیس بن ثعلبہ تمیمی۔ قبیلہ تیم سے تعلق تھا، ابتداء میں ابن سعد کے ساتھ کربلا آئے اور جب ابن سعد نے شرائطِ صلح مسترد کر دیئے تو امام علیہ السلام کے ساتھ ہو گئے اور شہید ہوئے۔

۱۹۔ حرث بن امراء القیس بن عابس کندی۔ شجاعانِ روزگار اور عابد و زاہد تھے۔ شرفائے عرب میں شمار ہوتا ہے۔

۲۰۔ حرث بن بنہان۔ ان کے والد حضرت حمزہ کے غلام، بہادر اور شہسوار تھے ان کی پرورش خانۂ علوی میں ہوئی اور روز عاشورہ حملہ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

حباب بن حرث۔ یہ بھی حملہ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

۲۲۔ حباب بن عامر بن کعب تمیمی۔ قبیلہ تیم اللات بن ثعلبہ میں سے کوفہ کے باشندے اور حضرت علی علیہ السلام کے دوست دار تھے، روزِ عاشورہ حملۂ اولیٰ میں جامِ شہادت نوش فرمایا

۲۔ حبشہ بن قیس نہمی۔ حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ ان کے دادا

سلمہ بن ظریف صحابہ میں سے تھے اور روزِ عاشورہ حملہ اولیٰ میں شہید ہوئے

۲۴- حجاج بن زید سعدی تمیمی۔ قبیلہ بنی سعد بن تیم میں سے بصرہ کے باشندہ تھے اور وہاں کے امراء سے تعلق تھا اور روزِ عاشورہ حملہ اولیٰ میں شہید ہوئے

۲۵- حلاس بن عمرو ازدی راسبی ۔ حضرت علی علیہ السلام کے اصحاب میں سے تھے۔ اور حضرتؑ کے زمانہ خلافت میں کوفہ میں پولیس کے افسر کی حیثیت رکھتے تھے۔ آپ بھی میدان کربلا میں عمر سعد کی فوج کے ساتھ آئے تھے مگر گفتگوئے مصالحت کے ناکام ہونے پر مخفی طریقہ سے شب کے وقت حضرت امام حسین علیہ السلام کے اصحاب میں شامل ہو گئے اور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

۲۶- حنظلہ بن عمر شیبانی ۔ یہ بھی روزِ عاشورہ حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

۲۷- زاہر بن عمرو اسلمی کندی ۔ اصحابِ رسولؐ میں سے تھے اور بیعتِ رضوان کے شرف سے بہرہ اندوز ہوئے تھے صلح حدیبیہ کے بعد جنگ خیبر میں شریک ہوئے۔ شجاعت ان کی نمایاں صفت اور نمایاں جوہر تھا اور رسول واہل بیت رسول علیہم الصلوٰۃ السلام سے بیحد محبت تھی، روزِ عاشورہ حملہ اولیٰ میں شہید ہوئے ۔

۲۸- زہیر بن سلیم بن عمرو ازدی ۔ شب عاشورہ جب لشکر یزید نے حضرت امام حسین علیہ السلام کو شہید کرنے کا قطعی فیصلہ کر لیا تو وہ وہاں سے نکل کر امام حسین علیہ السلام کیطرف آ گئے۔ اور آپؑ کی نصرت کرتے ہوئے حملہ اولیٰ میں شہید ہوئے ۔

۳۰- سلیم ۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کے باوفا غلام تھے ۔ کربلا میں نصرت امام حسین علیہ السلام کا حق ادا کرتے ہوئے حملہ اولیٰ میں شہید ہوئے ۔

۳۲- سوار بن ابی عمیر نہمی ، راویان احادیث میں سے تھے ۔

روز عاشورہ حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

۳۳۔ سیف بن مالک عبدی۔ قبیلہ عبد قیس سے بصرہ کے باشندہ اور حضرت علی علیہ السلام کے دوستدار تھے اور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

۳۴۔ شعیب بن عبداللہ۔ حرث بن سریع ہمدانی جابری کے غلام، صحابی رسولؐ اور حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ جنگِ جمل، جنگ صفین اور نہروان، تینوں لڑائیوں میں شرکت کا شرف حاصل کیے ہوئے تھے۔ کوفہ کے باشندہ تھے، روزِ عاشورہ حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

۳۵۔ شبیب بن عبداللہ نہشلی: طبقہ تابعین میں سے حضرت علی علیہ السلام کے اصحاب میں محسوب ہوتے ہیں اور آپ تینوں لڑائیوں میں شریک ہوئے، پھر امام حسن علیہ السلام اور ان کے بعد امام حسین علیہ السلام کے اصحاب اور مخصوصین میں سمجھے جاتے ہیں۔ کربلا میں حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

۳۶۔ ضرغامہ بن مالک تغلبی۔ یہ عمر ابن سعد کی فوج کے ساتھ میدانِ کربلا میں آئے اور پوشیدہ طریقے سے اصحابِ امام حسین علیہ السلام میں شامل ہو گئے یہاں تک کہ حملۂ اولیٰ میں منزلِ شہادت کو پہنچے۔

۳۷۔ عامر بن مسلم عبدی بصری۔ بصرہ کے باشندے اور اصحاب علی ابن ابی طالب علیہ السلام میں سے تھے۔ یہ بھی کربلا میں روزِ عاشورہ حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے

۳۸: عباد بن مہاجر بن ابی المہاجر جہنی۔ ان کا تعلق قبیلہ جہینیہ سے تھا وہ صحرائی عرب تھے اور روزِ عاشورہ حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

۳۹۔ عبدالرحمٰن بن عبدرب انصاری خزرجی، یہ صحابۂ رسولؐ میں حدیث غدیر کے راوی اور شاہد تھے۔ حضرت علی علیہ السلام کے مخصوص شاگرد تھے، حضرتؑ نے خود ان کو قرآن کی تعلیم دی اور ان کی تربیت فرمائی تھی۔ وہ امام حسین علیہ السلام
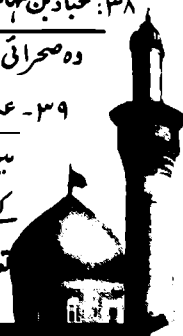
کے ساتھ مکہ روانہ ہوئے اور میدانِ کربلا تک برابر ہمرکاب رہے، صبحِ عاشورہ انہوں نے بھی حملہ اولیٰ میں درجہ شہادت حاصل کیا۔

۴۰۔ عبدالرحمٰن ابن عبداللہ ارحبی :۔ طبقہ تابعین میں معزز، بہادر اور جنگ آزما تھے، کوفہ سے جو دوسرا وفد امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں بھیجا گیا تھا جس کے ساتھ ۵۳ عرضداشتیں امام کی خدمت میں ارسال کی گئی تھیں، جن میں ہر ایک دو، تین اور چار دستخطوں سے تھی، اس وفد میں قیس بن مسہر صداوی اور عمارہ بن عبید سلولی کے ساتھ عبدالرحمٰن بن عبداللہ بھی تھے۔ اس کے بعد امام حسین علیہ السلام نے مسلم بن عقیل کو کوفہ بھیجا تھا اور عبدالرحمٰن کو ان کے ساتھ کر دیا۔ اس کے بعد عبدالرحمٰن بن عبداللہ کسی نہ کسی طرح کوفہ سے نکل کر میدان کربلا میں پہنچے اور حضرت امام حسین علیہ السلام کے اصحاب میں داخل ہو گئے، یہاں تک کہ حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

۴۱۔ عبدالرحمٰن بن مسعود۔ وہ مسعود بن حجاج تیمی کے فرزند تھے، باپ بیٹے دونوں عمر سعد کی فوج کے ساتھ آئے اور محرم کی ساتویں تاریخ حضرت امام علیہ السلام کی خدمت میں سلام کرنے کے مقصد سے حاضر ہوئے پھر واپس نہ گئے عبدالرحمٰن روز عاشورہ حملہ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

۴۲۔ عبداللہ بن بشر خثعمی ۔ یہ خود اور ان کے والد اپنے زمانہ کے مشہور روزگار اور میدان جنگ کے زور آزما شہسواروں میں سے تھے۔ کوفہ کا مشہور احاطہ "جبانۃ بشر" ان ہی کے نام سے منسوب تھا۔ میدان کربلا میں ابن سعد کے ساتھ پہنچ کر خفیہ طریقہ سے اصحاب امام حسین علیہ السلام میں شامل ہو کر شہید ہوئے۔

۴۳۔ عبداللہ ابن یزید بن ثبیط قیسی ۔ یہ اپنے باپ کی ہمراہی میں بصرہ نکلے اور مقام ابطح میں پہنچ کر خدمت امام علیہ السلام میں حاضر ہوئے روزِ عاشورہ حملہ اولی میں شہید ہوئے۔

۴۴۔ عبیداللہ بن یزید بن ثبیط قیسی ۔ وہ یزید بن ثبیط کے دوسرے فرزند تھے۔ جنہوں نے نصرت امام حسین علیہ السلام کے ارادہ میں ان کا ساتھ دیا اور وہ بھی حملہ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

۴۵۔ عقبہ بن صلت جہنی : منازل جہنہ کے اعراب میں سے جو اثنائے راہ میں قافلہ حسینی کے ساتھ ہوگئے ایک وہ بھی تھے اور منزل زبالہ میں امام حسین علیہ السلام کے حقیقت حال کے اظہار پر خطبہ سن کر جب سوائے خاص جاں نثاروں کے اور سب نے اپنی راہ لی تو وہ امام علیہ السلام کے ساتھ رہے یہاں تک کہ روزِ عاشورہ حملہ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

۴۶۔ عمار بن ابی سلامہ دالانی ۔ انہوں نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ کا ادراک کیا تھا اور حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ جنگ جمل، صفین اور نہروان میں شامل رہے۔ کربلا میں امام حسین علیہ السلام کے ساتھ روزِ عاشور حملہ اولی میں شہید ہوئے۔

۴۷۔ عمار بن حسان طائی ۔ شہسوار بہادر اور جنگ آزما تھے ان کے باپ حسان بن شریح حضرت علی علیہ السلام کے اصحاب میں سے تھے اور جنگِ صفین میں آپ ؑ ہی کی نصرت میں شہید ہوئے۔ عمار امام حسین علیہ السلام کے ساتھ مکہ سے آئے اور عاشورہ حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

۴۸۔ عمرو بن ضبیعۃ بن قیس بن ثعلبہ ضبعی تمیمی ۔ یہ نہایت بہادر تھے۔ عمر سعد کی فوج کے ساتھ میدان کربلا میں آئے پھر امام حسین علیہ السلام کے ساتھ ہو گئے اور

حملہ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

۴۹۔ عمران بن کعب بن حرث اشجعی ۔ ان کا شمار حملۂ اولیٰ کے شہدا میں ہے

۵۰۔ قارب مولی الحسین ۔ ان کی والدہ فکیہہ امام حسین علیہ السلام کی حرم سرا میں رباب مادر سکینہ کی کنیز تھیں اور ان کی شادی عبداللہ ابن اریقط کے ساتھ ہوئی اسطرح قارب کی ولادت ہوئی ۔ وہ اپنی ماں کی ہمراہی میں امام علیہ السلام کے ساتھ مدینہ سے مکہ اور پھر وہاں سے کربلا تک پہنچے اور روز عاشورہ حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے ۔

۵۱۔ قاسط بن زھیر بن حرث تغلبی ۔ وہ اور ان کے دو بھائی مقسط اور کردوس حضرت علی علیہ السلام کے اصحاب میں سے تھے اور آپ کے ساتھ لڑائیوں میں شریک ہوئے تھے ۔ پھر امام حسین علیہ السلام کے ساتھ رہے یہاں تک کہ آپ نے حجاز کی طرف مراجعت فرمائی اس کے بعد وہ تینوں کوفہ میں مقیم رہے ۔ یہاں تک کہ جب امام علیہ السلام کربلا میں وارد ہوئے تو وہ تینوں بھائی کسی نہ کسی طرح امام علیہ السلام کی خدمت میں پہنچے اور روزِ عاشورہ حملہ اولیٰ میں شہید ہوئے ۔

۵۲۔ قاسم بن حبیب بن ابی بشر ازدی ۔ کوفہ میں دوست دارانِ حضرت علی علیہ السلام میں سے تھے ۔ بہادر دلیر اور شہسوار تھے ۔ عمر سعد کی فوج کے ساتھ کربلا پہنچے پھر پوشیدہ طریقے سے امام علیہ السلام کے انصار سے ملحق ہو گئے اور روز عاشورہ حملہ اولیٰ میں درجہ شہادت پر فائز ہوئے

۵۳۔ کردوس بن زہیر بن حرث تغلبی ۔ وہ اور ان کے بھائی قاسط بن زہیر اور دوسرے بھائی مقسط اصحابِ حضرت علی علیہ السلام میں سے تھے اور آپ کے ساتھ لڑائیوں میں شریک رہے ۔ کربلا میں خفیہ طریقہ سے

خدمت حسینی میں پہنچے اور درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔

۵۴۔ کنانہ بن عتیق تغلبی ۔ یہ بھی کوفہ کے شجاعانِ روزگار میں سے تھے۔ عابد اور زاہد اور حافظِ قرآن تھے۔ روزِ عاشورہ جنگِ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

۵۵۔ مجمع بن زیاد ابن عمرو جہنی یہ بھی منازل جہنیہ کے اعراب میں سے تھے اور حملۂ اولیٰ میں درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

۵۶۔ مسعود بن حجاج تمیمی : کوفہ کے بڑے مشہور محب علیؑ تھے اور لڑائیوں میں کام کیے ہوئے تھے۔ اپنے فرزند عبدالرحمٰن بن مسعود کے ساتھ عمر سعد کی فوج میں میدان کربلا تک پہنچے اور ساتویں محرم کو امام علیہ السلام کی خدمت میں سلام کرنے حاضر ہوئے تو واپس نہ گئے۔ روزِ عاشورہ حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

۵۷۔ مسلم بن کثیر صیرفی ازدی ۔ قبیلہ ازد میں سے تھے، انہوں نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ادراک کیا تھا۔ جنگِ جمل میں حضرت علی علیہ السلام کی نصرت میں لڑے اور کربلا میں پہنچ کر حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

۵۸۔ مقسط بن زہیر بن حارث تغلبی ۔ وہ اور ان کے دو بھائی قاسط اور کردوس اصحاب حضرت علی علیہ السلام میں سے تھے اور آپؑ کے ساتھ لڑائیوں میں شریک ہوئے تھے وہ سب میدانِ کربلا میں خفیہ طریقے سے امام علیہ السلام کی خدمت میں پہنچے اور حملۂ اولیٰ میں شہادت کا درجہ پایا۔

۵۹۔ منیع بن زیاد ۔ ان کا بھی شمار حملہ اولیٰ کے شہدا میں ہے۔

۶۰۔ نصر بن ابی نیزر ۔ ابو نیزر نجاشی بادشاہ حبشہ یا کسی اور ملک عجم کے بادشاہ کی نسل سے تھے۔ آنحضرتؐ نے ان کی تربیت فرمائی۔ آنحضرتؐ کے وصال کے بعد وہ حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں رہے۔ ان
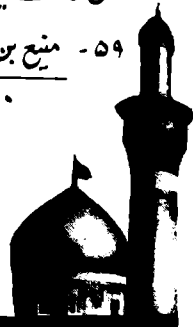
کے فرزند نصر نے اپنی کم سنی اور نوجوانی کا زمانہ حضرت علی علیہ السلام اور امام حسن علیہ السلام کے ساتھ اور بقیہ زندگی کا دور امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں گذارا۔ یہاں تک کہ سفر عراق میں آپؑ کے ساتھ مدینہ سے مکہ اور مکہ سے کربلا پہنچے۔ حملۂ اولیٰ میں پہلے گھوڑا کام آیا اور پھر خود مرتبۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

۶۱۔ نعمان بن عمرو ازدی ۔ کوفہ کے باشندہ اور اصحاب حضرت علی علیہ السلام میں سے تھے۔ آپ (ع) کے ساتھ جنگِ صفین میں شریک بھی ہوئے، وہ اور ان کے بھائی حلاس بن عمرو ازدی کربلا میں عمر سعد کی فوج کے ساتھ پہنچے تھے اور شرائطِ صلح مسترد ہونے پر اصحابِ امامؑ حسین علیہ السلام سے ملحق ہوگئے۔ یہاں تک کہ حملہ اولیٰ میں درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔

۶۲۔ نعیم بن عجلان انصاری ۔ اصحاب حضرت علی علیہ السلام میں سے تھے اور جنگِ صفین میں کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے۔ کسی نہ کسی طرح کربلا پہنچے اور روزِ عاشورہ حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔

جو حضرات اس کے بعد سے دوپہر کے وقت تک نماز ظہر کے ہنگامہ سے سے پہلے شہید ہوئے ان کے نام تاریخ میں حسب ذیل ہیں :۔

۶۳۔ بکر بن حی تیمی : عمر بن سعد کی فوج کے ساتھ کربلا میں آئے تھے مگر جنگ چھڑنے کے بعد توفیقِ الٰہی دستگیر ہوئی اور حضرت امام حسین علیہ السلام کی طرف آکر شریکِ جہاد ہوئے اور حملۂ اولیٰ کے بعد درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

۶۴۔ عمرو بن جنادہ بن کعب خزرجی : ان کے پدرِ عالی وقار جنادہ بن کعب حملۂ اولیٰ میں نصرت کرتے ہوئے شہید ہوچکے تھے لیکن ان کی والدۂ گرامی بحریہ بنت مسعود

نے یہ سعادت بھی حاصل کرنا چاہی کہ اپنے کمسن بچہ عمرو کو بھی راہِ خدا میں فدیہ دیں لہذا اصلاح جنگ سے آراستہ کر کے خدمت امام علیہ السلام میں اجازت جہاد کے لیے بھیجا، حضرت نے بڑی مشکل سے ان کو میدانِ وفا میں جانے کی اجازت دی۔ افواجِ یزید میں سے کسی بے رحم نے اس بچہ کا سر کاٹ کر جماعت حسینی کی طرف پھینک دیا، شیر دل ماں نے بچہ کا سر اٹھا لیا۔ شاباش بیٹا تو نے امام علیہ السلام پر نثار ہو کر میرا دل خوش اور میری آنکھوں کو خنک کیا۔" پھر اس نے سر کو فوجِ دشمن کیطرف پھینک دیا۔ اور خود ایک گرز آہنی لے کر دشمنوں پر حملہ آور ہوئی مگر امام علیہ السلام نے اسے گوارا نہ کیا اور ان کو خیمہ کیطرف واپس کر دیا۔

٦٥۔ حبیب ابن مُظاہر اسدی۔ عرب کے مشہور شہسوار تھے۔ ابن کلبی کی روایت کے مطابق صحابی تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے تھے۔ شیخ طوسیؒ نے انہیں اصحابِ علی علیہ السلام پھر اصحاب امام حسن علیہ السلام اور پھر اصحاب امام حسین علیہ السلام میں درج کیا ہے۔ حبیب ابن مُظاہر میثم تمار اور رشید ہجری کی طرح حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے ان با اختصاص صحابہ میں سے تھے۔ جنہیں آپؑ نے خاص طور سے علوم باطنی اور اسرار کی تعلیم دی تھی۔

کوفہ میں حضرت مسلم بن عقیل کی حمایت کی ہر طرح کی ذمہ داری کا وعدہ انہوں نے کیا تھا اور وہ نہ صرف ہر قیمت پر نصرت امام حسین علیہ السلام کے لیئے صرف خود آمادہ تھے بلکہ دوسروں کو بھی نصرت کی ترغیب دے رہے تھے اور بہ دشواری تمام کربلا میں جماعتِ حسینی میں شامل ہو گئے۔ دشمنوں کی نصیحت اور ہدایت کرنے میں کوئی دقیقہ فراموش نہ کیا، نویں محرم کو جب حضرت امام حسین علیہ السلام نے حضرت عباسؑ کو مقصد

اریافت کرنے کے لیے بھیجا تو ان کے ہمراہیوں میں منجملہ اور حضرات کے حبیب ابن مُظاہر بھی تھے۔ حبیب ابن مُظاہر ان بزرگوں میں سے تھے جن کا نفس ایسا تھا جس کا خدا نے تزکیہ کیا تھا۔ اور ان کو صحیح راستہ پر چلنے کی توفیق عطا کی تھی۔

(طبری جلد ۶ ص ۲۳۷)

شبِ عاشور حبیب بن مُظاہر نے امام حسین علیہ السلام سے اجازت چاہی کہ وہ جاکر قبیلہ بنی اسد سے جو اطراف میں مقیم ہیں آپؑ کی نصرت کی خواہش کریں چنانچہ امام علیہ السلام نے اجازت دے دی، حبیب نے بنی اسد کے مجمع میں جاکر وعظ و نصیحت کے ذریعہ انہیں نصرت امام علیہ السلام کے فریضہ کی طرف توجہ دلائی جس پر عبداللہ بن بشیر نے لبیک کہی اور پھر دوسرے لوگ بھی آمادہ ہو کر حبیب کے ساتھ جماعت حسینی کیطرف چلے مگر اس واقعہ کی خبر عمرو سعد کو ہو گئی اور اس نے پانچ سو سوار سدراہ ہونے کے لیے بھیج دیئے جن کے مقابلے کی یہ جماعت تاب نہ لاسکی اور سب لوگ واپس چلے گئے۔ ناچار حبیب خدمتِ امام علیہ السلام میں تنہا واپس آئے۔

پھر جب امام علیہ السلام نے اپنی مختصر جماعت کو ترتیب دیا تو میسرہ کا سردار حبیب ابن مُظاہر کو قرار دیا (ارشاد ص ۲۴۶) حبیب نے سخت جنگ کی یہاں تک کہ ایک تمیمی پہلوان نے جس کا نام بدیل بن حریم تھا، حبیب پر حملہ کیا، حبیب نے ایک ضربِ شمشیر میں اس کا کام تمام کردیا لیکن اسی کے ساتھ بنی تمیم کے ایک دوسرے شخص نے ان پر نیزہ کا وار کیا جس سے وہ زمین پر آرہے، ابھی وہ اٹھنا چاہتے تھے کہ ان کے شکست خوردہ حریف حصین بن تمیم نے ان کے سر پر تلوار لگائی۔ جس سے وہ بے جان ہو کر گر گئے۔ حبیب کی شہادت کا امام حسین علیہ السلام پر خاص اثر ہوا۔ (طبری جلد ۶ ص ۲۵۲)

حبیب امام حسین علیہ السلام کے بچپنے کے جاں نثاروں میں سے تھے۔

حر کی شہادت حر نے میدانِ جنگ میں زبردست شجاعت کا مظاہرہ کیا اور ایسا جہاد کیا کہ رہتی دنیا تک یاد رہے گا۔ کوفہ کے سواروں کی بہت بڑی تعداد نے مل کر ان کو شہید کیا (طبری ج ۶ ص ۲۵۲) امام علیہ السلام نے اپنے ناصر کی یہ قدر کی کہ جب ان کی لاش میدان سے اٹھا کر لائی گئی اور حضرت (ع) کے سامنے رکھی گئی تو آپ ع خاک و خون حر کے چہرہ سے صاف کرتے جاتے تھے اور فرماتے تھے " تم بے شک حر ہو، تمہارے والدین نے تمہارا نام بہت ٹھیک رکھا تھا۔ تم دنیا میں بھی "حر" ہو اور آخرت میں بھی "حر"۔ مطلب یہ تھا کہ انسان کی حریت اور شرافت کا جوہر اس کے افعال ہی سے نمایاں ہوتا ہے۔ دنیاوی خواہشوں کی قید و بند میں گرفتار اور ہوا و ہوس میں اسیر ہو کر حق و ناحق کے امتیاز کو مٹا دینے والا حریت ضمیر اور شرافت نفس کے جوہر کا مالک نہیں ہو سکتا، یقیناً حر نے تمام دنیاوی توقعات کو ٹھکرا کر حق کے راستہ پر قدم رکھا تو وہ حر ثابت ہوئے اور حریت کے کے اصل جوہر کو انہوں نے اپنے عمل سے نمایاں کر دیا"۔

۶۷۔ سعید بن عبداللہ حنفی۔ کوفہ کے معزز افراد میں شمار ہوتے تھے اور اہلِ بیت کرام علیہم السلام کے دوستوں میں سے تھے اہل کوفہ کی جانب سے جو دعوتی خط گئے تھے ان میں سے سب سے آخری خط کو لیکر خدمت میں پہنچنے والے ہانی بن ہانی شیبی اور سعید بن حنفی تھے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کے جوابی خطوط میں ان کے ناموں کا حوالہ بھی موجود ہے۔ شب عاشور جب امام حسین علیہ السلام

نے اپنا آخری اور تاریخی خطبہ دیا ہے کہ اپنی بیعت سے تمہیں آزاد کرتا ہوں، جہاں جی چاہے چلے جاؤ۔ تو اصحاب میں مسلم بن عوسجہ اور سعید کھڑے ہو گئے تھے اور انہوں نے جوش وولولہ سے بھرے ہوئے الفاظ استعمال کیے تھے کہ "خدا کی قسم ہم آپؑ کا ساتھ ہرگز نہ چھوڑیں گے۔" سعید کی بیوی نے بھی شوہر کے بعد جہاد میں حصہ لیا لیکن بعد میں حضرت امام حسین علیہ السلام نے منع فرما دیا۔

حضرت امام حسین علیہ السلام جب نماز ظہر میں معروف تھے تو آپ نے سعید اور زہیر کو بطور محافظ اپنے سامنے کھڑا کیا تھا۔ سعید نے یہ صورت اختیار کی کہ وہ خاص حضرت کے سامنے کھڑے تھے اور جو تیر آتا تھا اسے بڑھ کر اپنے سینے پر روکتے تھے یہاں تک کہ زخموں کی تاب نہ لا سکے اور جان بحق تسلیم ہوئے۔

۶۸۔ زہیر بن قین : اشراف عرب میں، کوفہ کے باشندے، بہادر اور متعدد لڑائیوں میں شریک ہو چکے تھے، جمل اور صفین کی لڑائیوں کے بعد سے مسلمان "عثمانی" اور "علوی" نام کی دو جماعتوں (طبری ج ۶ ص ۲۵۲) میں تقسیم ہو چکے تھے، جو لوگ معاویہ کے طرفدار تھے ان کو "عثمانی" کہا جاتا تھا اور جو حضرت علی علیہ السلام کی طرف تھے وہ "علوی" کہلاتے تھے۔

زہیر عام طور پر "عثمانی" جماعت سے متعلق سمجھے جاتے تھے اور بظاہر وہ اہل بیت نبوی علیہم السلام کے ساتھ کوئی خاص تعلق نہ رکھتے تھے لیکن وہ امام حسین علیہ السلام کی خاندانی وجاہت ذاتی کردار، سچائی کی قوت اور دوسرے محاسن سے متاثر ضرور تھے، اسی لیے جب ان کی دوران سفر زہیر بن قین سے ملاقات ہوئی تو پہلے ہی بلا وے پر

حاضر خدمت ہو گئے اور پھر تو حسین علیہ السلام کے ایسے عاشق وشیدا بنے کہ میدانِ کربلا میں رتبہ شہادت کو پہنچے۔ زہیر باصلاحیت انسان تھے، انہوں نے امام حسین علیہ السلام سے علیحدگی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۶۹۔ سلمان بن مضارب بن قیس بجلی۔ یہ زہیر بن قین کے چچا زاد بھائی تھے اور زہیر ہی کے ساتھ ہم سفر تھے۔ جب زہیر حضرت امامؑ کی نصرت کے خیال سے آپؑ کے ساتھ ہوئے تو سلمان نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ روزِ عاشورہ ظہر کے بعد شہید ہوئے۔

۷۰۔ عمرو بن قرظتہ بن کعب۔ ان کے والد قرظتہ بن کعب اصحاب میں سے تھے۔ جنگ احد میں شریک ہوئے اور اس کے بعد کی لڑائیوں میں بھی شریک جہاد رہے، ۲۳ھ میں خلیفہ دوم کے زمانے میں "رے" ان کے ہاتھوں فتح ہوا تھا، حضرت علی علیہ السلام نے اپنی خلافت کے زمانے میں ان کو کوفہ کا حاکم مقرر کیا تھا، اور پھر جب آپؑ جنگِ صفین جانے لگے تو ان کو اپنے ساتھ لے گئے۔ قرظتہ سب لڑائیوں میں حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ رہے اور آپؑ ہی کے زمانۂ خلافت میں کوفہ میں انتقال ہوا اور حضرت علی علیہ السلام نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ ان کے دو فرزند تھے عمرو اور علی، عمرو امام حسین علیہ السلام کی طرف تھے، غالباً بڑے یہ ہی تھے اس لیے ان کے والد کی کنیت ان ہی کے نام پر ابو عمرو تھی۔ اور ان کا چھوٹا بھائی علی لشکرِ یزید میں تھا۔ روزِ عاشور نماز ظہر کے بعد رتبہ شہادت پر فائز ہوئے۔

۷۱۔ نافع بن ہلال بجلی۔ اپنے قبیلے کے سردار اور بہادر شخص تھے، حافظ قرآن تھے، امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے اصحاب سے اور احادیث کے

حامل تھے۔ آپؑ کے ساتھ جمل، صفین اور نہروان میں شریک ہوئے تھے۔ آپ نے جنگ کربلا میں شرکت کی اور بعد نماز ظہر درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔

۷۲۔ شوذب بن عبداللہؓ، ہمدان کی ایک شاخ قبیلہ شاکر کے غلام زادوں میں سے تھے اور عابس بن ابی شبیب شاکری سے وابستہ تھے کوفہ میں اپنے اوصاف کی بنا پر نمایاں حیثیت رکھتے تھے اور ایک طرف مرد میدان، دوسری طرف احادیث کے محافظ اور حضرت علی علیہ السلام سے استفادہ کیے ہوئے تھے اور کوفہ میں اس باب میں مرجعیت کے حامل تھے۔ لوگ ان سے احادیث حاصل کرتے تھے۔ بہرحال امام حسین علیہ السلام کو سلام کر کے جنگ میں رتبۂ شہادت پر فائز ہوئے۔ (تاریخ طبری ج۶ ص۳۵۴)

۷۳۔ عابس ابن شبیب شاکری۔ ان کے متعلق حضرت علی علیہ السلام نے جنگِ صفین کے موقع پر فرمایا تھا کہ اگر ان کی تعداد ایک ہزار ہو جائے تو خدا کی عبادت اسطرح ہونے لگے جس طرح کہ ہونا چاہیئے۔ یہ لوگ بڑے شجاع اور جنگ آزما تھے اور "فتیان الصباح" کے لقب سے مشہور تھے۔ عابس کوفہ میں رئیسِ قوم، بہادر، مقرر، عبادت گذار اور شب زندہ دار تھے۔ متعدد لڑائیوں میں کارِ نمایاں انجام دے چکے تھے اور دلوں پر ان کی شجاعت کا سکہ تھا۔ عابس نے امام علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا تھا: "بخدا روئے زمین پر کوئی ایسا نہیں جو مجھے آپؑ سے زیادہ عزیز ہو۔ اگر مجھے قدرت ہوتی تو میں اپنی جان سے زیادہ کوئی عزیز شے آپؑ کی خدمت میں پیش کروں تو ایسا ہی کرتا مگر اب تو بس میری جان باقی ہے، بس اب اجازت دیجیئے کہ میں آخری سلام عرض کرتے ہوئے خدا کو گواہ کرتا ہوں کہ میں آپؑ کے اور آپکے پدر بزرگوارؑ

کے دین پر قائم ہوں" یہ کہکر رخصت ہوئے اور زبردست جنگ کی۔ پرے کے پرے صاف کردیئے۔ تھوڑی دیر کی جنگ کے بعد فوج کے ایک بڑے حصہ نے ان کو چاروں طرف سے گھیر کر شہید کردیا۔ پھر ان کا سرقلم کیا گیا۔ (تاریخ طبری ج ۶ ص ۲۵۳)

۴۷ و ۵۷۔ عبداللہ و عبدالرحمٰن فرزندانِ عروہ بن حراق غفاری۔ حضرت ابوذر غفاری (رض) کے قبیلہ سے حراق غفاری اصحاب حضرت علی علیہ السلام میں سے تھے اور آپ ؑ کے ساتھ جنگِ جمل، صفین اور نہروان میں شریک رہے تھے، ان کے دونوں پوتے عبداللہ و عبدالرحمٰن اشراف و شجاعانِ کوفہ میں سے اور دوستدار حضرت علی علیہ السلام میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے، دونوں بھائی امام حسین علیہ السلام کے پاس میدانِ کربلا میں پہنچے اور آپ ؑ کے انصار میں شامل ہوتے تھے، ظہر کے بعد وقت سخت سے سخت ہوتا جارہا تھا، اصحاب امام حسین علیہ السلام میں سے ہر ایک کی اب یہ کوشش تھی کہ میں اپنی جان پہلے نثار کروں۔ چنانچہ ان دونوں بھائیوں نے امام علیہ السلام کی خدمت میں عرض کی کہ "یا اباعبداللہ (علیہ السلام) ہمارا سلام قبول کیجئے، دشمن اب آگے بڑھتے چلے آرہے ہیں اور ہمارا بس نہیں چلتا۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ خود آپ کے سامنے قتل ہو جائیں اور آپ کی نصرت کا حق ادا کریں۔" حضرت امام علیہ السلام نے فرمایا اللہ تمہیں جزائے خیر دے، آؤ میرے قریب آؤ۔ یہ دونوں امام علیہ السلام کے قریب ہی اس فوج سے جو بڑھ آئی تھی، برسرپیکار ہوگئے اور یہ رجز پڑھ رہے تھے: "تمام بنی غفار اور خندف و بنی نزار کے قبائل اس بات سے واقف ہیں کہ ہم فاسق و فاجر گروہ پر حملہ کریں گے۔ باڑھ دار براں شمشیروں کے ساتھ

اے میرے رفیقو! آلِ رسول علیہم السلام کی حفاظت میں شمشیر ریزہ کے ساتھ جنگ میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھو"۔ آخر دونوں بھائی جنگ کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ (تاریخ طبری ج ۶ ص ۳۵۳)

۷۶۔ بن اسعد شبامی۔ یہ امرائے کوفہ میں سے نامآور اور خوش تقریر، بہادر اور حافظِ قرآن تھے۔ امام حسین علیہ السلام کے پاس آپ میدان کربلا میں وارد ہونے کے بعد پہنچے اور امام علیہ السلام نے گفتگوئے صلح کے دوران میں اکثر ان کو عمرو سعد کے پاس بہ سلسلہ نامہ و پیام بھیجا تھا۔ روزِ عاشورہ وہ امام علیہ السلام کے سامنے کھڑے ہوئے اور فوج کوفہ کو مخاطب کر کے بآوازِ بلند کہنے لگے:

"اے میری قوم کے لوگو! مجھے تمہارے متعلق اندیشہ ہے اس روزِ بد کا جو بہت سی قوموں کو نصیب ہوا۔ جیسے قوم نوح اور عاد و ثمود وغیرہ اور اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرتا بلکہ ان کی بداعمالیوں ہی کا بدلہ دیتا ہے، اے میری قوم میں تمہارے لیے اندیشہ رکھتا ہوں قیامت کے دن سے جبکہ تم اس دنیا سے پشت پھراؤ گے اور کوئی تمہارا بچانے والا خدا کے عذاب سے نہیں ہوگا۔ اور جس کی ہدایت سے خدا ہاتھ اٹھالے پھر اس کی ہدایت کون کرسکتا ہے۔ اے میری قوم امام حسین علیہ السلام کو قتل نہ کرو، نہیں تو خدا تم پر عذاب نازل کرے گا۔ اور جھوٹ کہنے والوں کا انجام ناکامی ہے"

اس کے بعد انہوں نے رخصتی سلام کیا۔ میدانِ جنگ میں گئے اور شہید ہوئے۔ (ارشاد ص ۲۵۲ تاریخ طبری ج ۶ ص ۲۵۴)

۷۷ و ۷۸۔ سیف بن حارث بن سریع و مالک بن عبد بن جابر ہمدانی:

یہ دونوں چچا زاد بھائی اور ایک ماں سے تھے۔ میدانِ کربلا میں پہنچ کر جماعت حسینی میں شامل ہوگئے۔

ان کا غلام شبیب بھی ان کے ساتھ تھا اور حملۂ اولیٰ میں شہید ہوا تھا۔
حنظلہ بن اسعد شبامی کی شہادت کے بعد وہ دونوں امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں سلامِ آخر بجالائے اور لڑ کر شہید ہوئے۔
(تاریخ طبری ج ۶ ص ۲۵۴)

۷۹۔ جون غلام ابوذرغفاری (رض) حبشی نسل سے تھے، فضل بن عباس کے مملوک تھے، حضرت علی علیہ السلام نے انہیں ڈیڑھ سو اشرفی میں خریدا تھا۔ اور حضرت ابوذرغفاریؓ کو ہبہ کردیا تھا تاکہ ان کی خدمت کریں۔
حضرت ابوذر (رض) کی رحلت کے بعد وہ حضرت علی علیہ السلام کے پاس آگئے، پھر امام حسن علیہ السلام کے ساتھ رہے اور آخر میں حضرت امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں تھے۔ ان کی شہادت پر امام علیہ السلام نے دعا فرمائی: "خداوندا، اس کے چہرے کو روشن کردے، اس کی بدبو کو خوشبو سے متبدل کردے اور اسے صالحین کے ساتھ محشور کر اور اسے محمدؐ وآلِ محمد علیہم الصلوٰۃ والسلام کی حقیقی معرفت رکھنے والوں میں محسوب فرما۔"

۸۰۔ غلام ترکی۔ حافظ قرآن، حضرت امام حسین علیہ السلام کے غلام تھے جن کو آپؑ نے اپنے فرزند زین العابدین علیہ السلام کو ہبہ کردیا تھا۔
جنگ کرکے انہوں نے بہت سے لوگوں کو قتل کیا، بالآخر زخمی ہوکر گر گئے امام حسین علیہ السلام ان کی لاش پر سرہانے تشریف لائے اور گلے میں باہیں ڈال دیں اور اپنا رخسار ان کے رخسار پر رکھ دیا۔ انہوں نے آنکھیں کھولیں اور اس عزت افزائی کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کرلیں۔

۸۱۔ انس بن حارث اسدی۔ انس بن حارث بن نبیہ

بن کاہل بن عمرو بن صعب بن اسد بن خزیمہ اسدی، کاہلی اصحابِ رسول (ص) میں سے تھے، حدیث کے راوی تھے وہ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانی شہادت امام حسین علیہ السلام کی خبریں سن کر نصرت کے ارادے سے اس دن کے منتظر رہے۔ واقعہ کربلا کے موقع پر وہ بہت عمر رسیدہ تھے مگر جذبۂ ایمانی ایسا رکھتے تھے کہ امام حسین علیہ السلام کے ساتھ کربلا پہنچے اور روزِ عاشورؑ اجازتِ جہاد حاصل کرنے کے بعد انہوں نے عمامہ سے اپنی کمر باندھی اور بھوؤں کو جو آنکھوں پر لٹک آئی تھیں اونچا کرکے رومال سے پیشانی پر باندھا۔ امام علیہ السلام نصرتِ دین میں ان کا یہ اہتمام دیکھ دیکھ کر رو رہے تھے اور فرما رہے تھے:

"شکر اللہ لک یا شیخ" یعنی اے بوڑھے مجاہد، خدا تیرے حسنِ عمل کی قدر کرے۔ بالآخر وہ جنگ کرکے درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

۸۲۔ حجاج بن مسروق۔ یہ کوفہ کے معزز باشندہ تھے۔ میدان کربلا میں ظہر کے وقت امام حسین علیہ السلام نے انہی کو اذان کا حکم دیا تھا۔ روزِ عاشورؑ بعد ظہر جنگ لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔

۸۳۔ زیاد بن عریب ہمدانی۔ ان کے والد گرامی کو خدمتِ رسول ص میں حضوری کا شرف حاصل تھا اور خود زیاد بڑے عابد و زاہد، شب زندہ دار اور تہجد گذار تھے۔ شجاعت میں بلند پایہ رکھتے تھے۔ روزِ عاشورؑ جنگ کرنے کے بعد درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

۸۴۔ سالم بن عمرو بن عبداللہ مولی بنی المدینۃ الکلبی۔ سالم قبیلہ کلب کے غلام تھے اور دوستداران امام حسین علیہ السلام میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ جب امام حسین علیہ السلام میدانِ کربلا میں وارد ہونے کی خبر سنی تو قبیلہ کلب

کے لوگوں کے ساتھ وہاں پہنچ کر آپ ؑ کے انصار میں داخل ہوئے اور روزِ عاشورہ درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔ یہ کوفہ کے باشندہ تھے۔

۸۵۔ سعد بن حارث مولی امیرالمومنین ۔ حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے غلام تھے آپ ؑ کی شہادت کے بعد امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں رہے۔ مدینہ سے کربلا تک آپ ؑ کے ساتھ آئے تھے، روزِ عاشورہ انہوں نے بھی اپنی جان اپنے آقا زادوں پر نثار کردی۔

۸۶۔ عمرو بن جندب حضری۔ کوفہ کے باشندہ تھے۔ جب جناب مسلم بن عقیل کوفہ میں داخل ہوئے تو وہ ان کے انصار میں شریک ہو گئے تھے اور جناب مسلم کی شہادت کے بعد خفیہ طور پر امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں پہنچے اور روزِ عاشور شہید ہوئے۔

۸۷۔ قعنب بن عمرو النمیری ۔ بصرہ کے باشندہ تھے۔ حجاج بن زید سعدی کے ساتھ امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور روزِ عاشور درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔

۸۸۔ یزید بن ثبیط العبدی : وہ بصرہ کے باشندہ تھے۔ حضرت علی علیہ السلام کے مصاحبین میں سے تھے۔ جب عراق کے راستہ میں ابطح کی منزل پر امام علیہ السلام وارد ہوئے تھے، جب یہ لوگ اس مقام پر پہنچ کر امام علیہ السلام کے خیمہ کیطرف شرف ملاقات حاصل کرنے کے لیے گئے تو امام علیہ السلام ان کے آنے کی خبر سن کر خود ان سے ملنے کے لیے دوسرے راستہ سے ان کی جائے قیام پر تشریف لا چکے تھے اور ان کے خیمہ میں کافی دیر تک قیام فرمایا۔ انہوں نے عزمِ نصرت کا اظہار کیا۔ امام علیہ السلام نے دعائے خیر دی۔ روزِ عاشورہ وہ اپنے فرزندوں کے بعد جنگ کر کے درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔ (تاریخ طبری ج ۶ ص ۱۹۸)

۸۹- یزید بن مفضل جحفی۔ اصحاب حضرت علی علیہ السلام میں سے تھے۔ آپ (ع) کے ساتھ جنگ صفین میں شریک ہوئے۔ ان کے باپ صحابہ میں تھے۔ روز عاشورہ زبردست جنگ کی اور شہادت پائی۔

۹۰- رافع بن عبداللہ مولی مسلم الازدی۔ مسلم بن کثیر اعرج کے غلام تھے۔ اپنے مالک کے ساتھ کربلا آئے اور روز عاشورہ جنگ کرکے شہید ہوئے۔

۹۱- بشیر بن عمرو بن الاحدوث الحضرمی الکندی۔ حضرموت کے باشندہ تھے لیکن کوفہ کے محلہ بنی کندہ میں قیام تھا اسلیے کندی کہلانے لگے جب کربلا میں صلح کی گفتگو ہو رہی تھی، اس زمانے میں آکر انصار امام حسین علیہ السلام میں شامل ہوئے چنانچہ وہ اصحاب امام حسین علیہ السلام کے سلسلہ میں تقریباً بالکل آخری شہید ہیں۔

۹۲- سوید بن عمرو بن ابی المطاع الخثعمی۔ ضعیف العمر، عابد و زاہد اور بڑے نماز گذار تھے، متعدد لڑائیوں میں شریک ہوکر کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے۔ روز عاشور شریک جنگ تھے، اور اصحاب امام حسین علیہ السلام میں سب سے آخر وہی ایک باقی رہ گئے تھے۔ چنانچہ بشر عمرو حضرمی کے بعد انہوں نے میدان میں نکل کر جنگ کی اور بالآخر وہ اس درجہ زخمی ہوکر گرے کہ عام طور یہ سمجھ لیا گیا کہ روح جسم سے مفارقت کر گئی مگر حقیقتاً ان میں جان باقی تھی چنانچہ جب امام حسین علیہ السلام شہید ہوگئے تو انہیں ہوش آیا اور ان کے کان میں آواز گئی۔ امام حسین علیہ السلام قتل ہوگئے، وہ بیتاب ہوکر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کی تلوار لوگ لے جاچکے تھے، ایک چھرا موجود تھا، اس سے انہوں نے دشمنوں پر حملہ کیا، آخر دشمن ٹوٹ پڑے اور ان کا سر تن سے جدا کردیا۔

(تاریخ طبری ج ۶ ص ۲۰۶)

امام علیہ السلام کی شہادت کے بعد اہلبیت علیہم السلام

میں امام زین العابدین علیہ السلام، حسن بن حسن عمرو بن حسن اور کچھ شیر خوار بچے باقی رہ گئے تھے جو شیر خوارگی کی وجہ سے بچ گئے۔

جب قافلہ وارد کربلا ہوا اس وقت بہت سی ماؤں کی گود میں بچے تھے لیکن جب لُٹا ہوا قافلہ مدینہ میں داخل ہوا ہے تو سب ماؤں کی گودیاں خالی تھیں البتہ امام محمد باقر علیہ السلام ضرور میدانِ کربلا میں شہادت سے بچ گئے تھے۔

تجہیز و تکفین شہادت کے دوسرے یا تیسرے دن غاضریہ کے باشندوں نے شہداء کی لاشیں دفن کیں، حضرت امام حسین علیہ السلام کا لاشہ بے سر دفن کیا گیا، سر مبارک ابن زیاد کے ملاحظہ کے لیے کوفہ بھیجا گیا تھا۔ ابن زیاد کے سامنے جب سر پیش ہوا تو چھڑی سے لب و دندان مبارک کو چھیڑنے لگا۔ حضرت زید بن ارقم موجود تھے، ان سے یہ نظارہ نہ دیکھا گیا، فرمایا چھڑی ہٹالو، خدائے واحد کی قسم میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے لب مبارک کو ان لبوں کا بوسہ لیتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ کہکر بے اختیار رو دیئے۔ ابن زیاد بولا خدا تیری آنکھوں کو ہمیشہ رلائے، اگر بڈھا پھوس نہ ہوتا، اور تیرے ہواس جاتے نہ رہے ہوتے تو تیری گردن اڑادیتا، ابن زیاد کے یہ گستاخانہ کلمات سُن کر آپ نے فرمایا کہ "قوم عرب آج سے تم نے غلامی کا طوق اپنی گردن میں ڈال لیا۔ تم نے ابن مرجانہ کے کہنے سے حسین بن فاطمہ علیہما السلام کو قتل کر دیا، ابن مرجانہ نے تمہارے آدمیوں کو قتل کیا اور بڑوں کو غلام بنایا اور تم نے یہ ذلت گوارا کرلی۔ اسلیے ذلیلوں سے دُور رہنا بہتر ہے۔" یہ کہہ کر اس کے پاس سے چلے گئے۔

(ابن اثیر ج ۴ ص ۶۹-۷۰)

حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد شامی بقیۃ السیف اہل بیت کو علیہم السلام کو کربلا سے لے چلے،

اسوقت تک شہداء کی لاشیں اسی طرح بے گور و کفن پڑی ہوئی تھیں، اہل بیت علیہم السلام کا یہ ستم رسیدہ قافلہ اسی راستہ سے گزرا، بے گور و کفن لاشوں پر عورتوں کی نظر پڑی تو قافلہ میں ماتم بپا ہوگیا۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کی صاحبزادیوں اور بہن نے سر پیٹ لیا۔ زینب رو رو کر فریاد کرتی تھیں کہ:

اے محمدؐ گر قیامت سر بروں آری زخاک
سر بروں آر د قیامت درمیانِ خلق بیں

اے دادا جان محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس پر ملائکہ آسمانی درود سلام بھیجتے تھے، آیئے دیکھیے امام حسین علیہ السلام کا لاشہ چٹیل میدان میں اعضا بریدہ، خاک و خون میں آلودہ پڑا ہے، آپؐ کی ناموس قید ہے، آپؐ کی ذریت مقتول ہو چکی ہے، ہوا ان پر خاک اڑا رہی ہے، یہ دلدوز بین سُن کر دوست و دشمن سب رونے لگے۔ اس طریقہ سے یہ قافلہ کوفے جا کر ابن زیاد کے سامنے پیش کیا گیا۔

سرہائے شہدائے کربلا

اس موضوع پر مورخین و صاحبان مقاتل نے مختلف روایات نقل کی ہیں جو درحقیقت قیاس آرائیاں ہیں۔ بعض حضرات نے اس موضوع پر تحقیق کرتے ہوئے درایت سے کام نہیں لیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق عام طور سے اذہان منتشر اور آراء پریشان ہیں۔ ورنہ تاریخی اور واقعاتی مسلم الثبوت حقیقت یہی ہے کہ امام حسین علیہ السلام کا سرِ اقدس تمام شہدائے کربلا رضوان اللہ علیہم کے سرہائے مقدسہ کے ساتھ کربلا میں ان کے اجساد طاہرہ کے ساتھ ہی امام زین العابدین علیہ السلام ہی کی نگرانی میں مدفون ہے۔ یہ ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس کا مذہبی عقیدت سے کوئی تعلق قرار نہیں

دیا جاسکتا، اس دعوے کے ثبوت کے طور پر بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ہم قارئین کے سامنے علامہ عبدالرزاق موسوی المقرم کی تحقیق کا نچوڑ ان ہی کے الفاظ میں پیش کردیں کہ یہ مختصر ترین بھی ہے اور جامع بھی، چنانچہ علامہ موصوف اپنی کتاب "مقتل الحسین علیہ السلام حدیث کربلا" مطبوعہ نجف اشرف ۱۳۷۶ھ ص ۴۳۶ - ۴۳۷ پر فرماتے ہیں:

"جب حضرت امام زین العابدین کو معلوم ہوا کہ اب یزید کی شورہ بختی ماند پڑ گئی ہے اور وہ ایک حد تک موافق ہو گیا ہے تو آپؑ نے اس سے تمام سرہائے مقدسہ کے دینے کا مطالبہ فرمایا تاکہ آپؑ انہیں ان کے صحیح مقام پر دفن فرمادیں، اور یہ بات یزید کے میلانِ طبع سے بعید بھی نہیں تھی، اس لیے اس نے امام حسین علیہ السلام کے اہل بیت علیہم السلام اور اصحاب رضوان اللہ علیہم کے سرہائے مقدسہ کے ساتھ آپؑ کا سرِ اطہر بھی آپؑ کی خدمت میں پیش کردیا۔ چنانچہ امام زین العابدین علیہ السلام نے ان حضرات کے اجسادِ طاہرہ سے ملحق کردیا۔

جیسا کہ نفس المہموم ص ۲۵۳ اور ریاض الاحزان ص ۱۵۵ میں ہے کہ حبیب السیر میں سرہائے مقدسہ کے کربلا لائے جانے پر نص موجود ہے۔

اور جہاں تک امام حسین علیہ السلام کے سرِ اقدس کا تعلق ہے تو فتال کی روضۃ الواعظین ص ۱۶۵ اور ابن نما حلّی کی مثیر الاحزان ص ۵۸ پر ہے کہ: گروہ امامیہ کے نزدیک معتبر اور قابلِ اعتماد بات یہی ہے۔ اور ابن طاؤس نے اللہوف میں ص ۱۱۲ پر تحریر فرمایا ہے کہ: گروہ امامیہ کا عمل اسی پر ہے، طبرسی نے اعلام الوریٰ ص ۱۵۱، اور صاحب مقتل العوالم نے اس مقتل کے ص ۱۵۴ پر اور ریاض المصائب اور بحار الانوار میں لکھا ہے کہ یہی بات علماء کے درمیان مشہور ہے،

ابن شہر آشوب نے مناقب ج ۲ کے ص ۲۰۰ پر لکھا ہے کہ سید مرتضیٰؒ نے بعض رسائل میں ذکر کیا ہے کہ امام حسین علیہ السلام کا سرِاقدس کربلا میں ان کے جسدِ اطہر کی طرف لوٹا دیا گیا تھا۔ شیخ طوسیؒ نے کہا ہے: کہ اس سے زیارت اربعین ہے، بحارالانوار میں علامہ حلیؒ کے برادر محترم کے باوثوق حوالوں کے ذریعے اس کی تائید میں بات کی گئی ہے، قزوینی کی عجائب المخلوقات میں ص ۶۷ پر ہے کہ: ۲۰ صفر کو امام حسین علیہ السلام کا سرِاقدس جسمِ اطہر کی طرف لوٹا دیا گیا۔

ابن حجر عسقلانی نے شرح ہمزیہ البوصیری میں لکھا ہے کہ: امام حسین علیہ السلام کا سرِاقدس آپؑ کے قتل کے چالیس دن بعد لوٹایا گیا۔ سبط ابن جوزی نے کہا ہے کہ، مشہور یہ ہے کہ وہ (یعنی امام حسین علیہ السلام کا سرِاقدس) کربلا لوٹایا گیا اور جسدِ اطہر کے ساتھ دفن کیا گیا۔ المناوی نے الکوکب الدریہ ج ۱ ص ۵۷ پر اس بات پر علمائے امامیہ کا اتفاق نقل کیا ہے کہ سرِاقدس کربلا لوٹایا گیا، قرطبی نے بھی اس بات کو ترجیح دی ہے اور اس کا تعاقب نہیں کیا بلکہ اہل کشف وشہود کی طرف منسوب کیا ہے کہ انہوں نے اس کے لیے اس بات پر اطلاع حاصل کی کہ سرِاقدس کو کربلا لوٹایا گیا۔

ان تمام حقائق کے پیش نظر اس کے خلاف بیان کی جانے والی روایات قابلِ توجہ نہیں رہتی ہیں، اور جہاں تک ان اعلام کی رائے ہیں اس حدیث کا تعلق ہے کہ امام علیہ السلام کا سرِاقدس آپؑ کے والد علیہ السلام کے روضہ کے قریب دفن ہوا تو اس روایت سے ان حضرات کا اعراض ہمارے لیے اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ان حضرات کو اس پر اعتماد نہیں تھا کیونکہ اس کے اسناد نامکمل اور اس کے رجال غیر معروف ہیں۔"

حسینی شخصیت کی بینظیر رفعت

امام حسین علیہ السلام اپنے کردار کی بلندی میں منفرد ہوتے اسوقت بھی کہ جب یزید کی خلافت کے تمام عالم اسلامی میں تسلیم شدہ ہونے کے بعد تنہا انکار کی آواز آپؑ ہی سے بلند کی ہوتی، لیکن اسوقت امام حسین علیہ السلام اور بھی بلند نظر آتے کہ جب آپنے ہزاروں تلواروں، نیزوں اور تیروں کے مقابلے میں بھی اس انکار کو قائم رکھا۔ امام حسین علیہ السلام اسوقت بھی حسین علیہ السلام ہوتے جب آپ (ع) اکیلے قربان گاہ شہادت میں تنہا اپنی جان کا ہدیہ پیش کر دیتے لیکن امام حسین علیہ السلام اور بھی بلند ہوگئے جب آپؑ نے اپنے ساتھ کم از کم بہتر (۷۲) قربانیاں اور بھی پیش کردیں۔

امام حسین علیہ السلام بے شک حسین علیہ السلام ہی رہتے، اگر آپ کسی جماعت کو پرجوش تقریروں کے ذریعہ سے ترغیب اور تحریص سے کام لیتے ہوتے، لیکن اور بھی بلند منزل پر نظر آئے کہ جب آپؑ نے اپنے ساتھ والوں کو اس قسم کی کسی صورت سے ساتھ رکھنے کی کامیابی نہیں حاصل کی بلکہ آپؑ نے اپنی حقانیت کو اس طرح ان کے ذہن نشین کیا کہ ان میں سے ہر ایک حسینی عزم اور استقامت کا حامل ہوگیا یعنی عام طور پر تو ایک انسان کا اپنے دل و دماغ کو قابو میں رکھنے اور اپنے قدم کا مستقل رکھنا ہی ایک بڑا کارنامہ ہوتاہے لیکن امام حسین علیہ السلام نے بہتر آدمیوں کے دل و دماغ کو ایک مرکز پر جمع کرکے گویا ہر ایک سینہ میں اپنا دل اور ہر دل میں اپنا استقلال ودیعت کر دیا تھا ـــــ جیسے یوں کہا جا سکتاہے کہ،

امام حسین علیہ السلام ایک اکیلے میدانِ جہاد میں حسین علیہ السلام ہوکر نہیں آئے تھے بلکہ وہ بوقت واحد بہتر حسین علیہ السلام میدانِ قربانی میں پیش کر رہے تھے۔ یعنی ایسے افراد جن میں

ہر ایک قوم، قبیلہ اور سن و سال کے باہمی اختلاف کے باوجود اس ایک روح کا حامل تھا، جس روح کو ہم سوائے لفظ "حسین علیہ السلام" کے کسی دوسرے نام سے موسوم نہیں کر سکتے۔

اس کے بعد امام حسین علیہ السلام اسوقت بھی حسین علیہ السلام ہی رہتے جب (ع) اپنے اعزہ و احباب کے داغ اٹھانے سے قبل جام شہادت نوش فرما لیتے لیکن امام حسین علیہ السلام اسوقت اور سطح پر نظر آئے کہ جب آپنے ان میں کی ہر فرد کو اپنے سامنے راہ حق میں نثار کردیا۔

پھر اس صورت میں بھی امام حسین علیہ السلام یقیناً ایک مخصوص منزل پر ہوتے اگر اس کے بعد آپ ع بغیر مقابلہ کیے ہوئے اپنے کو نیزہ و شمشیر کے سپرد کر دیتے مگر امام حسین علیہ السلام اسوقت اس سے بھی بلند نظر آئے جبکہ انہی ہاتھوں سے جن پر ابھی کسی شیرخوار کا لاشہ اُٹھا چکے تھے۔ تلوار کا قبضہ مضبوط پکڑ کر دشمن کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور اس تنہائی کے عالم میں اور ہزاروں کے نرغے میں بھی آپ ع نے حمزہ و جعفر اور حیدر صفدر علیہ السلام کے روایات کو زندہ کر دکھایا۔

امام حسین علیہ السلام اور بھی بلند منزل پر اسوقت نظر آتے ہیں جب ہم اس پر غور کرتے ہیں کہ آپ ع نے شدید سے شدید مصائب و آلام میں مبتلا ہونے کے باوجود شریعت اسلام کے عام فرائض و تعلیمات کو ایک لمحہ کے لیے نظر انداز نہیں فرمایا۔ چنانچہ اصحاب و اعزہ کے لاشے اٹھانے کے ساتھ غلاموں کے لیے بھی مساوات برت رہے تھے جیسا کہ جون غلام ابوذر غفاری رض اور غلام ترکی کے حالات میں درج کیا جا چکا ہے اور اس موقع پر بھی جب آپ ع کے اصحاب ایک ایک کرکے شہید ہوتے جا رہے تھے اور جدال و قتال جاری تھا، آپ ع نے نماز ظہر با جماعت ادا فرما کر احساسِ فرض کی بے نظیر مثال پیش کی۔ دوسرے

لفظوں میں یہ ہے کہ بوقت واحد آپؑ جہاد بھی کرتے جاتے تھے اور مقاصدِ جہاد کا عملی اعلان بھی۔

امام حسین علیہ السلام اسوقت بھی حسین علیہ السلام ہی رہتے جب آپؑ صرف اپنے تمام اصحاب و اعزہ کے ساتھ شہید ہو جاتے اور اپنے جہاد کو اپنی زندگی کے خاتمہ پر ختم کرتے، مگر اس وقت امام حسین علیہ السلام میدان جہاد میں اور بھی بلند نظر آتے ہیں جب آپؑ نے اپنی شہادت کے بعد کے لئے اس شہادت کے مقاصد کی اشاعت کا انتظام کیا اپنے اہل حرم اور چھوٹے بچوں کو ساتھ لاکر جن میں سے ہر ایک میں فرض شناسی اور حقیقت پروری اس درجہ سرایت کیے ہوئے تھی کہ ابن زیاد کے دربار میں اور یزید کے قصر حکومت میں بھی ان پسماندگان میں سے کسی ایک نے اموی حکومت کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کیا۔ یعنی اس بیعت کا انکار جس پر امام حسین علیہ السلام کا سر نیزہ پر پہنچ گیا اب بھی قائم تھا۔ اور اب کے علمبردار سید سجاد، زینب خاتون ام کلثوم ہی نہیں بلکہ کمسن بچے فاطمہ اور سکینہ اور امام محمد باقر علیہ السلام بھی تھے۔

کردار حسینی کی لامتناہی رفعت کے مذکورہ منازل میں سے ہر منزل وہ ہے جہاں انسانیت سر تسلیم خم کر دیتی ہے اور اسی کو انتہائے امکان سمجھ لینے پر اکتفا کر لیتی ہے مگر حسینی عمل اس کے بعد بھی آگے بڑھتا نظر آتا ہے اور آخر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ آپؑ کی ذات تاریخ عالم میں ایک نئے انسانی تصور کا اضافہ کرتی ہے۔ وہ تصویر جس کے خدوخال میں تیرہ سو برس سے اب تک دنیا مصروف ہے اور ابھی کچھ اور سمجھ کر لفظوں میں بیان کر سکنا باقی ہے۔

کوئی شک نہیں کہ زندگی عزیز شے ہے اور فطرتِ انسانی میں حیات دنیا کی محبت ودیعت کی گئی ہے، انسان

اسی کی خاطر دنیا کے سخت ترین مشکلات کو برداشت کرتا ہے اور سرد و گرم کا تحمل کرتا ہے اور وہ تمام ذرائع جن سے اس ہستی کی بقا کا امکان ہو اپنے لئے حاصل کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ اسلام نے بھی اس فطری رجحان کو روکنے کی کوئی وجہ نہیں پائی بلکہ "وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ" (البقرة ۲ آیت ۱۹۵) (اپنے نفس کو ہلاکت میں نہ ڈالو) کے حکیمانہ حکم سے حفاظت نفس کو ایک لازمی فریضہ قرار دیا۔ لیکن زمانے کے لیل و نہار میں ایسے مواقع بھی پیش آجاتے ہیں جب جذبات میں تلاطم اور طبعی و عقلی رجحانات میں تصادم ہوتا ہے، زندگی اپنی تمام دل فریبیوں کے باوجود اتنی مہیب صورت میں نظر آتی ہے کہ انسان بے اختیار اس سے آنکھیں موڑ لینا پسند کرتا ہے اور اسی محبوب زندگی سے جس پر وہ ہر ممکن چیز قربان کر دینا پسند کرتا تھا ہاتھ دھونے میں لذت محسوس کرتا ہے۔

یہ صورت کبھی غیر شعوری، شہوانی، جاہلانہ اور ناعاقبت اندیش رجحانات سے پیدا ہوتی ہے اور اس موقع پر جان دینے سے نہ عقل بڑھ کر مرحبا کہتی ہے اور نہ شرع شاباش کی آواز دیتی ہے لیکن جس وقت موت سے بدتر زندگی اور زندگی سے بہتر موت میں معاملہ پڑ گیا ہو، جس وقت بقائے حیات اہم ترین مقاصد سے پامال ہو جانے پر موقوف ہو اور جس وقت عزت نفس اور فنائے وقتی کا سوال درپیش ہو۔ جب میزان عقل سے صورت حال کے مختلف پہلوؤں کو تول کر موت کو حیات پر ترجیح بھی دی ہو اس وقت موت کے منہ میں جا پڑنے والے حیاتِ دائمی کے مالک ہو جاتے ہیں۔

حسین بن علی علیہ السلام نے کربلا میں اپنے فریضہ کا احساس کرتے ہوئے جو راستہ طے کیا تھا وہ اسی اصول پر مبنی تھا۔ آپ ؑ کی زبان سے نکلی ہوئی لفظیں (اَلْمَوْتُ خَيْرٌ مِنْ رُكُوبِ الْعَارِ ننگ و عار برداشت کرنے سے موت کا آنا بہتر ہے" اور یہ کہ

(اَلْمَوْتُ فِی عِزٍّ خَیْرٌ مِنْ حَیَاتٍ فِی ذُلٍّ) "عزت کی موت ذلت کی زندگی سے بہتر ہے"

صحرائے کربلا میں گونج کر فنا نہیں ہوگئیں بلکہ ان کی پائیداری اب بھی عزت دار اقوام کے صحیفہ حیات کا سرنامہ اور دیباچہ زندگی کا عنوانِ اول ہے۔

یہ مختصر لفظیں علو ہمت کی منادی اور عزت نفس کی ترجمان ہیں اور ان ہی کو امام حسین علیہ السلام نے عملی وزن کے ساتھ دنیا کے سامنے رکھا ہے۔

(ماخوذ از "شہید انسانیت")
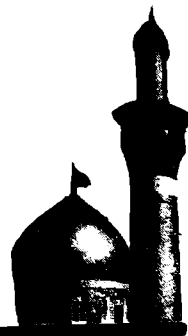
چوتھا حصّہ

کردار کی روشنی

از : سیّد حسین مرتضیٰ

الحمدللہ ہم سب جانتے ہیں کہ
امام حسین علیہ السلام اسلام کی تبلیغ اور احکامِ خداوند عالم کی ترویج
کے منصب کے حامل تھے، اور انہوں نے اپنے فرضِ منصبی کے
راستہ میں حائل ہونے والی تمام مشکلات کو صرف خداوندِ عالم
کی رضا کے حصول کی خاطر برداشت کیا۔ اس لیے

حسینی ہونے کی حیثیت سے ہم سب مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ ہم امام علیہ السلام کی آواز پر لبیک کہیں اور اپنے کردار و گفتار کو ان کے کردار و گفتار کا نمونہ بنانے کی کوشش کریں. کیونکہ حضرت سید الشہداء علیہ السلام نعرہ لے کر نہیں اُٹھے تھے، بلکہ ان کا نظریہ عمل تھا، ایسا عمل جو نقص سے مبرا اور کمال کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہو، جو خالصتاً خداوند عالم کی خاطر ہو اور اسلام اور شریعت اسلامیہ کے معلوم و معین ضابطہ کا تابع ہو۔ امام حسین علیہ السلام جب خود اس ضابطہ سے انحراف نہیں کر سکتے تھے تو پھر کسی دوسرے مسلمان کے نزدیک اس ضابطہ سے انحراف کس طرح درست ہو سکتا ہے!؟ چاہے وہ طبقہ علماء سے تعلق رکھتا ہو یا طلبہ سے، مزدور طبقہ سے متعلق ہو یا افسر، متمول طبقہ کا فرد ہو یا غریب، ذاکر ہو یا نوحہ خواں، اور خطیب ہو یا ماتمی۔ حضرت سید الشہداء علیہ السلام اور اسلام کی نظر میں سب کے سب یکساں ہیں اور جو بھی اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے، اسے اس کی سزا بھگتنا پڑے گی اور امام حسین علیہ السلام اس کی اس کوتاہی اور اس کے جرم سے اپنی برائت کا اظہار فرمائیں گے. تو آیئے یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ امام حسین علیہ السلام نے کربلا جیسی ہولناک اور دل ہلا دینے والی عظیم المرتبت قربانی کس مقصد کی خاطر دی اور اس مقصد کو انہوں نے اپنے کردار و گفتار کے آئینے میں کس طرح پیش کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس مقالہ کے حدود اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ ہم امام حسین علیہ السلام کے کردار و گفتار کے تمام پہلوؤں پر مفصل گفتگو کریں، اس لیے اختصار کی خاطر ہم یہاں امام حسین علیہ السلام کی زندگی کے چند واقعات اور کچھ اقوال و فرامین کے تذکرہ پر ہی اکتفا کریں گے

تاکہ ہم اس روشنی سے اپنے فکر و عمل کی تاریکیوں میں اجالا پیدا کر سکیں، اور اپنے افکار و کردار کی اصلاح میں ٹھوس قدم اٹھا سکیں، کیونکہ اس کے بغیر ہمارے مطالعات بے سود، ہمارا دعوئے محبت غلط اور رسول و اہل بیتِ رسول علیہم السلام سے ہماری دوستی مشتبہ ہو کر رہ جاتی ہے۔

پھر ہم امامِ زمانہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ظہور کے انتظار کی منزل سے گذر رہے ہیں، اور جن حالات میں امام زمانہ علیہ الصلوٰۃ والسلام ظہور فرمائیں گے وہ ہمارے پیشِ نظر ہیں، اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ آپ کس انداز سے ظاہر ہونگے اور اپنے ظہور کے بعد کیا اقدامات فرمائیں گے، اس لیے اگر ہم ان فداکاروں میں شامل ہونا چاہتے ہیں اور ان کی تیغِ براں کی زد سے بچنا چاہتے ہیں تو ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے آپ اور اپنے اہل و عیال، اعزہ و اقربا اور اپنے معاشرہ کو فکر و عمل کی اس منزل پر لے آئیں جہاں نہ غلط افکار ہم پر اثر انداز ہو سکیں اور نہ کسی فرد، معاشرہ یا قوم کی تنقید ہمارے لیے احکامِ شریعت پر عمل کرنے میں کوئی رکاوٹ بن سکے۔

یہ مقالہ فقط اسی مقصد کے لیے اس دعا کے ساتھ نذر کیا جا رہا ہے کہ کہ خداوند عالم ہمیں فکری و عملی طور پر ہر لحاظ سے صحیح مومن بننے کے توفیقات عطا فرمائے۔ آمین بحق محمد و آلہ الطاہرین۔

آسانی کے لیے ہم نے اس مقالہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے جنہیں ہم نے:

۱۔ درسِ کردار

اور ۲۔ درسِ افکار

کے نام سے معنون کیا ہے۔

۱۔ درسِ کردار:

ایک مرتبہ کچھ مسکین اور فقیر سرِ راہ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ اتفاق سے ادھر سے حضرت امام حسین علیہ السلام کا گذر ہوا۔ انہوں نے آپؑ کی زیارت کی تو سلام و کلام کے بعد آپؑ کو اپنے ساتھ کھانے میں شرکت کی دعوت دی۔

امام حسین علیہ السلام خوشی خوشی ان کی چادر کے کنارے پر بیٹھ گئے اور ان کے سوکھے ٹکڑوں اور بدمزہ کھانے میں ان کے ساتھ شریک ہو گئے اور فرمایا:

اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْتَکْبِرِیْنَ (نحل ۱۶/۲۳) "بے شک اللہ تکبر کرنیوالوں کو پسند نہیں کرتا"

کھانا ختم ہوا اور دستر خوان بڑھا تو امام حسین علیہ السلام نے ان نئے اور اجنبی احباب سے فرمایا:

" بھائیو! ہم نے آپ کی دعوت قبول کی تو اب آپ بھی ہماری دعوت قبول کیجئے "۔ چنانچہ امام حسین علیہ السلام ان حضرات کو اپنے ساتھ گھر لے آئے، اور بڑے احترام کے ساتھ بٹھایا۔ اور آپؑ نے اپنی خادمہ سے فرمایا:

" گھر میں جو کچھ ہے وہ لے آؤ۔"

پھر آپؑ نے ان حضرات کو اتنا کچھ بطور تحفہ عطا فرمایا کہ وہ فقر و فاقہ سے نجات پا جائیں۔

(میرزا: ناسخ ج ۶ جزء ۴ ص ۷۶)

کہتے ہیں، امام حسین علیہ السلام کے ایک فرزند کو ان کے کسی اُستاد نے سورۂ حمد یاد کرایا۔ ایک مرتبہ اس بچے نے امام علیہ السلام کو اپنا یاد کیا ہوا سورہ سنایا، تو آپ بہت خوش ہوئے اور استاد کی دلجوئی کے لیے ایک ہزار دینار اور ایک ہزار خلعت عطا فرمائے، نیز

ن کا منہ موتیوں سے بھروا دیا۔
جب لوگوں کو اس واقعہ کا علم ہوا تو انہوں نے امام علیہ السلام سے عرض کی:
"آقا! ایسے کام کے سلسلہ میں یہ انعام!!"
امام علیہ السلام نے فرمایا:
"یہ مختصر سا انعام، اس استاد کی اس عطا کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے جو اس نے اس فرزند کو عطا کی ہے۔"
پھر آپؑ نے یہ اشعار پڑھے:

إِذَا جَادَتِ الدُّنْيَا عَلَيْكَ فَجُدْ بِهَا   عَلَى النَّاسِ طُرًّا قَبْلَ أَنْ تَتَفَلَّتِ
فَلَا الْجُوْدُ يُفْنِيْهَا إِذَا هِيَ أَقْبَلَتْ   وَلَا الْبُخْلُ يُبْقِيْهَا إِذَا مَا تَوَلَّتِ

"جب دنیا اور اس کے مال و متاع میں کچھ تمہیں عطا کیا جائے، تو تم اسے اس سے پہلے دوسروں کو بخش دو کہ وہ خود تمہارے پاس سے کسی اور کے پاس چلا جائے کیونکہ جب دنیا تمہاری جانب بڑھتی ہے تو جود و سخا اسے ختم نہیں کر سکتی اور جب وہ تم سے منہ پھیرے تو بخل و کنجوسی اسے باقی نہیں رکھ سکتی۔"

(میرزا: ناسخ ج ۶ جزء ۲ ص ۸۰-۸۱)

... ایک مرتبہ حضرت امام حسین علیہ السلام نے فرمایا:
"مجھ پر میرے نانا رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ قول درست ثابت ہو گیا کہ:
نماز کے بعد سب سے اچھا عمل ایسے کام یا چیز کے ذریعہ مومن کا دل خوش کرنا ہے جس میں کوئی گناہ نہ ہو۔"
پھر آپؑ نے اپنے اس قول کی وضاحت فرماتے ہوئے فرمایا:
"ہوا یوں کہ میں نے راستہ میں ایک غلام کو دیکھا، جو کتے کو کھلا رہا تھا میں نے اس کے پاس رک کے اس سے پوچھا کہ معاملہ کیا ہے؟ تو اس نے جواب دیا،

اے فرزندِ رسول! میں غمزدہ ہوں، اور اس کی خوشی سے خوشی حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میرا مالک یہودی ہے اور میں اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہوں"۔

جب میں نے اس کی یہ گفتگو سنی تو مجھے اس پر رحم آیا اور میں اس کے ساتھ اس کے مالک کے پاس چلا گیا۔ مالک کے پاس پہنچ کے میں نے خالص سونے کے دو سو دینار اس غلام کی قیمت کے طور پر اس کو دے دیئے۔ اس یہودی نے کہا:

آقا! یہ غلام آپؑ کی تشریف آوری پر نذر ہے، اور یہ باغ بھی اسی کا ہے، نیز آپ (ع) کا مال میں آپؑ ہی کو واپس کرتا ہوں۔

امام علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں نے اس سے کہا،

"میں نے یہ مال تجھے بخش دیا ہے۔"

یہودی نے عرض کی:

میں نے آپؑ کی بخشش قبول کی اور یہ مال اسی غلام کو بخش دیا۔

اس پر آپؑ نے فرمایا:

میں نے اس غلام کو آزاد کر دیا اور یہ سب کچھ اسی کو بخش دیا۔

جب یہودی کی بیوی نے امام حسین علیہ السلام کی سخاوت اور بزرگی کی یہ شان دیکھی تو اس نے عرض کی:

آقا! میں نے اپنا مہر اپنے شوہر کو بخش دیا اور اب میں مسلمان ہوتی ہوں۔

پھر یہودی بھی ایمان لے آیا اور اس نے اپنا مکان اپنی بیوی کو ہبہ کر دیا۔

(میرزا، ناسخ ج ۶ جزء ۴ ص ۸۶-۸۷)

.... انس بن مالک کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر تھا، اتنے میں ایک لونڈی حاضر ہوئی اور اس نے ریحان کی ایک ایسی شاخ امام علیہ السلام کی خدمت میں تحفے کے طور پر پیش کی جس کی کوئی قیمت نہیں تھی، تو امام علیہ السلام

نے اس کا ہدیہ قبول کر کے فرمایا:

"تُو خداوند عالم کی راہ میں آزاد ہے۔"

میں نے عرض کی:

"آقا! اس نے تو آپ کو ایک بے قیمت چیز تحفہ میں پیش کی اور آپؑ نے اسے آزاد کر دیا۔"

تو امام علیہ السلام نے فرمایا:

"ہمیں خداوندِ عالم نے یہی ادب سکھایا ہے، اس کا ارشاد ہے کہ:

"جب تمہیں تحفہ دیا جائے تو تم اس کے بدلہ میں اس سے بہتر تحفہ دو یا کم از کم اس جیسا تو دو!" اور ظاہر ہے کہ آزادی اس کے تحفہ سے بہتر تھی۔"

(میرزا: ناسخ ج ۶ جزء ۴ ص ۸۷، ۸۸)

.... ایک مرتبہ ایک شخص نے امام حسین علیہ السلام سے اپنی کسی ضرورت کا اظہار کیا تو آپ (ع) نے اس سے فرمایا:

"میری نظر میں تمہارا سوال بہت اہم ہے اور مجھ پر تمہارا جو حق واجب ہے وہ بہت زیادہ ہے۔ تم جس بات کے مستحق ہو شاید میں اسے مکمل نہ کر سکوں اور اللہ کے لیے کیا جانے والا کتنا ہی بڑا کام کیوں نہ ہو، پھر بھی کم ہے، نیز میرے پاس اتنا مال بھی نہیں ہے جو میں تمہیں دے کر تمہارے اس احسان کا پورا شکریہ ادا کر سکوں، جو تم نے مجھ سے سوال کر کے مجھ پر کیا ہے۔ اس لیے اگر جو کچھ مجھے میسر ہے وہ تم مجھ سے قبول کر لو گے تو اس طرح تم مجھے اس تکلیف سے نجات دے دو گے جو مجھے تمہاری حاجت پوری کرنے کے لیے تگ و دو کے سلسلہ میں پیش آئے گی اور اس طرح تم مجھے اس فکر و پریشانی سے بچا لو گے جو مجھے تمہارا واجبی حق پورا کرنے میں ہو گی۔"

اس شخص نے عرض کی:

"فرزندِ رسولؐ! آپؑ جو کچھ عطا فرما سکیں گے میں قبول کروں گا اور آپؑ کے عطیہ پر شکر گذار ہوں گا نیز جو کچھ آپؑ نہ دے سکیں گے اس سے آپ کو معذور سمجھوں گا۔"

اس کے بعد امام علیہ السلام نے اپنے کارندے کو بلایا اور اس سے حساب کتاب لینے لگے۔ جب آپؑ اس سے پورا حساب کتاب لے چکے تو آپؑ نے فرمایا:

"تین لاکھ دینار میں سے جو کچھ بچا ہے وہ لاؤ۔!"

تو اس نے پچاس ہزار دینار حاضر خدمت کیے۔ پھر آپؑ نے دریافت فرمایا:

"پانچ سو دینار کیا کیے؟"

اُس نے عرض کی:

"آقا یہ رقم میرے پاس ہے۔"

اِمام علیہ السلام نے فرمایا:

"یہ بھی لے آؤ۔"

جب تمام رقم جمع ہوگئی تو آپؑ نے یہ سب رقم سوالی کیطرف بڑھائی اور اس سے فرمایا:

"بھائی! کسی کو لے آؤ تاکہ وہ تمہارے ساتھ یہ مال اُٹھا کر لے جائے۔"

اس پر وہ شخص دو مزدور لے آیا، جنہیں امام حسین علیہ السلام نے اپنی ردا اتار کر اس مال کو اٹھا کر لے جانے کی مزدوری کے طور پر عطا فرمائی اور وہ دونوں یہ تمام مال اس کے ساتھ لے گئے تو امام علیہ السلام کے ایک غلام نے عرض کی:

"واللہ! ہمارے پاس تو ایک درہم بھی نہیں بچا!"

امام علیہ السلام نے فرمایا:

"لیکن! مجھے امید ہے کہ میرے اس فعل پر مجھے اجرِ عظیم عطا فرما جائے گا۔"

(موسوی: بلاغۃ الحسینؑ ص ۲۴۲-۲۴۴)

ان مصروفیات اور اس کردار کے ساتھ امام علیہ السلام کا عام

تھا کہ روزِ عاشورار، بعدِ شہادت لوگوں نے امام علیہ السلام کی پشت پر ایک نشان دیکھا، تو امام زین العابدین علیہ السلام سے پوچھا کہ امام علیہ السلام کی پشت پر یہ نشان کیسا ہے؟ آپ ؑ نے فرمایا:

"یہ نشان ان بوریوں کا ہے جنہیں آپ ؑ اپنی پُشتِ نازنین پر لاد کر خاموشی سے بیواؤں، یتیموں اور مسکینوں کے گھر پہنچاتے تھے۔"

(میرزا: ناسخ ج ۶ جزء ۴ ص ۷۹-۸۰)

اسی طرح خوف وخشیت الٰہی کا عالم یہ تھا کہ اکثر نماز کے لیے تجدید وضو فرماتے تو خوف وخشیت الٰہی سے چہرہ کا رنگ زرد ہو جاتا تھا، جوڑوں میں رعشہ ہو جاتا تھا اور خوف سے کانپنے لگتے تھے۔

ایک مرتبہ ایسی حالت دیکھ کر لوگوں نے عرض کی:

"فرزندِ رسول! خداوند عالم سے آپ (ع) کا خوف وخشیت کتنا زیادہ ہے!!"

تو آپ ؑ نے فرمایا:

"قیامت کے دن سوائے اس شخص کے کسی کو امان نہیں ملے گی۔ جو دنیا میں خداوند عالم سے خائف رہا ہو۔"

(میرزا: ناسخ ج ۶ جزء ۴ ص ۹۳-۹۴)

اور نماز سے محبت ولگن اور اس کی قدر ومنزلت کا احساس اس قدر تھا کہ امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ:

آپ ؑ دن اور رات کے چوبیس گھنٹوں میں ایک ہزار رکعت نماز ادا فرمایا کرتے تھے۔ (میرزا: ناسخ ج ۶ جزء ۴ ص ۸۹)

اور دوسری طرف نو محرم کے خوفناک ترین دن بھی نماز کو نہیں فراموش کیا اور ایک رات کی مہلت فقط عبادت کے لیے طلب فرمائی، اور دس محرم کے انتہائی کربناک لمحات میں بھی نماز کو ترک نہیں فرمایا یہاں تک کہ سجدہ ہی میں جان جانِ آفریں کے سپرد کی۔

افکار الحسین علیہ السلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِعْتَبِرُوْا، اَیُّہَا النَّاسُ ـــــ بِمَا وَعَظَ اللّٰہُ بِہٖ اَوْلِیَاءَہٗ مِنْ سُوْءِ ثَنَائِہٖ عَلَی الْاَحْبَارِ، اِذْ یَقُوْلُ ـــــ:

لَوْلَا یَنْھٰھُمُ الرَّبّٰنِیُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِھِمُ الْاِثْمَ وَاَکْلِھِمُ السُّحْتَ (سورۃ المائدہ ۵ آیۃ ۶۳)

وَقَالَ:-

لُعِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ عَلٰی لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ ذٰلِکَ بِمَا عَصَوْا وَّکَانُوْا یَعْتَدُوْنَ ○ کَانُوْا لَا یَتَنَاھَوْنَ عَنْ مُّنْکَرٍ فَعَلُوْہُ لَبِئْسَ مَا کَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ○

(سورۃ المائدہ ۵ آیۃ ۷۸/۷۹)

وَاِنَّمَا ـــــ عَابَ اللّٰہُ ذٰلِکَ عَلَیْھِمْ لِاَنَّھُمْ کَانُوْا یَرَوْنَ مِنَ الظَّلَمَۃِ الَّذِیْنَ بَیْنَ اَظْھُرِھِمُ الْمُنْکَرَ وَالْفَسَادَ فَلَا یَنْھَوْنَھُمْ عَنْ ذٰلِکَ رَغْبَۃً فِیْمَا کَانُوْا یَنَالُوْنَ مِنْھُمْ وَرَھْبَۃً مِمَّا یَحْذَرُوْنَ وَاللّٰہُ یَقُوْلُ:-

"فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ"

(سورۃ المائدہ ۵ آیۃ ۴۴)

درسِ افکار

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لوگو ـــــــ!

خداوندِ عالم نے یہودی اور عیسائی علماء کی مذمت فرما کے، اپنے چاہنے والوں (اولیاء) کو جو نصیحت فرمائی ہے، اس سے عبرت حاصل کرو۔ اس کا ارشاد ہے ـــــــ:

"ان اللہ والوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ لوگوں کو گناہ گارانہ گفتگو اور رشوت خوری سے نہیں روکتے۔"
(سورۃ المائدہ آیت ۶۳)

اور یہ کہ ـــــــ:

"بنی اسرائیل میں جو لوگ کافر تھے، ان پر، حضرت داؤد اور حضرت عیسٰی ابن مریم (علیہما السلام) کی زبانی لعنت کی گئی۔ کیونکہ ان لوگوں نے اللہ جل جلالہٗ کی نافرمانی کی اور حدود سے تجاوز کر گئے۔ جو بُرا کام وہ کر چکے تھے، اس سے وہ باز نہیں آتے تھے اور یہ لوگ جو کام کرتے تھے وہ کتنا بُرا تھا۔" (سورۃ المائدہ آیت ۷۸)

خداوندِ عالم نے، اپنی معرفت رکھنے والوں اور علماء کی سرزنش اس لئے کی ہے کہ ـــــــ؛ لوگ ان کے سامنے بُرے سے بُرا کام کرتے اور فساد پھیلاتے تھے مگر یہ اللہ والے، ان بدکاروں کو، ان بُرائیوں سے اس لئے نہیں روکتے تھے کہ اس صورت میں ان کو اپنے ان مفادات سے ہاتھ دھونا پڑتا، جو انہیں ان بدکاروں سے حاصل ہونے کی امید تھی اور اس لئے بھی کہ وہ ان سے ڈرتے تھے۔ حالانکہ اللہ جل جلالہٗ کا ارشاد تو یہ ہے کہ ـــــــ:

"تو تم، ہرگز لوگوں کا خوف نہ کرو اور صرف مجھ سے ڈرو۔" (سورۃ المآئدہ آیت (۴۴)

وَقَالَ ـــــ:

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۤءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ
(سورۃ التوبہ ۹ آیت ۷۱)

فَبَدَاءَ اللّٰهُ، بِالْأَمْرِ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّهْيِ عَنِ الْمُنْكَرِ فَرِيْضَةً مِنْهُ، لِعِلْمِهِ، بِأَنَّهَا إِذَا أُدِّيَتْ وَاُقِيْمَتْ، إِسْتَقَامَتِ الْفَرَائِضُ كُلُّهَا ـــ هَيِّنُهَا وَصَعْبُهَا ـــ!

وَذٰلِكَ ـــــ
أَنَّ الْأَمْرَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّهْيَ عَنِ الْمُنْكَرِ دُعَاءٌ إِلَى الْإِسْلَامِ مَعَ رَدِّ الظَّالِمِ وَمُخَالِفَةِ الظَّالِمِ وَقِسْمَةِ الْفَيْئِ وَالْغَنَائِمِ وَأَخْذِ الصَّدَقَاتِ مِنْ مَوَاضِعِهَا وَوَضْعِهَا فِي حَقِّهَا ـــ!

ثُمَّ ـــ أَنْتُمْ، أَيَّتُهَا الْعِصَابَةُ!
بِالْعِلْمِ مَشْهُوْرَةٌ وَبِالْخَيْرِ مَذْكُوْرَةٌ وَبِالنَّصِيْحَةِ مَعْرُوْفَةٌ وَبِاللّٰهِ فِيْ أَنْفُسِ النَّاسِ مُهَابَةٌ ـــ!

يُهَابُكُمُ الشَّرِيْفُ وَيُكَرِّمُكُمُ الضَّعِيْفُ وَيُؤْثِرُكُمْ مَنْ لَا فَضْلَ لَكُمْ عَلَيْهِ وَلَا يَدٌ لَكُمْ عِنْدَهُ،
تَشْفَعُوْنَ فِي الْحَوَائِجِ إِذَا امْتُنِعَتْ مِنْ طُلَّابِهَا وَتَمْشُوْنَ فِي الطَّرِيْقِ بِهَيْبَةِ الْمُلُوْكِ وَالْأَكَابِرِ!

ور اس نے ارشاد فرمایا ہے کہ ـــــ :

"مومن مردوں اور مومن خواتین کی صفتیں تو یہ ہیں کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے گہرے دوست ہوتے ہیں اور وہ ایک دوسرے کو نیک کاموں کا حکم دیتے اور بُرے کاموں سے روکتے ہیں۔" (سورۂ توبہ ۹ آیت ۷۱)

یوں، خداوند عالم نے "امر بالمعروف" اور "نہی عن المنکر" (نیکی کرنے اور اس کا حکم دینے اور بُرائی سے رُکنے اور دوسروں کو اس سے روکنے) کو اوّلین فریضہ قرار دیا ہے کیونکہ اس علیم و خبیر کو معلوم ہے کہ اگر یہ فریضہ ادا ہو جائے اور اسے قائم کر دیا جائے تو تمام تر ـــ آسان اور مشکل فرائض و واجبات خود بخود ادا ہو جائیں گے۔

اور یہ اس لئے ہے :ـــ

کہ "امر بالمعروف" اور "نہی عن المنکر" لوگوں کو اسلام کی جانب اس انداز سے بلاتے ہیں کہ مظالم خود بخود دُور ہو جاتے ہیں، ظالم کی مخالفت لازم ہو جاتی ہے، آمدنی اور محاصل کی تقسیم عمل میں آجاتی ہے اور اہلِ دولت سے حاصل ہونے والا وہ حصہ حقداروں تک پہنچ جاتا ہے جو خداوندِ عالم نے مقرر فرمایا ہے ـــ!

پھر ـــ تم، اے حاضرینِ محفل!

تم تو ان افراد میں سے ہو جن کے متعلق عام طور سے یہ مشہور ہے کہ وہ عالم ہیں، تمہیں نیکوکار سمجھ کر یاد کیا جاتا ہے، ناصح کے طور پر پہچانا جاتا ہے اور اللہ کی نسبت سے لوگوں کے دلوں میں تمہاری ہیبت بیٹھی ہوئی ہے ـــ!

شریف اور معزز لوگ تم سے ہیبت زدہ اور مرعوب رہتے ہیں اور کمزور و نادار افراد تمہاری عزّت و تکریم کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ لوگ بھی تمہاری فضیلت کا اعتراف کرتے اور تمہارے سامنے ایثار سے کام لیتے ہیں جن پر تمہیں کسی قسم کی برتری حاصل نہیں ہے اور نہ تم نے ان پر کوئی احسان ہی کیا ہے، جب ضرورت مندوں کی حاجتیں روک لی جاتی ہیں تو تم ان کی سفارش کرتے ہو اور تم لوگ بادشاہوں جیسے جاہ و جلال اور رؤساء ملت و اکابر قوم جیسے وقار و تمکنت کے ساتھ راستہ چلتے ہو!

أَلَيْسَ كُلُّ ذٰلِكَ ــــــ إِنَّمَا نِلْتُمُوهُ بِمَا يُرْجَى عِنْدَكُمْ مِنَ الْقِيَامِ بِحَقِّ اللّٰهِ وَإِنْ كُنْتُمْ عَنْ أَكْثَرِ حَقِّهِ تُقَصِّرُونَ. فَاسْتَخْفَفْتُمْ بِحَقِّ الْأَئِمَّةِ!
فَأَمَّا حَقُّ الضُّعَفَاءِ! فَضَيَّعْتُمْ، وَأَمَّا حَقُّكُمْ بِزَعْمِكُمْ! فَطَلَبْتُمْ ــــ!!

فَلَا مَالًا بَذَلْتُمُوهُ! وَلَا نَفْسًا خَاطَرْتُمْ بِهَا لِلَّذِي خَلَقَهَا!
وَلَا عَشِيرَةً عَادَيْتُمُوهَا فِي ذَاتِ اللّٰهِ! وَأَنْتُمْ تَتَمَنَّوْنَ عَلَى اللّٰهِ جَنَّةً وَمُجَاوَرَةَ رُسُلِهِ وَأَمَانًا مِنْ عَذَابِهِ ــــ!!
ــــ لَقَدْ خَشِيتُ عَلَيْكُمْ، أَيُّهَا الْمُتَمَنُّونَ عَلَى اللّٰهِ!
أَنْ ــــ تَحِلَّ بِكُمْ نَقِمَةٌ مِنْ نَقِمَاتِهِ.
لِأَنَّكُمْ! بَلَغْتُمْ مِنْ كَرَامَةِ اللّٰهِ مَنْزِلَةً فُضِّلْتُمْ بِاللّٰهِ بِهَا! وَمَنْ يُعْرَفُ بِاللّٰهِ لَا تُكْرِمُونَ. وَأَنْتُمْ فِي عِبَادِهِ تُكْرَمُونَ ــــ!

وَقَدْ تَرَوْنَ عُهُودَ اللّٰهِ مَنْقُوضَةً فَلَا تَفْزَعُونَ، وَأَنْتُمْ لِبَعْضِ ذِمَمِ آبَائِكُمْ تَفْزَعُونَ ــــ!

کیا، یہ سب کچھ اس لئے نہیں ہے کہ ــــ بلا شک و شبہ تم نے وہ سب کچھ حاصل کر لیا ہے، جو تمہیں اس امید پر ملنا چاہیئے تھا کہ تم اللہ جل جلالہٗ کے حقوق کو قائم کروگے، حالانکہ، تم پروردگار عالم کے بیشتر حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرتے ہو۔ چنانچہ تمہاری حالت یہ ہے کہ تم ائمہ علیہم السلام کے حقوق کو معمولی گردانتے اور ان کے سلسلہ میں سہل انگاری سے کام لیتے ہو! اور جہاں تک کمزوروں کے حقوق کا تعلق ہے! تو انہیں تو تم نے بالکل ہی تباہ کر دیا ہے، البتہ، اپنے خود ساختہ حقوق بڑی ڈھٹائی سے طلب کرتے ہو۔!!

تمہارا حال یہ ہے کہ ــــ نہ تو تم نے راہ خدا میں مال خرچ کرنے کی زحمت گوارا کی ہے! نہ تم نے اپنے نفس کو اس خطرہ میں ڈالنے کی کوشش کی ہے جس کے لئے اسے خلق کیا گیا ہے! اور نہ ہی تم نے کسی گروہ سے خداوند عالم کی خاطر اختلاف اور لاتعلقی کا اظہار کیا ہے! اس کے باوجود (قہار و جبار پروردگار عالم کے مقابلہ میں تمہاری جرأت کا عالم یہ ہے کہ تم پروردگار عالم سے جنت، رسولؐ کے پڑوس اور (دنیا و آخرت میں) اس کے عذاب سے امان کی تمنا رکھتے ہو ــــ!!

ــــ اے، خداوند عالم سے اپنی خواہشات کے طلبگارو! تمہارے بارے میں مجھے ڈر ہے؛

کہ، کہیں ــــ تم پر اس کے خوفناک عذابوں میں سے کوئی عذاب نہ لوٹ پڑے، کیونکہ تم، اللہ جل جلالہٗ کی کرامت کے سبب عزت و وقار کے بلند و برتر مقام تک پہنچ گئے ہو، اس کے باوجود تم، خداوند عالم کی معرفت رکھنے والوں کی عزت نہیں کرتے، جب کہ تم بندگانِ خدا کے درمیان اللہ جل جلالہٗ ہی کے واسطے سے معزز و مکرم ہو ــــ!

اور تمہاری حالت یہ ہے کہ، تم، اللہ جلالہٗ سے کئے ہوئے وعدوں کو ٹوٹتے ہوئے دیکھتے ہو، لیکن اس کے خلاف آواز بلند نہیں کرتے، حالانکہ تم اپنے آباؤ اجداد کے کچھ حقوق کی پامالی پر چیخ اٹھتے ہو۔!

وَ ذِمَّةُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ
مَحْقُوْرَةٌ وَ الْعُمْیُ وَالْبُكْمُ ــــمـ! وَالزَّمَنُ فِی الْمَدَائِنِ
مُهْمَلَةٌ لَا تَرْحَمُوْنَ وَلَا فِی مَنْزِلَتِكُمْ تَعْمَلُوْنَ وَلَا مَنْ
عَمِلَ فِیْهَا تَعْنُوْنَ ــــ!! وَ بِالْإِدْهَانِ وَالْمُصَانَعَةِ
عِنْدَ الظَّلَمَةِ تَأْمَنُوْنَ !!!

كُلُّ ذٰلِكَ ! مِمَّا أَمَرَكُمُ اللّٰهُ بِهٖ مِنَ النَّهْیِ وَالتَّنَاهِیْ
وَاَنْتُمْ عَنْهُ غَافِلُوْنَ !
وَأَنْتُمْ ! أَعْظَمُ النَّاسِ مُصِیْبَةً لِمَا غُلِبْتُمْ عَلَیْهِ
مِنْ مَنَازِلِ الْعُلَمَاءِ لَوْ كُنْتُمْ تَشْعُرُوْنَ !
ذٰلِكَ !
بِأَنَّ ، مَجَارِیَ الْأُمُوْرِ وَالْأَحْكَامِ عَلٰی أَیْدِی الْعُلَمَاءِ
بِاللّٰهِ ، اَلْأُمَنَاءُ عَلٰی حَلَالِهٖ وَحَرَامِهٖ فَأَنْتُمُ الْمَسْلُوْبُوْنَ
تِلْكَ الْمَنْزِلَةَ ، وَمَا سُلِبْتُمْ ذٰلِكَ ! إِلَّا بِتَفَرُّقِكُمْ
عَنِ الْحَقِّ وَاخْتِلَافِكُمْ فِی السُّنَّةِ بَعْدَ الْبَیِّنَةِ الْوَاضِحَةِ !
وَلَوْ صَبَرْتُمْ عَلَی الْأَذٰی وَ تَحَمَّلْتُمُ الْمَؤُنَةَ فِیْ
ذَاتِ اللّٰهِ ! كَانَتْ أُمُوْرُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ تَرِدُ وَعَنْكُمْ
تَصْدُرُ وَ اِلَیْكُمْ تَرْجِعُ . وَلٰكِنَّكُمْ مَكَّنْتُمُ الظَّلَمَةَ
مِنْ مَنْزِلَتِكُمْ وَاسْتَسْلَمْتُمْ اُمُوْرَ اللّٰهِ فِیْ
أَیْدِیْهِمْ . یَعْمَلُوْنَ بِالشُّبُهَاتِ وَ
یَسِیْرُوْنَ فِی الشَّهَوَاتِ . سَلَّطَهُمْ عَلٰی
ذٰلِكَ فِرَارُكُمْ مِنَ الْمَوْتِ وَإِعْجَابُكُمْ
بِالْحَیَاةِ الَّتِیْ هِیَ مُفَارِقَتُكُمْ ــــ !
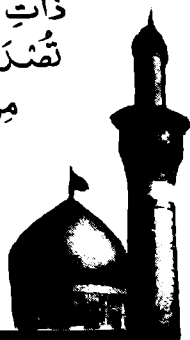
تمہارے سامنے، حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حقوق کی مسلسل تحقیر کی جا رہی ہے، اور تم اندھے اور بہرے بنے ہوتے ہو۔ شہروں اور خود تمہارے گھروں میں عاجزی و بے چارگی کی انتہا ہو چکی ہے، اور تمہیں رحم نہیں آتا، اور نہ تم خود ہی اس سلسلہ میں کوئی اقدام کرتے ہو اور نہ ہی اس میدان میں آگے بڑھنے اور عملی اقدام کرنے والے مجاہدوں کی مدد یا ہمت افزائی کا فریضہ سرانجام دیتے ہو ــــ!! بلکہ تم خوشامد اور چاپلوسی سے ظالموں کی پناہ حاصل کر لیتے ہو !!!

یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ خداوند عالم نے جن باتوں سے تمہیں خود رُکنے اور دُوسروں کو روکنے کا حکم دیا ہے، تم ان سے عمداً غفلت برتتے ہو!

تم، لوگوں میں سب سے زیادہ گرفتار بلا ہو، کیونکہ تم علماء کے آستانوں سے گریزاں ہو۔ کاش ــــ! تم ان کے پاس جاتے!

بات یہ ہے!

کہ ''درحقیقت، خدا دوست اور صالح علماء، احکام الٰہی کا سرچشمہ اور حلال و حرام خدا کے امانت دار ہیں، اور تم اس منزلت سے محروم ہو'' اور تمہاری اس محرومی کی وجہ! سوائے اس کے کچھ نہیں ہے کہ، تم حق سے اختلاف کرتے اور واضح دلیل کے باوجود سنت سے اتفاق نہیں کرتے ــــ!

اگر، تم مصائب و آلام پر صبر کرتے اور خداوند عالم کی خاطر مشکلات کا سامنا کرتے، تو احکام الٰہی، تم ہی پر وارد ہوتے، انہیں تمہارے ہی ذریعہ جاری کیا جاتا اور وہ تمہاری ہی طرف لوٹتے۔

لیکن ــــ! تم نے بدکاروں کو اپنے اوپر مسلط کر لیا ہے، اور احکام الٰہی کا نگہبان ان لوگوں کو بنا دیا ہے جو شبہات پر عمل اور نفسانی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں۔ اور تم پر یہ تسلط اس لئے قائم ہوا ہے کہ تم، موت سے بھاگتے ہو اور دنیا کی اس عارضی زندگی کے گرویدہ ہو جو بہرحال تمہارا ساتھ چھوڑ دے گی ــــ!

فَاسْلَمْتُمُ الضُّعَفَاءَ فِي أَيْدِيهِمْ. فَمِنْ بَيْنَ مُسْتَعْبَدٍ مَقْهُورٍ، وَبَيْنَ مُسْتَضْعَفٍ عَلَى مَعِيشَةٍ مَغْلُوبٍ يَتَقَلَّبُونَ فِي الْمُلْكِ بِآرَائِهِمْ، وَيَسْتَشْعِرُونَ الْخِزْيَ بِأَهْوَائِهِمْ، إِقْتِدَاءً بِالْأَشْرَارِ، وَجُرْأَةً عَلَى الْجَبَّارِ. فِي كُلِّ بَلَدٍ مِنْهُمْ عَلَى مِنْبَرِهِ خَطِيبٌ يَصْقَعُ. فَالْأَرْضُ لَهُمْ شَاغِرَةٌ، وَأَيْدِيهِمْ فِيهَا مَبْسُوطَةٌ، وَالنَّاسُ لَهُمْ خَوَلٌ لَا يَرْفَعُونَ يَدَ لَامِسٍ.

فَمِنْ بَيْنَ جَبَّارٍ عَنِيدٍ وَذِي سَطْوَةٍ عَلَى الضَّعَفَةِ شَدِيدٌ، مُطَاعٌ يَعْرِفُ الْمُبْدِئَ الْمُعِيدَ.

فَيَا عَجَبَاهُ ـــــ!

وَمَالِي (لَا) أَعْجَبُ ـــــ!!

وَالْأَرْضُ مِنْ غَاشٍّ غَشُومٍ، وَمُتَصَدِّقٍ ظَلُومٍ، وَعَامِلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ بِهِمْ غَيْرِ رَحِيمٍ.

فَاللّٰهُ الْحَاكِمُ فِيمَا فِيهِ تَنَازَعْنَا وَالْقَاضِي بِحُكْمِهِ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَنَا.

اس لئے، تم نے کمزوروں کو ان بدکاروں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا ہے۔ اب، ان میں سے بعض غلام بنائے جاچکے ہیں اور ذلت و رُسوائی کے گہرے غاروں میں گرے ہوئے ہیں، اور کچھ معاشی طور پر کمزور اور مغلوب بنائے جاچکے ہیں۔ یہ ظالم، ان لوگوں کو اپنی ملکیت میں اپنی خواہش اور رائے کے مطابق چلاتے ہیں کیونکہ، انہیں یہ خیال ہے کہ اگر ان مظلوموں کی تمنائیں پوری ہوگئیں تو یہ ظالم خود رسوا ہوجائیں گے۔ اس لئے، انہوں نے بدکاروں کی پیروی اور خداوندِ جبّار کی نافرمانی کو اپنا شیوہ بنالیا ہے۔ ان کی طرف سے ہر شہر کے منبر پر ایک شعلہ بیان خطیب مقرر ہے۔ وہ دست درازیاں کرنے میں آزاد ہیں اور لوگ ان کے خادم اور زرخرید غلاموں کی مانند ہیں۔ نیز یہ مظلوم اس ہاتھ سے چھٹکارا حاصل کرنے میں بے بس ہیں جو ان کو پکڑے ہوئے ہے۔

ان، حکمرانوں میں سے کچھ، ظالم و جابر ہیں اور کچھ صاحب قوت و طاقت۔ اور یہ لوگ ایسے فرماں روا ہیں جو اپنے آنے اور واپس جانے کے مرحلوں سے بے خبر ہیں۔

میں، حیران و ششدر ہوں ــــ!

اور ایسا کیوں نہ ہو ــــ!!

کیونکہ، زمین پر ظالموں کی حکمرانی ہے، اور وہ ظالم ایسے ہیں جو زبردستی اپنی بات منوا رہے ہیں اور مومنوں کے سنگ دل حاکم بنے بیٹھے ہیں۔

اس لئے، ہم جس بات پر لڑ رہے ہیں، اس میں ہماری طرف سے خداوند عالم ہی ثالث ہے اور ہمارے اختلافات میں اسی کو فیصلہ کرنا ہے۔

أَللّٰهُمَّ !
إِنَّكَ تَعْلَمُ أَنَّهُ لَمْ يَكُنْ مَا كَانَ مِنَّا تَنَافُساً فِي سُلْطَانٍ وَلَا الْتِمَاساً مِنْ فُضُوْلِ الْحُطَامِ وَلٰكِنَّ لِنَرَى الْمَعَالِمِ مِنْ دِيْنِكَ ، وَنُظْهِرَ الْإِصْلَاحَ فِيْ بِلَادِكَ ، وَيَأْمَنَ الْمَظْلُوْمُوْنَ مِنْ عِبَادِكَ وَيُعْمَلَ بِفَرَائِضِكَ وَسُنَنِكَ وَأَحْكَامِكَ ۔
فَإِنَّكُمْ تَنْصُرُوْنَا وَتُنْصِفُوْنَا ، قَوِيَ الظَّلَمَةُ عَلَيْكُمْ ، وَعَمِلُوْا فِيْ إِطْفَاءِ نُوْرِ نَبِيِّكُمْ ۔
وَحَسْبُنَا اللّٰهُ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا وَإِلَيْهِ أَنَبْنَا وَإِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۔

(ابن شعبہ : تحف العقول ص ۲۳۷-۲۳۹

زاھدی : منطق الحسینؑ ص ۱۰۲ - ۱۰۵

غفاری : بررسی تاریخ عاشوراء ص ۲۳ - ۲۵

موسوی : بلاغة الحسینؑ ص ۶۰ - ۷۰)

ھذہ خطبة خطبها السید الشھداء الحسین بن علی علیه السلام فی اواخر زمن معاویة بن ابی سفیان فی منیٰ لما جمع الف من الصحابة والتابعین بها فی أیام الحج لھذا الغرض ۔ فقد ذکر الحسین علیه السلام فی اول الخطبة بعد الحمد والصلوٰۃ جمیع فضائل ابیه امیرالمومنین علی بن ابی طالب علیه السلام وخطبھم بھذہ الخطبة وامرھم لنشر ھذہ الدعوۃ فی بلادھم وابلاغ ھذہ النصیحة الی الناس کلھم لأن ھذہ الخطبة بیان لاھداف نھضته وغایة سفرہ الجلیل وشھادته العظمیٰ ۔

(راجع : غفاری ، بررسی تاریخ عاشوراء ، قرشی : مرد ما فوق انسان ، للتفصیل والدلائل)

بار الٰہا!
تُو جانتا ہے کہ، ہم نہ سلطنت کی خاطر لڑ رہے ہیں۔ نہ ہمیں جھگڑوں کے فیصلے کرنے کی تمنا ہے۔ بلکہ، ہم یہ سب کچھ اس لئے کر رہے ہیں کہ ہم لوگوں کو تیرے دین کی نشانیاں دکھادیں۔ تیرے مظلوم بندوں کو ظلم سے بچائیں اور تیرے احکام و فرائض اور سنن پر عمل کریں اور کروائیں۔

تو، اے لوگو!
ہماری مدد کرو اور ہمارے ساتھ آگے بڑھو، کیونکہ ظالموں نے تم پر قوت حاصل کرلی ہے اور وہ تمہارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نور کو بجھانے کے لئے سر توڑ کوششوں میں مصروف ہیں۔

ہمارے لئے تو صرف خدا ہی کافی ہے۔ ہم اسی پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اسی کی بارگاہ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اسی کا دربار ہمارے لوٹنے کی جگہ ہے۔

یہ خطبہ حضرت امام حسین علیہ السلام نے معاویہ کے آخری دور میں، حج کے دوران، میدانِ منیٰ میں ہزار کے قریب صحابہ وتابعین کے ایک ایسے اجتماع میں دیا تھا جس کے شرکاء کو امام علیہ السلام نے خصوصی دعوت دے کر مسلم دنیا کے گوشہ وکنار سے اسی مقصد کے لئے طلب فرمایا تھا۔ اس خطبہ کے آغاز میں حضرت سید الشہداء علیہ السلام نے حمد و درود کے بعد اپنے والد بزرگوار حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کے تمام فضائل ایک ایک کرکے بیان فرمائے۔ پھر یہ خطبہ دیا۔ امام علیہ السلام نے ان حضرات کو حکم دیا کہ وہ آپؑ کے اس پیغام کو اپنے اپنے علاقوں میں نشر کریں اور لوگوں تک پہنچائیں۔ اس لئے تحریکِ کربلا کا منشور یہی ہے۔

(مزید تفصیلات کے لئے ملاحظہ فرمایئے:۔
غفاری: بررسی تاریخ عاشورا، ص ۲۳ و قرشی: مرد مافوق انسان)

۹۹

أَيُّهَا النَّاسُ!
نَافِسُوا فِي الْمَكَارِمِ، وَسَارِعُوا فِي الْمَغَانِمِ. وَلَا تَحْتَسِبُوا بِمَعْرُوفٍ لَمْ تَعَجَّلُوهُ. وَاكْسِبُوا الْحَمْدَ بِالنُّجْحِ، وَلَا تَكْسِبُوا الْمَطْلَ ذَمّاً. فَمَهْمَا يَكُنْ لِأَحَدٍ عِنْدَ أَخِيهِ صَنِيعَةٌ (لَهُ) وَرَأَى أَنَّهُ لَا يَقُومُ بِشُكْرِهَا، فَاللَّهُ لَهُ بِمُكَافَاتِهِ، فَإِنَّهُ أَجْزَلُ عَطَاءً، وَأَعْظَمُ أَجْراً.

وَاعْلَمُوا ——— !
إِنَّ حَوَائِجَ النَّاسِ إِلَيْكُمْ مِنْ نِعَمِ اللَّهِ عَلَيْكُمْ. فَلَا تَمَلُّوا النِّعَمَ فَتَحُولَ نِقَماً.

وَاعْلَمُوا ——— !!
أَنَّ الْمَعْرُوفَ مُكْسِبٌ حَمْداً، وَمُعَقِّبٌ أَجْراً. فَلَوْ رَأَيْتُمُ الْمَعْرُوفَ رَجُلاً، لَرَأَيْتُمُوهُ حَسَناً جَمِيلاً يَسُرُّ النَّاظِرِينَ. وَلَوْ رَأَيْتُمُ اللُّؤْمَ، رَأَيْتُمُوهُ سَمِجاً مَشُوهاً، تَنْفِرُ مِنْهُ الْقُلُوبُ وَتَغُضُّ دُونَهُ الْأَبْصَارُ.

أَيُّهَا النَّاسُ !
مَنْ جَادَ، سَادَ! وَمَنْ بَخِلَ رَذِلَ !!
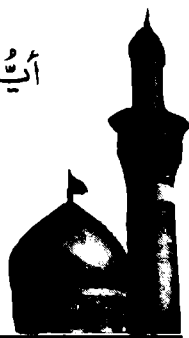
اے لوگو!

اچھے کردار اور نیک کاموں کے لئے آپس میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرو، اور حقیقی منفعت کے حصول کے لئے تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھو۔ جس نیکی میں تم نے عجلت سے کام نہ لیا ہو، اسے نیکی نہ شمار کرو۔ لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کر کے میزان کی نجات کا سبب بن کے تعریف کے لائق بنو، اور اس سلسلہ میں ٹال مٹول سے کام لے کر مذمت اور رسوائی حاصل نہ کرو اور دیکھو، کبھی ایسا بھی ہو جایا کرتا ہے کہ کوئی شخص، کسی کے ساتھ نیکی کرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ وہ اس کا شکر ادا نہیں کر رہا ہے۔ ایسی صورت میں (نیکی کرنے والے کو یہ اطمینان و یقین رکھنا چاہیئے کہ) اللہ اس کا پورا پورا بدلہ دینے کے لئے موجود ہے اور درحقیقت یہی (اللہ جل جلالہٗ کا عطا کیا ہوا بدلہ) سب سے زیادہ گراں قدر عطیہ اور سب سے بڑا اجر و انعام ہے۔

اور، یادرکھو ـــــــ!

کہ لوگ اپنی جو ضرورتیں تم سے طلب کرتے ہیں، یہ تمہارے لئے خدائے بزرگ و برتر کی نعمتیں ہیں (کیونکہ یہ عزت و اقتدار کی نشانی ہے) اس لئے نعمتوں سے برداشتہ خاطر نہ ہوا کرو، ورنہ وہ تمہارے لئے وبالِ جان بن جائیں گی۔

اور، جان لو ـــــــ!

کہ، یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ، نیکی کرنے سے تعریف و ستائش حاصل ہوتی ہے، اور اس کے نتیجہ میں ثواب ملتا ہے۔
اگر تم نیکی کو مجسم (آدمی کی صورت میں) دیکھتے تو اسے ایسا حسین و جمیل پاتے کہ دیکھنے والے اسے دیکھ کر سرور حاصل کرتے اور۔
اگر بُرائی کو مجسم دیکھتے تو اسے ایسا بدصورت اور کریہہ المنظر پاتے جسے دیکھ کر دل متنفر ہو جائیں اور اس طرف سے نگاہیں پھیر لی جاتیں۔

لوگو ـــ!

جس نے داد و دہش اور سخاوت سے کام لیا وہ سیادت و ریاست کے درجہ پر فائز ہو گیا! اور جس نے بخل و کنجوسی کو اپنا شیوہ بنایا وہ ذلیل و رسوا ہوا !!
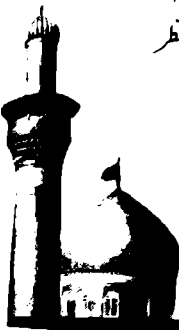
«إنّ أجودَ النّاسِ، مَنْ أعطَى مَنْ لا يرجُوهُ. وإنّ أعفَى النّاسِ مَنْ عفَى عَنْ قُدْرَةٍ. وإنّ أوصَلَ النّاسِ، مَنْ وَصَلَ مِنْ قَطَعِ.

وَالأُصُولُ عَلى مَغَارِسِهَا لِفُرُوعِهَا تَسْمُوا. فَمَنْ تَعَجَّلَ لِأَخِيهِ خَيْرًا، وَجَدَهُ إذا قَدِمَ عَلَيْهِ غَدًا. وَمَنْ أرادَ اللهَ تَبارَكَ وَتَعالى بِالصَّنِيعَةِ إلى أَخِيهِ كافاهُ بِها فِي وَقْتِ حاجَتِهِ، وَصَرَفَ عَنْهُ مِنْ بَلاءِ الدُّنْيا ما هُوَ أَكْثَرُ مِنْهُ. وَمَنْ نَفَّسَ كُرْبَةَ مُؤْمِنٍ فَرَّجَ اللهُ عَنْهُ كُرَبَ الدُّنْيا وَالآخِرَةِ. وَمَنْ أَحْسَنَ اللهُ إلَيْهِ؟
"وَاللهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ"

(سورۂ آل عمران۳ آیۃ ۱۳۸)

(زاهدی: منطق الحسینؑ ص ۱۱۰
شهاب الدین: احقاق ج ۱۱ ص ۵۹۴-۵۹۵
نقلاً عن الحضرمی: وسیلة المآل ص ۱۸۳
موسوی: بلاغة الحسینؑ ص ۱۲-۱۴
نقلاً عن کشف الغمة
• مع اختلاف یسیرة)

۹۹۹

عِبادَ اللهِ! إتَّقُوا اللهَ وَكُونُوا مِنَ الدُّنْيا عَلى حَذَرٍ!! فَإِنَّ الدُّنْيا لَوْ بَقِيَتْ لِأَحَدٍ أَوْ بَقِيَ عَلَيْها أَحَدٌ، لَكانَتِ الأَنْبِياءُ أَحَقُّ بِالْبَقاءِ وَأَوْلى بِالرِّضاءِ وَأَرْضى بِالْقَضاءِ.

اور پتے کی بات تو یہ ہے کہ لوگوں میں سب سے زیادہ سخی وہ ہے جو ایسے کو بھی دے جو اس سے کوئی اُمید نہ رکھتا ہو۔ اور سب سے زیادہ درگذر کرنے والا وہ ہے جو قابو پانے کے بعد بھی معاف کر دے۔ اور صلہ رحم کرنے والوں میں سب پر سبقت حاصل کرنے والا وہی ہو سکتا ہے جو ان لوگوں کے ساتھ بھی تعلقات قائم رکھے جو اس سے اپنے تعلقات توڑ لیں۔

اور یاد رکھو، کہ جڑیں، ہمیشہ اپنے جمنے کی جگہوں میں (زمین کے اندر) اپنی شاخوں کے ساتھ ہی بڑھتی ہیں، اس لئے جو شخص آج اپنے بھائی کے ساتھ نیکی کرنے میں جلدی کرے گا تو کل جب اسے اپنی ضرورت سے اس کے پاس جانا پڑے گا تو اسے اس کے پاس اپنی نیکی کا ثمر ضرور ملے گا اور جو اپنے بھائی کے ساتھ اللہ تبارک و تعالیٰ کی قربت اور اس سے اجر کے حصول کی تمنا میں نیکی کرے گا، تو نہ صرف یہ کہ اللہ جل جلالہٗ اس کی ضرورت کے وقت اس کی پوری پوری مدد فرمائے گا بلکہ وہ اس پر سے دُنیا کی اس سے بھی زیادہ مصیبتیں دُور فرما دے گا۔ جتنی اس نے اپنے بھائی کی دُور نہ کی ہوں گی اور جو کسی مومن کی تکلیف دُور کرے گا، خداوند عالم اسے دنیا و آخرت کی تمام تکلیفوں سے محفوظ فرما دے گا اور اس پر اللہ جل جلالہٗ سے بہتر احسان کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے؟

"اور اللہ تو (خود) احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔"

(سورۃ آل عمران ر۳ آیت ۱۳۸)

۹۹۹

خدا کے بندو!

اللہ جل جلالہٗ سے تقویٰ اختیار کرو اور اس دنیا سے بچ کر رہو۔ کیونکہ دنیا اگر کسی کے لئے ہمیشہ باقی رہتی یا اس میں کوئی شخص ہمیشہ باقی رہ سکتا تو انبیاء اس بات کے زیادہ مستحق تھے کہ وہ باقی رہتے اور وہی اس بات کے اہل بھی تھے کہ یہاں ہر بات ان کی مرضی کے مطابق ہو اور ان ہی حضرات کیلئے یہ بھی زیب دیتا تھا کہ تقدیر کے فیصلے ان کی پسند کے مطابق ہوں۔

غَیُرَ ــــــ!

نَّ اللّٰہَ تَعَالٰی خَلَقَ الدُّنْیَا بِالْبَلَاءِ، وَخَلَقَ اَھْلَھَا لِذْفَنَ
فَجَدِیْدُھَا بَالٍ وَنَعِیْمُھَا مُضْمَحِلٌ، وَسُرُوْرُھَا مُکْفَھِرٌّ
وَالْمَنْزِلُ بُلْغَةٌ، وَالدَّارُ قُلْعَةٌ۔

"وَتَزَوَّدُوْا ــــــ!
فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی"
(سورۃ البقرۃ ۲ آیۃ ۱۹۷)

"وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ"
(سورۃ البقرۃ ۲ آیۃ ۱۸۹)

(شہاب الدین: احقاق ج ۱۱ ص ۶۱۴
نقلاعن ابن عساکر، تاریخ دمشق ج ۴
ص ۳۳۳ وکفایۃ الطالب ص ۲۸۳
موسوی: بلاغۃ الحسینؑ ص ۱۱۶، ۱۱۸)

۹۹۹۹

اِیَّاکَ وَمَا تَعْتَذِرُ مِنْہُ، فَاِنَّ الْمُؤْمِنَ لَا یُسِیْءُ وَلَا
لَا یَعْتَذِرُ، وَالْمُنَافِقُ کُلَّ یَوْمٍ یُسِیْءُ وَیَعْتَذِرُ۔
(ابن شعبہ: تحف العقول ص ۲۴۸)

۹۹۹۹

لِلسَّلَامِ سَبْعُوْنَ حَسَنَةً:
تِسْعٌ وَسِتُّوْنَ، لِلْمُبْتَدِیْءِ
وَ، وَاحِدَةٌ، لِلرَّادِّ
(ابن شعبہ، تحف العقول ص ۲۴۸)

مگر ـــــــــ!

سچ تو یہ ہے کہ خدائے بزرگ و برتر نے دُنیا کو آزمائش اور دُنیا والوں کو فنا ہونے کے لئے پیدا کیا ہے۔ اس لئے، اس کی ہر نئی چیز پُرانی ہونے والی، ہر نعمت کمزور اور ختم ہو جانے والی اور ہر خوشی نمائشی ہے۔ یہ ٹھیرنے کی ایسی جگہ ہے جو ایک دوسری منزل کا پیش خیمہ ہے اور ایسا گھر ہے جو (قلعہ کی مانند) رہنے کے قابل نہیں ہے۔

"اس لئے،

جلد از جلد راستہ کا سامان تیار کر لو ـــ!

اور بے شک راستہ کے لئے سب سے اچھا سامان تقوٰی ہی ہے۔"

(سوُرۃ البقرۃ، آیت ۱۹۷)

"اور اللہ جل جلالہٗ سے تقوٰی اختیار کرو شاید تم فلاح پا جاؤ۔"

(سوُرۃ البقرہ آیت ۱۸۹)

۹۹۹۹

ایسا کام نہ کرو، جس کے سلسلے میں تمہیں معذرت کرنا پڑے،
کیونکہ مومن نہ بُرا کام کرتا ہے اور نہ حیلہ سازی سے کام لیتا ہے
اور منافق روزانہ بُرا کام بھی کرتا ہے اور عذر لنگ بھی پیش کرتا ہے۔

۹۹۹۹۹

سلام میں ستّر نیکیاں ہیں:
جن میں انہتّر (۶۹) اس کے لئے ہیں جو سلام میں
پہل کرے، اور
ایک اس کے لئے ہے جو جواب دے۔
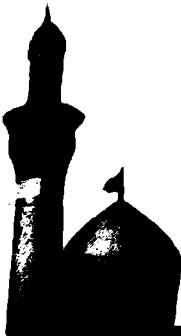
۵۸۶

میں نے (میراثِ انبیاء علیہم السلام) نامی کتاب
کی آیات قرآنیہ کو حرفاً حرفاً پورے غور و امعانِ نظر
سے پڑھا۔ میں تصدیق کرتا ہوں کہ اس کتاب کی آیات
قرآنیہ کے متن میں کوئی کمی بیشی اور کتابت میں کوئی غلطی
نہیں ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ

حافظ محمد یسین سندیافتہ ۲۸ اکتوبر سنہ ۱۹۷۷

امام نایاب جامع مسجد
ڈاکخانہ 1 لیاقت آباد کراچی
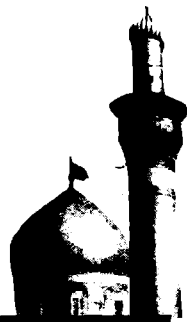
مآخذ:

۱۔ قرآن حکیم

۲۔ ابن شعبہ، حسن بن علی بن حسین بن شعبۃ الحرانی رحمۃ اللہ:

تحف العقول عن آل رسول علیہم السلام

تصحیح وتعلیق: علی اکبر غفاری، تہران ۱۳۷۶ھ

۳۔ زاہدی: میرزا ابوالفضل:

منطق الحسین علیہ السلام قم ۱۳۴۸ ش۔ھ

۴۔ شہاب الدین، آیۃ اللہ سید نجفی مرعشی مدظلہ العالی؛ علق علیہ:

احقاق الحق للقاضی سید نوراللہ حسینی شہید ثالث رحمۃ اللہ، تہران ۱۳۹۳ھ

۵۔ قرشی، سید علی اکبر:

مرد ما فوق انسان قم سنہ؟

۶۔ غفاری، علی اکبر:

براسی تاریخ عاشورا ایران سنہ؟

۷۔ قرشی، سید علی اکبر:

مرد ما فوق انسان قم سنہ؟

۸۔ موسوی، مصطفیٰ محسن حائری:

بلاغۃ الحسین علیہ السلام

اردو ترجمہ از مولانا محمد باقر صاحب

کھجوا سنہ؟

۹۔ میرزا، محمد تقی سپہر رحمۃ اللہ:

ناسخ التواریخ تہران ۱۳۵۱ھ

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علی محمد وآلہ الطاہرین وعجل فرجہم۔

میراثِ انبیاء